علامہ محمد ناصر الدین البانی

علامہ محمد اسماعیل رح (گوجرانوالہ)

81

حجیت حدیث

ناشر

ادارۃ البحوث الاسلامیۃ والدعوۃ والافتاء بالجامعۃ السلفیۃ بنارس

علامہ محمد ناصر الدین البانی
علامہ محمد اسماعیل رح (گوجرانوالہ)

حجیت حدیث

ادارۃ البحوث الاسلامیۃ، جامعہ سلفیہ، بنارس

نام کتاب: حجیت حدیث

نام مصنفین: علامہ محمد ناصر الدین البانی، علامہ محمد اسماعیل گجرانوالہ

ناشر: ادارۃ البحوث الاسلامیہ، جامعہ سلفیہ، بنارس

اشاعت اول: ۱۴۰۵ھ / ۱۹۸۵ء — تعداد ۱۰۰۰

خوشنویس: عبدالخالق خلیق بستوی

مطبع: لولو آفسٹ پرنٹرز

قیمت:

① مکتبہ سلفیہ مرکزی دارالعلوم ریوڑی تالاب، وارانسی، ۲۲۱۰۱۰

② جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی، ص ب (38/30) الفاحیۃ، الکویت

③ مکتبہ جریدہ ترجمان، ۱۱۶/۴، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶

④ دارالمعارف ۱۳، محمد علی بلڈنگ بھنڈی بازار بمبئی ۴۰۰۰۰۳

⑤ مکتبہ مسلم بربرشاہ، سری نگر ۱۹۰۰۰۱ کشمیر

⑥ ابناء الجامعۃ السلفیہ ص ب ۱۰۰۲۳ المدینۃ المنورہ

Saudi Arabia

3

فہرست

موضوعات | صفحات

موضوعات | صفحات

موضوعات | صفحات

⑤ پانچ فکر انگیز مقالات

① پہلا مقالہ

موضوعات	صفحات
سنت قرآن میں	۱۵۴
حدیث کا کھلا انکار چودھویں صدی میں	۱۶۰
قرآن اور اس کا تواتر	۱۶۱
منکرین سنت کے شبہات	۱۶۲
حدیث کے متعلق ظنی ہونے کا شبہ	۱۶۳
ظن کی علمی تحقیق	"
غلطی کی اصل وجہ	۱۶۶
شریعت اسلامیہ میں ظن کی اہمیت	۱۶۷
شہادت	۱۶۸
تحکیم	"
ایک بدبودار شبہ	۱۷۲
سازش کے اسباب	۱۷۳
فتح کے بعد	۱۷۵
سازش کا مضحکہ خیز پہلو	۱۷۶
عجمی سازش اور دینی علوم	۱۷۸
جھوٹی حدیث اور وعید	۱۸۰
دوسری صدی	۱۸۱
دور تدوین	۱۸۲
دور ترتیب	۱۸۳
مشت بعد از جنگ	۱۸۴

موضوعات	صفحات

موضوعات	صفحات

موضوعات	صفحات
آحاد کے متعلق اختلاف اور خرابی کا پہلا دور	۲۸۲
اس ذہن کی تنظیم	۲۸۳
آحاد پر اشتباہ دوسری صدی کے شروع میں	۲۸۴
دوسرا دور	۲۸۵
تیسرا دور	۲۸۷
فقہ راوی	۲۸۸
چوتھا دور	۲۹۰
درایت اور تفقہ	"
مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی	۲۹۲
خدمات اور کارنامے	۲۹۴
مزاج شناسی اور جوت	۲۹۵
احادیث میں یقین اور ظن	۲۹۶
فن حدیث اور عقل	۲۹۷
اصل نزاع	۳۰۰
آخری گذارش	"
③ تیسرا مقالہ	
سنت قرآن کے آئینہ میں	۳۰۳
وحی کے مختلف طریقے	۳۰۵
قرآن مجید میں احادیث کا تذکرہ	۳۰۷
ایک دھوکہ	۳۱۳

موضوعات — صفحات

⑤ پانچواں مقالہ

عرضِ ناشر

فتنۂ انکارِ حدیث کی تاریخ کا سرسری جائزہ لینے سے واضح ہوتا ہے کہ حدیثِ نبوی کی حجیت و اہمیت کے منکرین دو طرح کے ہیں، ایک طبقہ ان منکرین کا ہے جو کھلم کھلا حدیث کی حجیت کا انکار کرتے ہیں، اور اس انکار کو اپنا مقصد قرار دیتے ہیں۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو صراحتاً حدیث کی حجیت کے منکر نہیں، بلکہ اس کو زبانی طور پر سند تسلیم کرتے ہیں، لیکن تاویل و احتیال کی ایسی راہ اختیار کرتے ہیں جس سے حدیث کی حیثیت مجروح ہوتی ہے اور لوگوں پر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ سنت نبوی کو تشریعی اعتبار سے کوئی اہم مقام حاصل نہیں، بلکہ خود ساختہ اصولوں کی روشنی میں اس کی توجیہ و تاویل کی جا سکتی ہے۔ بعض احادیث کی تاویل یا انکار سے متعلق اس طبقہ کے رویہ سے اول الذکر گروہ کو تقویت ملتی ہے، اسلامی تاریخ کے قدیم و جدید دونوں عہد میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

منکرین کی پہلی قسم کا موقف چونکہ واضح ہے، اس لئے اس کی تردید بھی آسان ہے، اکثر علماءِ اسلام نے اس موضوع پر قابلِ قدر کام کیا ہے۔ لیکن دوسری قسم کا جواب نسبتاً مشکل اور محنت طلب ہے، کیونکہ بسا اوقات اس کے موقف کی تعیین ہی دشوار ہو جاتی ہے جس پر جواب یا تردید کا انحصار ہوتا ہے، اس وجہ سے موضوع کی اس شق پر انھیں علماء کی کوششیں کامیاب ہو سکتی ہیں جو اپنی دقت رسی اور نکتہ سنجی کے لئے مشہور ہیں۔ چونکہ سنت اور علوم سنت کے تحفظ کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے، اس لئے ہم دیکھتے

ہیں کہ یہ دور بھی ایسے بالغ نظر علماء سے خالی نہیں جو سنت نبوی کی مدافعت کا کام اولین فرض کی حیثیت سے انجام دیتے ہیں۔

جن علماء کی تحریریں اس موضوع پر مؤثر و مقبول ہیں، ان میں دو نام بہت نمایاں ہیں، پہلا محدث شام علامہ محمد ناصر الدین البانی کا اور دوسرا شیخ الحدیث علامہ محمد اسماعیل گوجرانوالہ مرحوم کا۔ آئندہ صفحات میں ہم انھیں دونوں شخصیتوں کی تحریریں پیش کر رہے ہیں۔

ان کا شمار فن حدیث کے اساطین اور سنتِ نبوی کے نکتہ شناسوں کی صفِ اول میں ہوتا ہے، میری کیا بساط کہ ان کے مقام و مرتبہ پر روشنی ڈالوں، ان کی فنی مہارت، علم حدیث سے شغف، اس کی خدمت کے لئے عظیم قربانیاں، حب نبوی میں ڈوبا ہوا ان کا اسلوب، دفاع عن السنۃ کی راہ میں رواں اور شگفتہ قلم اور سیرت و عمل کے میدان میں محدثین کرام کی سادگی و قناعت اور فرائض و سنن کا غیر معمولی جتن ان کے نمایاں اوصاف ہیں۔

حجیت حدیث کے اثبات اور سنتِ نبوی کے مقام کی تعیین و توضیح کے سلسلہ میں دونوں عالموں نے جو کچھ لکھا ہے کسی تعارف و تمہید کا محتاج نہیں، لیکن چونکہ زیر نظر مجموعہ میں ان کی متعدد تحریروں کو یکجا پیش کیا جا رہا ہے، اس لئے چند سطور ناگزیر ہیں

اس مجموعہ میں حجیت حدیث کے موضوع پر علامہ البانی حفظہ اللہ کے تین رسالوں کا اردو ترجمہ شامل ہے۔ دو رسالوں کا ترجمہ ادارۃ البحوث الاسلامیہ کے رفیق مولانا عبدالوہاب حجازی نے کیا ہے، اور تیسرے رسالہ کا ترجمہ شیخ بدر الزماں نیپالی نے، آخر الذکر رسالہ چند سال پیشتر علیحدہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ مجموعہ کا دوسرا حصہ علامہ محمد اسماعیل رحمہ اللہ کی تحریروں پر مشتمل ہے،

پچھلے دنوں پاکستان سے علامہ موصوف کے ان چار مضامین کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا تھا جو حدیث نبوی کی تشریعی حیثیت کی توضیح اور اس سلسلہ میں وارد اعتراضات وخدشات کے جواب میں موصوف نے مختلف اوقات میں تحریر فرمائے تھے۔ علامہ موصوف نے حسن البیان کے پاکستانی ایڈیشن کے لئے "درایت اور فقہ راوی" کے عنوان سے ایک مفصل اور وقیع مقدمہ بھی تحریر فرمایا تھا۔ ہم نے اس مجموعہ میں مذکورہ بالا چار مقالات کے علاوہ اس مقدمہ کو بھی شامل کر لیا ہے، اور اس طرح یہ مجموعہ حجیت حدیث نبوی کے موضوع پر ایک اہم دستاویز کی حیثیت سے سامنے آرہا ہے۔

ناچیز نے ترجمہ پر نظر ثانی کی ہے، اور مطبوعہ تحریروں کی تصحیح کا بھی اہتمام کیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود کمال کا دعویٰ نہیں، ناظرین اگر کوئی سقم محسوس کریں تو ضرور مطلع فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس مجموعہ کو مفید ومقبول بنائے اور مصنفین کو اجر جزیل سے نوازے، وصلی اللہ علیٰ نبینا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین ۔

(مقتدیٰ حسن ازہری)

جامعہ سلفیہ، بنارس
۲ربیع الآخر ۱۴۰۵ھ

دعوتِ عمل بالکتاب والسنۃ
کی
تائید میں
محدثِ شام
علامہ محمد ناصر الدین البانی حفظہ اللہ تعالیٰ
کے
۳
گراں قدر رسالے

١
پہلا رسالہ
اسلام میں
سنّتِ نبوی کا مقام
صرف قرآن کریم پر اکتفاء
کی تردید

اسلام میں سنّتِ نبوی کا مقام

صرف قرآن پر اکتفاء کی تردید

قرآن سے سنّت کا تعلق: یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ورسالت کے شرف سے مشرف فرمایا، اور آپ پر قرآن کریم نازل فرمایا، قرآن میں آپ کو جن باتوں کا حکم دیا گیا ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ آپ اس قرآن کو لوگوں کے سامنے بیان فرمادیں، چنانچہ ارشاد ہے:

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم۔ (النحل ۴۴)

اور ہم نے تیری طرف نصیحت کی بات اسی لئے اتاری ہے تاکہ جو کچھ لوگوں کے لئے خدا کے ہاں سے اترا ہے تو اس کو واضح کرکے بیان کردے۔

میرے خیال میں آیت کریمہ میں جس بیان کا ذکر ہے اس کے دو پہلو ہیں:

اول یہ کہ لفظ وتکلم کا بیان ہو، یعنی نبی ص قرآن کو جس طرح وہ نازل ہوا امت تک پہونچادیں اور کسی حصہ کو چھپا نہ رکھیں، ارشاد ہے:

یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک (المائدہ ۶۷)

اے رسول جو کچھ تیری طرف تیرے پروردگار کے ہاں سے اترا ہے پہنچادے۔

حضرت عائشہ رض نے مذکورہ آیت کی تلاوت سے پہلے فرمایا کہ: جو تم سے یہ کہے کہ محمد ص نے تبلیغ کی کوئی بات چھپائی ہے وہ اللہ پر بہت بڑا جھوٹ باندھ رہا ہے۔ (بخاری ومسلم)

مسلم کی ایک روایت میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ص کو جن باتوں کی تبلیغ کا حکم تھا ان میں سے کسی بات کو اگر آپ چھپاتے تو اس آیت کو چھپاتے جس میں اللہ تعالیٰ نے

ارشاد فرمایا ہے :

واذ تقول للذی انعم اللہ علیہ وانعمت علیہ امسک علیک زوجک واتق اللہ وتخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ وتخشی الناس، واللہ احق ان تخشاہ (الاحزاب : ۳۷)	جب تو اس شخص کو جس پر خدا کے انعام تھے اور تو نے بھی انعام کئے تھے کہہ رہا تھا کہ تو اپنی بیوی کو رہنے دے اور اللہ سے ڈر اور تو اپنے دل میں وہ بات چھپاتا تھا جسے اللہ ظاہر کرنے کو تھا تو لوگوں سے خوف کرتا تھا حالانکہ اللہ سے زیادہ خوف کرنا چاہیئے ۔

دوم یہ کہ لفظ یا جملہ یا آیت کے اس مفہوم کا بیان ہو جس کی امت کو ضرورت ہے، ایسا عام طور پر ان آیات میں ہوتا ہے جو مجمل یا عام یا مطلق ہوں اور پھر سنت کے ذریعہ انکی توضیح یا تخصیص یا تقیید ہو، سنت خواہ قولی ہو یا فعلی یا تقریری ۔

فہم قرآن کے لئے سنّت کی ضرورت اور اس کی مثالیں

اس کی سب سے بہتر مثال درج ذیل آیت ہے :

والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما (المائدہ ۳۸) چور مرد ہو یا عورت ان کے داہنے ہاتھ کاٹ دیا کرو۔

اس آیت میں لفظ (سارق) اور (ید) دونوں مطلق ہیں، نبی صلعم کی ایک قولی حدیث میں جسے بخاری و مسلم نے ذکر کیا ہے، یہ تشریح کی گئی ہے کہ چوتھائی دینار یا اس سے زائد مال کی چوری میں ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اسی طرح فعلی حدیث سے یہ ثابت ہے کہ نبی صلعم اور صحابہ کلائی کے پاس سے ہاتھ کاٹتے تھے۔

تیمم کی آیت میں (ید) کا جو لفظ آیا ہے اس کی وضاحت عمار بن یاسر کی اس حدیث سے ہوتی ہے جسے بخاری، مسلم اور احمد نے روایت کیا ہے، اس میں وارد ہے کہ ید سے ہتھیلی مراد ہے :

التیمم ضربۃ للوجہ والکفین	تیمم ایک ضرب ہے، چہرہ اور دونوں ہتھیلیوں کے لئے

ذیل میں وہ آیات درج کی جاتی ہیں جن کا صحیح مفہوم سنت کے بغیر متعین نہیں ہوسکتا :

۱۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانہم بظلم اولٰئک لہم الامن وھم مھتدون (الانعام : ۸۲)	جو لوگ خدا کی توحید پر ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم سے بچاتے رہے ان ہی کو امن ہوگا اور وہ ہی راہ راست پر ہیں۔

اس آیت میں (ظلم) کے لفظ کو صحابہ کرام رض نے اس کے عام مفہوم پر محمول کرتے ہوئے یہ سمجھا کہ ہر چھوٹا بڑا ظلم مراد ہے، جس سے انھیں اشکال پیدا ہوا، چنانچہ نبی ص سے پوچھا کہ : یا رسول اللہ ! ہم میں سے کون ایسا ہے جس کے ایمان میں ظلم کا شائبہ نہیں؟ اس پر رسول اللہ ص نے بیان فرمایا کہ ظلم کا عام مفہوم مراد نہیں، بلکہ اس سے شرک مراد ہے، کیا تم کو حضرت لقمان کا قول معلوم نہیں کہ (ان الشرک لظلم عظیم) یعنی شرک بڑا ظلم ہے (بخاری و مسلم وغیرہ)

۲۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

واذا ضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا (النساء : ۱۰۱)	جب تم زمین میں سفر کرنے کو جاؤ تو تمھیں نماز کا قصر کرنا جائز ہے۔ اگر تمھیں ڈر ہو کہ کافر تم کو ستائیں گے ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

آیت کے ظاہری مفہوم سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر میں نماز قصر کرنے کا حکم خوف کے ساتھ مشروط ہے، اسی لئے بعض صحابہ نے رسول اللہ ص سے پوچھا کہ اب ہم امن کے بعد کیوں قصر کرتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ یہ اللہ کا تم پر صدقہ ہے، اس کے صدقہ کو قبول کرو (مسلم)

۳۔ ارشاد باری ہے :

حرمت علیکم المیتۃ والدم (المائدۃ: ۳) — مردہ جانور اور خون تمھارے اوپر حرام ہے۔

تو لی حدیث میں یہ بیان کیا گیا کہ ٹڈی و مچھلی خواہ مردہ ہو اور خون بشکل کلیجی و جگر حلال ہے، نبی ص فرماتے ہیں: ہمارے لئے دو مردے اور دو خون حلال ہیں، یعنی ٹڈی و مچھلی اور کلیجی و جگر۔ اس حدیث کو بیہقی وغیرہ نے مرفوع و موقوف روایت کیا ہے، اور موقوف کی سند صحیح ہے، اور یہ مرفوع کے حکم میں ہے کیونکہ ایسی بات اپنی رائے سے نہیں کہی جا سکتی۔

۴۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قل لا اجد فیما اوحی الی محرما علی طاعم یطعمہ الا ان یکون میتۃ او دما مسفوحا او لحم خنزیر فانہ رجس او فسقا اھل لغیر اللہ بہ۔ (الانعام: ۱۴۵) — تو کہہ میں تو اپنی الہامی کتاب میں کسی کھانے والے کے حق میں جو کھانا چاہے بجز خود مردہ جانور اور خون ذبح کے وقت بہنے والے اور خنزیر کے گوشت کے کوئی چیز حرام نہیں پاتا پس یہ سب حرام (اور ناپاک ہیں) اور وہ گناہ کی چیز جو غیر اللہ کے نام سے پکاری جائے۔

÷ ÷ ÷ ÷ ÷

پھر حدیث کے ذریعہ کچھ دوسری چیزوں کو بھی حرام قرار دیا گیا جن کا اس آیت میں ذکر نہیں، چنانچہ ایک حدیث میں ہے:

کل ذی ناب من السباع و کل ذی مخلب من الطیر حرام۔ — دانت والا ہر درندہ اور پنجوں والا پرندہ حرام ہے۔

کچھ دوسری حدیثوں میں بھی اس سے روکا گیا ہے۔

خیبر کے دن رسول اللہ ص نے فرمایا:

ان اللہ و رسولہ ینھیانکم عن الحمر الانسیۃ فانھا رجس (بخاری و مسلم) — اللہ اور رسول ص تم کو گھریلو گدھوں کے کھانے سے منع فرماتے ہیں، وہ گندے ہیں۔

۵۔ اور فرماتا ہے:

قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق؟ (الاعراف: ۳۲)	تو کہہ جس زینت کو خدا نے اپنے بندوں کیلئے پیدا کیا اس کو اور پاکیزہ رزق کو کس نے حرام کیا ہے؟

حدیث میں زینت کی بعض چیزوں کو حرام بھی قرار دیا گیا ہے، چنانچہ نبی ص سے ثابت ہے کہ ایک روز آپؐ صحابہ کے سامنے تشریف لائے، آپؐ کے ایک ہاتھ میں ریشم اور دوسرے میں سونا تھا، آپؐ نے فرمایا کہ: یہ دونوں چیزیں میری امت کے مردوں کے لئے حرام اور عورتوں کے لئے حلال ہیں (حاکم)

اس مفہوم کی حدیثیں بخاری و مسلم وغیرہ میں بھی ہیں۔

مذکورہ مثالوں سے اسلامی شریعت میں سنت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، اور یہ یقین بھی ہو جاتا ہے کہ سنت کے بغیر قرآن کریم کو صحیح طور پر سمجھنا ممکن نہیں۔

چنانچہ پہلی آیت میں صحابہ رضا نے ظلم سے اس کا ظاہری مفہوم سمجھا تھا، جبکہ وہ بقول ابن مسعود رضا امت میں سب سے افضل، نیک دل، گہرے علم اور کم تکلف والے لوگ تھے، ان اوصاف کے باوجود آیت کے مفہوم کو سمجھنے میں ان سے غلطی ہوئی اگر نبی ص نے ان کی رہنمائی فرماتے ہوئے یہ بیان نہ فرمایا ہوتا کہ ظلم سے شرک مراد ہے تو ہم بھی غلطی میں ان کی پیروی کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے نبی ص کی رہنمائی کے ذریعہ ہمیں محفوظ رکھا۔

دوسری مثال میں غور کیجئے، اگر مذکورہ حدیث نہ ہوتی تو بحالت امن نماز قصر کرنے میں ہم شبہ کا شکار رہتے، خواہ آیت کے ظاہر کے اعتبار سے خوف کی شرط نہ لگائیں، صحابہ رضا نے رسول اللہ ص کو امن کی حالت میں قصر کرتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو وہ بھی خوف کی شرط والا مفہوم ہی سمجھتے۔

تیسری مثال دیکھئے، اگر حدیث نہ ہوتی تو حلال و پاکیزہ چیزوں کو ہم حرام قرار

دے دیتے مثلاً : ٹڈی، مچھلی، کلیجی اور جگر۔

چوتھی مثال لیجئے، اگر احادیث وارد نہ ہوتیں تو درندوں اور جنگلوں والے جانوروں کو ہم حلال سمجھ لیتے۔

اسی طرح پانچویں مثال میں غور کیجئے، اگر احادیث نہ ہوتیں تو حرام کئے ہوئے سونے چاندی کو ہم حلال سمجھ لیتے۔

اسی وجہ سے سلف میں بعض علماء کا قول ہے کہ : سنت، قرآن کا فیصلہ کرتی ہے۔

سنت کو چھوڑ کر قرآن پر اکتفاء کرنا گمراہی ہے

باعث افسوس ہے کہ بعض مفسرین اور معاصر لکھنے والوں نے صرف قرآن پر اعتماد کرتے ہوئے آخری دو مثالوں میں مذکور اشیاء یعنی درندوں کے گوشت اور سونے چاندی کے پہننے کو جائز قرار دیا ہے، بلکہ اس وقت "اہل قرآن"، نامی ایک جماعت وجود میں آئی ہے جو عقل وخواہش کی بنیاد پر قرآن کی تفسیر کرتی ہے اور صحیح احادیث کو نظر انداز کر دیتی ہے، سنت کے باب میں اس کا رویہ افسوسناک ہے، جو حدیث خواہش کے مطابق ہوتی ہے اسے قبول کر لیتی ہے، اور جو موافق نہیں ہوتی اسے پس پشت ڈال دیتی ہے، شاید ذیل کی صحیح حدیث میں نبی ﷺ نے ایسے ہی لوگوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے :

لا الفين احدكم متكئا على اريكته يأتيه الامر من امري مما امرت به او نهيت عنه فيقول لا أدري ما وجدنا في كتاب الله اتبعناه

(ترمذی)

میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی چارپائی پر ٹیک لگائے ہوئے ہے اور اس کے پاس میرے اوامر ونواہی میں سے کوئی بات آتی ہے تو کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا جو کچھ کتاب اللہ میں ہم نے پایا اس کی اتباع کی۔

دوسری روایت میں ہے :

ما وجدنا فيه حراما حرمناه ، جو کچھ ہم نے اس میں حرام پایا اسے حرام قرار

الا وانی اوتیت القرآن ومثلہ معہ۔ دیا سنو مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کے مثل ایک اور چیز۔

ایک اور روایت میں ہے:

الا ان ماحرم رسول اللہ مثل ماحرم اللہ۔ سنو! اللہ کے رسول نے جو کچھ حرام قرار دیا وہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیز کے مثل ہے۔

ایک افسوسناک امر یہ ہے کہ ایک فاضل مصنف نے اسلامی شریعت وعقیدہ کے موضوع پر کتاب تصنیف کی ہے جس کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ: اس کتاب کی تالیف کے وقت ان کے پاس قرآن کے علاوہ کوئی دوسرا ماخذ نہیں تھا۔

لیکن مذکورہ بالا احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت صرف قرآن کا نام نہیں، بلکہ اس سے قرآن وسنت دونوں مراد ہیں، اس لئے اگر کوئی ان دونوں میں سے صرف ایک کو قابل عمل سمجھے تو وہ دونوں کا باغی ہوگا، کیونکہ دونوں (قرآن وسنت) میں ایک دوسرے کی پابندی کا حکم ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ (نساء ۸۰) جو کوئی خدا کے رسول کی تابعداری کرتا ہے وہ اللہ کی تابعداری کرتا ہے۔

اور فرماتا ہے:

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔ (النساء ۶۵) بس تیرے رب کی قسم ہرگز یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے جبتک آپس کے جھگڑوں میں تجھ ہی کو منصف نہ بنا دیا گے پھر اپنے دلوں میں تیرے فیصلے سے ناراض نہ ہونگے بلکہ اس کو (بخوشی) قبول کرلیں گے۔

اور فرماتا ہے:

وما کان لمؤمن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون اور کسی مسلمان مرد یا عورت کو لائق نہیں کہ جب کسی کام میں خدا اور اس کا رسول فیصلہ کردیں

لهم الخيرة من امرهم ومن يعص الله ورسوله فقد ضل ضلالا مبينا. (الاحزاب ۳۶)
تو ان کو کبھی اپنے کام میں اختیار باقی ہو اور جو کوئی اللہ اور اسکے رسول کی نافرمانی کرتا ہے وہ صریح گمراہی میں پڑ جاتا ہے۔

اور فرماتا ہے:

وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنه فانتھوا. (الحشر ۷)
اور جو کچھ رسول اللہ تم کو دیویں وہ قبول کیا کرو اور جس سے روکیں اس سے رک جایا کرو۔

آخری آیت کے بعد میں ابن مسعود رض کا واقعہ بھی ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں جس میں مذکور ہے کہ: ایک عورت ابن مسعود رض کے پاس آئی اور کہا کہ آپ ان عورتوں کو لعنت کرتے ہیں جو بال اکھاڑنے والی اور بال اکھیڑوانے والی اور گودنا گودنے والی ہیں (حدیث)

انھوں نے جواب دیا کہ ہاں۔

عورت نے کہا کہ: میں نے اللہ کی کتاب شروع سے اخیر تک پڑھی لیکن اس میں آپ کی یہ بات نہیں ملی۔

ابن مسعود نے جواب دیا کہ:

ان کنت قرأتیه لقد وجدتیه، اما قرأت وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنه فانتھوا
اگر تم نے پڑھا ہوتا تو ضرور پایا ہوتا، کیا یہ آیت نہیں پڑھی کہ: جو کچھ رسول ص دیں اسے لے لو اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ۔

عورت نے کہا کہ ہاں مذکورہ آیت پڑھی ہے۔

ابن مسعود نے کہا کہ: میں نے رسول اللہ ص کو فرماتے ہوئے سنا کہ لعن الله المتنامصات (متفق علیه) اللہ نے بال اکھیڑنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے۔

فہم قرآن کے لئے زبان دانی کافی نہیں

پچھلے بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی شخص کے لئے خواہ

وہ عربی زبان وادب کا کتنا ہی بڑا عالم ہو، یہ ممکن نہیں کہ نبی ﷺ کی قولی وفعلی حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کریم کو سمجھ لے، کیونکہ ظاہر ہے کہ زبان کا علم صحابہ کرام سے بڑھ کر کسی کو نہیں ہو سکتا، قرآن انھیں کی زبان میں نازل ہوا تھا، اور اس وقت تک زبان ہر طرح کے عیب ونقص سے پاک تھی، پھر بھی گذشتہ آیات کو صرف زبان کی مدد سے سمجھنے میں ان سے غلطی ہوئی۔

اس بنیاد پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کو سنت کا جس قدر علم ہوگا اسی کے مطابق اسے قرآن کو سمجھنے اور اس سے احکام کو مستنبط کرنے میں آسانی ہوگی، اور جو نہ جانے گا وہ اس فہم سے محروم ہوگا، پھر اگر کوئی سنت کو قابل توجہ ہی نہ سمجھے تو اس کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟

اسی لئے علماء نے متفقہ طور پر یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ قرآن کی تفسیر میں قرآن، سنت[1] اور صحابہ کے اقوال سے مدد ضروری ہے۔

مذکورہ سطور سے قدیم وجدید دور میں متکلمین کی گمراہی اور عقائد واحکام میں ان کی طرف سے سلف صالح کی مخالفت کا سبب واضح ہو جاتا ہے۔ انھوں نے سنت سے دور ہٹ کر صفات وغیرہ کی آیات کو اپنی عقل وخواہش سے سمجھنے کی کوشش کی اور نتیجہ میں گمراہ ہو گئے۔ شرح عقیدہ طحاویہ (ص ۲۱۲ طبع ۴) میں اس سلسلہ میں بڑی اچھی بات کہی ہے، لکھتے ہیں:

" دینی اصول کے سلسلہ میں وہ شخص کیسے کچھ کہہ سکتا ہے جس نے دین کو

---

[1] ہم بہت سے علماء کے اس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ اگر حدیث موجود نہ ہو تو قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے گی، پھر اس کے بعد سنت سے، اسی رسالے کے اخیر میں معاذ بن جبل رضہ کی حدیث پر روشنی ڈالتے ہوئے ہم اس کا سبب واضح کریں گے۔

کتاب وسنت کے بجائے لوگوں کے اقوال سے سیکھا ہو؟ اگر یہ شخص یہ گمان کرے کہ وہ دین کو کتاب اللہ سے لے رہا ہے تو پھر وہ اس کی تفسیر حدیث رسول ص سے نہیں لیتا اور نہ اس پر غور کرتا، نہ صحابہ وتابعین کے اقوال پر نظر رکھتا جو صحیح سند سے ہم تک پہونچے ہیں، ان راویوں نے ہم تک صرف قرآن کے الفاظ کو نہیں پہونچایا ہے، بلکہ اس کے معانی کو بھی پہونچایا ہے، وہ لوگ قرآن کو بچوں کی طرح نہیں سیکھتے تھے، بلکہ اس کے مفہوم کو بھی سمجھتے تھے، اگر کوئی شخص ان کا راستہ نہ اختیار کرے تو پھر اپنی رائے سے بولے گا، اور جو رائے سے بولے، اپنے گمان کو دین سمجھے اور دین کو قرآن سے نہ سیکھے وہ گنہگار ہے خواہ اس کی بات درست ہی ہو، اور جو دین کو کتاب وسنت سے سیکھے وہ غلطی بھی کرے تو اسے اجر ملے گا، اور اگر صواب کو پالے تو دوہرا اجر ملے گا۔"

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں (ص ۲۱۷):

اس لئے ضروری ہے کہ رسول اللہ ص کو مکمل طور پر تسلیم کیا جائے، آپؐ کے حکم کی پیروی کی جائے، آپؐ کی حدیث کی تصدیق کی جائے، کسی باطل خیال کو معقول سمجھ کر حدیث کے مقابلہ میں پیش نہ کیا جائے، اسے شک وشبہ کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے، لوگوں کی رائے کو اس پر مقدم نہ کیا جائے، تنہا رسول اللہ ص کو حکم مانا جائے اور آپ کے احکام کی پیروی کی جائے جس طرح عبادت، انابت اور خضوع وتوکل کو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خاص کیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ اتباع واستدلال اور شریعت کی اساس وقیام کے باب میں قرآن وسنت کے درمیان فرق نہ کریں، یہی دائیں بائیں مائل نہ ہونے کی ضمانت ہے اور اسی سے مسلمان گمراہی سے بچ سکتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ص کا ارشاد ہے:

ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما میں نے تم میں دو امر چھوڑے ہیں جب تک ان

ان تمسکتم بھما : کتاب اللہ و سنتی ، ولن یتفرقا حتی یردا علی الحوض (بروایت مالک و حاکم بسند حسن)	دونوں کو تھامے رہو گے گمراہ نہیں ہو سکتے یعنی اللہ کی کتاب اور میری سنت اور یہ دونوں الگ نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوض پر وارد ہوں۔

اہم تنبیہ مذکورہ سطور کا بدیہی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ : سنت کی جس رسم کو شریعت میں مذکورہ اہمیت حاصل ہے وہ ایسی سنت ہے جو علماء حدیث کے نزدیک علمی طریقوں اور صحیح سندوں سے ثابت ہو ، وہ سنت نہیں مراد ہے جو تفسیر وفقہ ، ترغیب وترہیب اور وعظ ونصیحت کی مختلف کتابوں میں موجود ہے ، کیونکہ ان میں بہت سی ضعیف ، منکر اور موضوع روایتیں موجود ہیں ، بعض تو ایسی ہیں جن سے اسلام بری ہے مثلاً : ہاروت وماروت کی حدیث ، غرانیق کے قصہ والی حدیث ، آخر الذکر حدیث کی تردید میں میرا ایک رسالہ بہ عنوان : نصب المجانیق فی نسف قصۃ الغرانیق) طبع ہو چکا ہے اس نوعیت کی بہت سی حدیثوں کو میں نے اپنی ضخیم کتاب (سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ وأثرھا السیئ فی الامۃ) میں ذکر کیا ہے ، ان احادیث کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ ہو چکی ہے۔

اس لئے علماء کا بالخصوص ان علماء کا جو لوگوں میں اپنی فقہ اور فتاوی کو پھیلاتے ہیں ، یہ فرض ہے کہ کسی حدیث کے ثبوت کو جانے بغیر اس سے استدلال کی جرأت نہ کریں ، کیونکہ فقہ کی جن کتابوں کی جانب یہ لوگ عادۃ رجوع کرتے ہیں وہ واہی ومنکر اور بے اصل حدیثوں سے بھری ہوئی ہیں اور اسے علماء جانتے ہیں۔

میں نے ایک اہم علمی منصوبہ شروع کیا تھا جو فقہ سے متعلق لوگوں کے لئے بہت نفع بخش تھا ، اس کا نام تھا (الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ فی امہات الکتب الفقہیۃ) اور اس میں درج ذیل کتابیں شامل تھیں :

۱۔ فقہ حنفی میں الہدایۃ للمرغینانی۔

۲۔ مالکی فقہ میں المدونۃ لابن القاسم

۳۔ شافعی فقہ میں شرح الوجیز للرافعی

۴۔ حنبلی فقہ میں المغنی لابن قدامہ

۵۔ تقابلی فقہ میں بدایۃ المجتہد لابن رشد اندلسی

لیکن افسوس میں اس منصوبہ کی تکمیل اس لئے نہ کرسکا کہ کویت کے مجلۃ الوعی الاسلامی نے اس منصوبہ کو خوش آمدید کہتے ہوئے شائع کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر جب اسے دیکھا تو شائع کرنے سے انکار کردیا۔

مذکورہ منصوبہ کی تکمیل تو نہ ہوسکی لیکن مجھے امید ہے کہ کسی موقع سے ایک ایسا دقیق علمی خاکہ تیار کرسکوں گا جس سے فقہ پر کام کرنے والوں کو مدد ملے گی، حدیث کے مآخذ کی جانب رجوع کے ذریعہ حدیث کا درجہ معلوم کرنے میں آسانی ہوگی اور ان مآخذ کی خصوصیات اور ان پر اعتماد کا امکان واضح ہوگا۔

حدیث معاذ پر بحث

بات ختم کرنے سے پہلے ناظرین کی توجہ اس مشہور حدیث کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں جس سے شاید اصول فقہ کی کوئی کتاب خالی نہ ہوگی، یہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہے اور کتاب وسنت کے مابین عدم تفریق کی جو بات ہم نے بدلائل ثابت کی ہے اس کے مخالف ہے۔ حدیث کے راوی معاذ بن جبل ہیں، کہتے ہیں کہ رسول اللہ ص نے جب انھیں یمن بھیجا تو فرمایا: بم تحکم؟ الخ کس چیز سے فیصلہ کروگے؟ کہا کتاب اللہ سے فرمایا اگر اس میں نہ پاؤ فرمایا سنت رسول اللہ سے فرمایا اگر اس میں نہ پاؤ کہا اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ آپ نے فرمایا ساری تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے اپنے رسول کے مبلغ کو اس بات کی توفیق دی جسے اس کا رسول پسند کرتا ہے۔

اس حدیث کی سند کے ضعف کو میں نے سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ۔ (رقم ۸۸۵) میں بیان کردیا ہے۔ یہاں صرف یہ کہنا کافی ہے کہ اس حدیث کو امام بخاری

نے منکر کہا ہے، اور جس تعارض کی جانب میں نے اشارہ کیا اس کی توضیح درج ذیل ہے
حدیث معاذ میں حکم و فیصلہ کے تین مرحلے بیان کئے گئے ہیں، اور یہ بتایا گیا
ہے کہ رائے میں حکم کی تلاش سنت کے بعد ہوگی، اور سنت میں قرآن کے بعد۔ رائے
سے متعلق یہ قاعدہ صحیح ہے، چنانچہ علماء کا قول ہے کہ اذا ورد الاثر بطل النظر،
جب حدیث مل جائے تو غور و فکر بیکار ہے۔ لیکن سنت کے سلسلہ میں یہ صحیح نہیں،
کیونکہ سنت قرآن کے سلسلہ میں حاکم اور اس کی مبین ہے، اس لئے قرآن میں حکم
کے وجود کا گمان ہوتے ہوئے بھی اسے سنت میں تلاش کرنا ضروری ہے، قرآن کے
ساتھ سنت کا تعلق ویسا نہیں جیسا سنت کے ساتھ رائے کا ہے، ہرگز نہیں، بلکہ کتاب و
سنت دونوں کو ایک ماخذ ماننا ضروری ہے، دونوں میں تفریق نہیں، نبی ﷺ نے
اس بات کی جانب اشارہ فرمایا ہے:

الا انی اوتیت القرآن ومثله معه۔ — سنو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اسی کے مثل ایک اور چیز۔

اور اس سے سنت ہی مراد ہے۔

آپ نے یہ بھی فرمایا:

لن یتفرقا حتی یردا علی الحوض۔ — یہ دونوں الگ نہ ہوں گے تا آں کہ حوض پر وارد ہوں (یعنی قیامت تک الگ نہیں ہو سکتے)

اس لئے قرآن و سنت کے مابین درجہ کی تعیین صحیح نہیں کیونکہ اس سے دونوں
میں تفریق لازم آتی ہے جو باطل ہے۔

خاتمہ پر اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں تمام غلطیوں، گمراہیوں اور اپنی ناراضگی کے
کاموں سے محفوظ رکھے، وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین ۞

پہلا رسالہ تمام ہوا

۲
دوسرا رسالہ
عقائد میں
حدیث آحاد سے استدلال واجب ہے
مخالفین
کے
شبہات کا جواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد للہ وحدہ، والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ وآلہ وصحبہ وجندہ اما بعد :

کئی صدی پیشتر کچھ مسلمان علماء علم الکلام کی طرف سے ایک غلط اور خطرناک نظریئے کا ظہور ہوا یعنی یہ کہ : حدیث آحاد اسلامی عقائد کے باب میں حجت نہیں ہیں شرعی احکام میں گو حجت ہوں "، یہ رائے کئی متاخرین علماء اصول نے بھی اختیار کی ہے اور موجودہ دور میں مسلمان اہل قلم اور داعیوں کے ایک گروہ نے اس رائے پر تکیہ کر لیا ہے حتی کہ بعض کے نزدیک یہ اتنا بدیہی امر بن چکا ہے جس کے لئے بحث ونقد کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اور بعض نے غلو کرتے ہوئے یہاں تک کہا کہ حدیث آحاد پر کسی عقیدے کی بنیاد قائم کرنا قطعاً جائز نہیں ہے اگر کسی نے ایسا کیا تو وہ فاسق اور گنہ گار ہو گا۔

اس منفرد رائے پر گذشتہ صدیوں میں اور موجودہ دور میں بھی علماء اسلام نے تردیدی کتابیں شائع کیں جن میں سب سے اہم رد علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "مختصر الصواعق المرسلہ" اور امام کبیر ابن حزم رحمہ اللہ نے اپنی بیش قیمت کتاب " الاحکام فی اصول الاحکام " میں کیا ہے۔

اس اہم موضوع پر میں نے سترہ سال پیشتر ایک تحقیق لکھی تھی اور جسے دمشق کے مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اجتماع میں پیش کیا تھا، اس میں اپنی حد تک میں نے قطعی اور واضح دلائل پیش کر کے مذکورہ نظریئے اور اس کے مغالطوں اور فریب کاریوں

کی نقاب کشائی کی ہے جس کا بہترین اثر ہوا۔ اس خطرناک نظریئے اور اس کی رو میں بہنے سے بہت سے بھائیوں کے محفوظ کرنے کی اللہ نے جو توفیق عطا کی اس کے لئے ہر طرح کی حمد و تعریف کا اقرار اللہ ہی کے لئے کرتا ہوں اس کا ایک پہلو سے یہ بھی اثر ہوا کہ اس ملک میں اس نظریئے کی مقبولیت و اشاعت کمزور پڑ گئی اور اس کی تبلیغ کرنے والے اور ماننے والے خاموش ہو گئے۔

بہت سے بھائیوں نے اس مفید تحقیق کی اشاعت کی تجویز پیش کی تاکہ ممکن حد تک مسلمانوں کی بڑی تعداد کو اس سے استفادہ عام کا موقعہ ملے اس وجہ سے ہم نے اپنی کتاب "الحدیث حجۃ بنفسہ فی العقائد والاحکام" میں قریب ترین ممکن فرصت میں اس کی اشاعت کا وعدہ کیا تھا اب نظر ثانی کے بعد فرمائشوں کی کثرت کے پیش نظر نیز گذشتہ وعدے کو پورا کرتے ہوئے ہم قارئین کرام کی خدمت میں اس رسالے کو پیش کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اسے خیر کثیر کا ذریعہ بنائے گا اور اس موضوع سے متعلق جن کے قدم پھسل گئے ہیں اور اولین مومنوں کی راہ سے بھٹک گئے ہیں ان کی تردید فرمائے گا اور اس کے ذریعہ سنت کے زندہ کرنے والوں اور اس پر عمل پیرا ہونے والوں کو ایسا مضبوط ہتھیار عطا کرے گا جس سے وہ اپنے نبی کی سنت کی مدافعت کر سکیں، اور شبہات کا ازالہ اور شکوک و اوہام کو دور کر سکیں

اخیر میں اللہ تعالیٰ سے امید کرتا ہوں کہ اس کے ذریعہ مجھے اپنے ثواب سے نوازے گا اور اپنے دین کے محافظوں اور اپنی شریعت کے حامیوں میں شامل فرمائے گا۔ انہ سمیع مجیب۔

دمشق ۸ / ۲ / ۱۳۹۴ ھ

مطابق ۱ / ۳ / ۱۹۷۴ ع

عقائد میں حدیث آحاد سے استدلال واجب ہے

عقائد میں حدیث آحاد سے استدلال کو جائز نہ ٹھہرانے والوں میں سے بعض کا خیال ہے کہ عقیدہ دلیل قطعی ہی سے ثابت ہوتا ہے یعنی آیت قرآن یا حقیقی تواتر سے ثابت متواتر حدیث سے جبکہ اس دلیل میں تاویل کی گنجائش نہ ہو۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اس امر پر علما اصول کا اتفاق ہے اور احادیث آحاد سے علم کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا[1] اور نیز ان سے عقیدے کا اثبات نہیں ہو سکتا[2]

لیکن یہ قول اگرچہ بعض قدیم متکلمین نے اختیار کیا ہے، مختلف وجوہات سے باطل ہے۔

پہلی وجہ یہ ایک نوایجاد اور اختراعی قول ہے شریعت اسلامیہ میں اس کی کوئی اصل موجود نہیں ہے یہ کتاب وسنت کی ہدایات وتوجیہات سے بعید ہے جسے سلف صالح رضوان اللہ علیہم نہیں جانتے نہ یہ قول ان میں سے کسی سے منقول ہے اور نہ کسی دل میں ان کے متعلق یہ کھٹک پیدا ہوئی، دین حنیف کا یہ معروف اصول ہے کہ امور دین میں سے کوئی نوایجاد امر باطل اور قابل رد ہے کسی حال میں اسے قبول کرنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے جائز نہیں "من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد" متفق علیہ۔

---

[1] میں کہتا ہوں ان کے نزدیک مطلب یہ ہوا کہ اس بات کا امکان ہے کہ وہ کذب یا خطا ہو۔

[2] یہ بات عرض کر دینی مناسب ہے کہ حدیث آحاد سے مراد حدیث صحیح ہے جو متعدد صحیح طرق سے وارد ہو لیکن وہ تواتر کے درجے کو نہ پہونچی ہو اس طرح کی حدیث کو یہ لوگ رد کر دیتے ہیں اور عقیدے میں اسے قبول نہیں کرتے اس موضوع سے متعلق اہم حدیثی معلومات کے لئے ہمارے رسالہ "الحدیث حجۃ بنفسہ" کا مقدمہ دیکھئے۔

(ترجمہ) جس نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات ایجاد کی جو اس میں سے نہیں ہے تو وہ باطل اور مردود ہے۔ نیز دوسری حدیث میں آپؐ فرماتے ہیں ایاکم ومحدثات الامور فان کل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ، وکل ضلالۃ فی النار تم نو ایجاد باتوں سے بچو اس لئے کہ ہر نو ایجاد بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے والی ہے۔ اس حدیث کو احمد، اصحاب سنن، اور بیہقی نے روایت کیا ہے، آخری جملہ نسائی اور بیہقی میں ہے اور اس کی اسناد صحیح ہے۔

یہ قول علم کلام کے علماء کی ایک جماعت کا ہے نیز متاخرین علماء اصول کا بھی جو ان سے متاثر ہوئے۔ بعض معاصر اہل قلم نے بھی بغیر نقد و دلیل کے ان کے اس قول کو لے لیا ہے حالانکہ عقائد میں ایسا نہیں کیا جاتا، خاص طور سے ایسے لوگوں کے یہاں جو عقیدے کے ثبوت کے لئے دلالت اور ثبوت کی قطعیت کے قائل ہیں۔

دوسری وجہ یہ نظریہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس سے صرف عقائد سے متعلق ہونے کی بناء پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت سیکڑوں صحیح احادیث رد ہو جاتی ہیں یعنی یہ نظریہ کہ حدیث آحاد سے عقیدہ ثابت نہیں ہو سکتا اگر ان متکلمین اور ان کے ماننے والوں کا یہی خیال ہے تو ہم ان کے اعتقاد کے مطابق ان سے کہیں گے کہ اس عقیدے کی صحت پر آپ کے پاس کون سی آیت یا حدیث متواتر بطور یقینی دلیل کے ہے جو ثبوت اور دلالت کے اعتبار سے بھی قطعی ہو کہ اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہ ہو؟

کچھ لوگ اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہوئے کچھ ایسی آیتوں سے استدلال کرتے ہیں جن میں ظن کی اتباع سے ممانعت آئی ہے جیسے مشرکین کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ان یتبعون الا الظن وان الظن لا یغنی من الحق شیئا (النجم ۲۸) یہ لوگ صرف ظن اور اٹکل باتوں کو مانتے ہیں اور حقانیت کے موقع پر ظنی امور کچھ فائدہ نہیں دے سکتے۔

ہم اس کا جواب دو طرح سے دیتے ہیں۔

۱۔ جس ذات پر یہ اور اس کے مثل آیات نازل ہوئی ہیں اسی ذات پر وہ آیات بھی اتری ہیں جن میں افراد اور جماعتوں کو علم حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے جیسے ارشاد باری ہے:

وما کان المومنون لینفروا کافۃ، فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون (التوبہ ۱۲۲) اور نہ یہ مناسب ہے کہ مسلمان سارے کے سارے ہی نکل پڑیں پس ایسا کیوں نہ کریں کہ ہر ایک قوم سے چند آدمی آئیں تاکہ دین کی سمجھ حاصل کریں اور جب اپنی قوم میں جائیں تو ان کو سمجھائیں تاکہ وہ بھی بچتے رہیں۔

طائفہ کا اطلاق عربی زبان میں ایک اور اس سے زیادہ پر ہو جاتا ہے[1] لہذا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ وہ گروہ لوٹنے کے بعد اپنی قوم کو سمجھائے گا اور انذار کے معنی ہیں ایسی باتوں کی خبر دینا جن سے علم کا فائدہ حاصل ہو یہ چیز عقیدہ اور شریعت کی دیگر تعلیمات کی تبلیغ سے حاصل ہوتی ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

یاایھا الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا (الحجرات ۶) دوسری قرأت میں ہے۔ فتثبتوا۔ اے ایمان والو! اگر کوئی بدکار تمھارے پاس کوئی خبر لائے تو تم اس بات کی تحقیق کر لیا کرو ..... یا اس کے ثبوت کا یقین کر لیا کرو۔ یہ آیت ایک ثقہ شخص کی خبر کی قبولیت کی قطعیت اور یقین پر دلالت کرتی ہے ایسی صورت میں ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر اس کی خبر سے علم کا فائدہ حاصل نہ ہوتا تو علم کو حاصل کرنے کے لئے غور و فکر کا حکم دیا جاتا۔ یہ اور اس جیسی دیگر

---

[1] دیکھئے الحدیث حجۃ بنفسہ ص ۳۱

آیات سے خبرِ واحد سے علم کا فائدہ حاصل ہونے کی دلالت ہوتی ہے۔ لہٰذا مذکورہ آیت سے اپنے مزعومہ خیال پر استدلال کرنا جائز نہیں ہے ورنہ بعد کی دونوں آیتیں بیکار رہ جائیں گی بلکہ ضروری امر یہ ہے کہ اس کی ایسی تفسیر کی جائے جو ان دونوں آیتوں کے مفہوم سے مطابقت رکھے جیسے یہ کہا جائے کہ اس آیت میں ظن سے مراد ایسا ظن ہے جس سے علم کا فائدہ حاصل نہ ہو بلکہ وہ خواہش اور ایسی غرض پر مبنی ہو جو شریعت کے مخالف ہو اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ کے ایک دوسرے فرمان میں ہے: ان یتبعون الا الظن، وما تھوی الانفس، ولقد جاءھم من ربھم الھدی (النجم ۲۳)
یہ لوگ صرف اپنے گمان کی اور اپنی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں حالانکہ ان کے پاس ان کے پروردگار کے پاس سے رہ نمائی کے لئے ہدایت آچکی ہے۔

۲۔ اگر اس بات کی کوئی قطعی دلیل ہوتی کہ عقیدہ خبرِ آحاد سے ثابت نہیں ہوتا جیسا کہ ان لوگوں کا گمان ہے تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اس کی ضرور توضیح کرتے اور اس کی مخالفت وہ علمار کبار نہ کرتے جن کا ذکر آگے آئے گا کیونکہ یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہے کہ وہ قطعی دلیل کا انکار کریں گے یا وہ ان کی نظر سے مخفی رہے گی جب کہ وہ علم وفضل اور تقویٰ کی بلندیوں پر ہیں اس لئے اس بارے میں ان کی مخالفت بجائے خود ایک بڑی دلیل ہے کہ یہ رائے یا حدیث آحاد کے متعلق یہ عقیدہ ظنی اور غیر قطعی ہے۔ خواہ یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ علمار، حدیث آحاد پر عمل کرنے کے سلسلے میں غلطی پر ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھیں علمار کا موقف صحیح ہے اور ان کے مخالف علمار کلام اور ان کے مقلدین ہی غلطی پر ہیں جیسا کہ آگے آئے گا۔

تیسری وجہ

یہ خیال کتاب وسنت کے ان تمام دلائل کے مخالف ہے جن کو ہم اور وہ بھی شرعی احکام میں حدیث آحاد سے استدلال کے وجوب میں حجت مانتے ہیں اس لئے کہ وہ دلائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تمام باتوں کو خواہ ان کا تعلق عقیدے سے ہو یا احکام سے عام ہیں جیسا کہ

دوسری وجہ میں ہم نے بعض آیات کا ذکر کیا ہے امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الرسالہ" میں ان کا استقصاء کیا ہے تحقیق کرنے والوں کو اس کی طرف رجوع کرنا چاہئے[۱] اس لئے ان دلائل کو احکام کے ساتھ خاص کرنا اور عقائد کو چھوڑ دینا ایسی تخصیص ہے جس کے لئے کوئی مخصص دلیل نہیں ہے اور یہ باطل ہے اور جس سے باطل لازم آئے وہ خود باطل ہے۔

چوتھی وجہ قول مذکور نہ صرف یہ کہ اسے صحابہ نے کہا نہیں ہے بلکہ یہ ان کے عمل کے بھی خلاف ہے۔ ہمیں یہ یقین ہے کہ وہ لوگ ان تمام باتوں پر یقین کرتے تھے جنھیں ان میں سے کوئی بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے نام سے بیان کرتا تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بیان کرنے والے صحابی سے ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ تمھاری خبر خبر واحد ہے اس سے علم کا فائدہ اس وقت تک حاصل نہ ہو گا جب تک یہ خبر متواتر نہ ہو بلکہ حدیث آحاد سے استدلال کے وجوب سے متعلق عقائد واحکام کے باب میں تفریق کے فلسفے سے جو ان کے بعد کچھ مسلمانوں میں سرایت کر گیا ہے وہ لوگ واقف ہی نہ تھے حتی کہ ان میں سے اگر کوئی مثلاً صفات کے متعلق کوئی حدیث روایت کرتا تو دوسرا اسے قبول کرتا تھا اور اس صفت کا قطعیت اور یقین کے ساتھ اعتقاد کرتا تھا جیسے رب کی رویت اس کا کلام کرنا اور قیامت کے روز اس کا اس طرح ندا کرنا کہ قریب والے کی طرح دور والا بھی سنے گا اور ہر روز آسمان دنیا کی طرف اس کا نزول کرنا ان سب اعتقادی صفات کے متعلق احادیث کو جس نے کسی ایسے شخص سے سنا جو انھیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے بیان کرتا ہو یا کسی صحابی کے واسطے سے تو ان صفات کے ثبوت کا اس نے محض صادق اور عادل شخص سے سننے کی بنا پر اعتقاد کیا اور اس میں کسی طرح کا پس و پیش نہیں کیا بلکہ بسا اوقات کچھ احادیث احکام

---

[۱] اس سلسلے میں معلومات کے لئے الحدیث حجۃ بنفسہ بھی دیکھئے :

کے متعلق حقیقت کی جستجو کرتے تھے اور دوسری روایت سے اس کا مفہوم متعین کرتے تھے۔ جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو موسیٰ کی حدیث کا ابو سعید خدری کی روایت سے مفہوم متعین کیا تھا لیکن احادیث صفات کے متعلق کسی صحابی نے قطعاً دوسری روایت سے مدد نہیں طلب کی بلکہ سب سے زیادہ ان کی قبولیت، تصدیق اور انکے مقتضی پر یقین میں سبقت کرنے والے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے خبر دینے والوں کے ذریعہ وارد خبروں سے صفات کو ثابت مانتے تھے جس شخص کو بھی سنت سے لگاؤ اور دلچسپی ہوگی وہ اسے جانے گا۔[1]

پانچویں وجہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ اے رسول جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تمھاری طرف اتارا گیا ہے اسے دوسروں تک پہونچا دو اور اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو گویا تم نے اپنا پیغام دوسروں تک نہیں پہونچایا۔ نیز ارشاد فرماتا ہے۔ ما علی الرسول الا البلاغ المبین ٥ نہیں ہے رسول کے اوپر ذمہ داری مگر کھلے طور پر لوگوں تک پہونچا دینا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے بلغوا عنی (متفق علیہ) میری طرف سے لوگوں کو پہنچا دو۔ اور عرفہ کے دن صحابہ کے عظیم مجمع میں آپ نے ان سے کہا: تم سے میرے متعلق پوچھا جائے گا تو تم کیا جواب دوگے؟ انھوں نے کہا ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے اپنا پیغام پہونچا دیا، اپنا فرض ادا کر دیا اور دوسروں کو نصیحت کر دی (مسلم) یہ بات معلوم ہے کہ بلاغ اسی کا نام ہے جس سے مخاطب پر حجت قائم ہو اور اس سے علم حاصل ہو لہذا اگر خبر واحد سے علم حاصل نہ ہوتا تو اس سے تبلیغ کا وہ فریضہ بھی ادا نہ ہوتا جس سے بندے پر اللہ کی حجت قائم ہوتی ہے حجت تو اسی بات سے

---

[1] دیکھئے مختصر الصواعق المرسلہ علی الجھمیہ والمعطلۃ ۲/ ۳۶۱ - ۳۶۲

قائم ہوتی ہے جس سے علم حاصل ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے کسی ایک صحابی کو بھیجتے تھے جو آپ کی طرف سے دوسروں کو تبلیغ کرتا تھا جس سے سامع پر حجت قائم ہو جاتی تھی اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور سنت جو عادل ثقہ راویوں سے ہم تک پہونچے ان سے ہم پر حجت قائم ہوئی اگر یہ علم کا فائدہ نہ دیتے تو ان سے حجت قائم نہ ہوتی اور نہ اس شخص پر حجت قائم ہوتی جسے ایک یا دو یا تین یا چار یا عدد تواتر سے کم اشخاص کے ذریعہ کوئی خبر پہونچتی اور یہ انتہائی باطل چیز ہے اس لئے جس شخص نے یہ کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث علم کا فائدہ نہیں دیتیں اسی سے دو باتوں میں سے ایک لازم آئے گی۔

۱۔ یا تو وہ یہ کہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن اور جسے تواتر کی تعداد نے روایت کیا ہے کے سوا کچھ نہیں پہونچایا اور ان کے سوا جو کچھ ہے اس سے حجت اور تبلیغ کا فریضہ قائم و ثابت نہیں ہوا۔

۲۔ یا وہ یہ کہے کہ حجت اور تبلیغ ایسی باتوں سے حاصل ہوئی جن سے نہ علم واجب ہوتا ہے اور نہ عمل کا تقاضا سمجھ میں آتا۔

اور ان دونوں باتوں کے باطل ہونے سے یہ قول بھی باطل ہو گیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث جنھیں ثقہ، عادل اور حافظ راویوں نے روایت کیا اور امت نے جنھیں قبول کیا ہے علم کا فائدہ نہیں دیتیں اور یہ بات پورے طور پر عیاں ہے۔[1]

چھٹی وجہ ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم صحابہ کے مختلف افراد کو مختلف علاقوں میں دین سکھلانے کے لئے بھیجتے تھے جیسا کہ آپ نے علی معاذ اور ابو موسیٰ کو مختلف موقعوں پر یمن کی طرف بھیجا اور

---

[1] الصواعق جلد ۲، ۳۹۶، ۳۹۷ -

ہم یہ بھی یقینی طور پر جانتے ہیں کہ دین کی سب سے اہم چیز عقیدہ ہے۔ یہ سب سے پہلی چیز ہے جس کی طرف رسول کے یہ مبلغین دوسروں کو بلاتے تھے جیسا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے معاذ سے فرمایا تھا: تم اہل کتاب کے پاس جا رہے ہو اس لئے سب سے پہلے انھیں اللہ کی عبادت کی طرف بلانا دوسری روایت میں ہے۔ انھیں لا الٰہ الا اللہ کی گواہی دینے کی دعوت دینا جب انھیں اللہ کی معرفت حاصل ہو جائے تو انھیں خبر دینا کہ اللہ نے ان پر پانچ وقت کی نماز فرض کی ہے (متفق علیہ) لفظ مسلم کا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انھیں حکم دیا کہ سب سے پہلے انھیں عقیدۂ توحید کی تعلیم دیں انھیں اللہ عزوجل کی معرفت سکھلائیں جو صفات اس کے لئے واجب ہیں اور جن باتوں سے اس کی ذات پاک ہے ان کی تعلیم دیں جب وہ ان باتوں کو سیکھ جائیں تو انھیں وہ باتیں سکھلائیں جنھیں اللہ نے ان پر فرض کیا ہے۔ معاذ نے یقیناً انھیں انجام بھی دیا اس لئے یہ قطعی دلیل ہے کہ عقیدہ خبر واحد سے ثابت ہوتا ہے اور اس سے لوگوں پر حجت قائم ہوتی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صرف معاذ کے بھیجنے پر اکتفا نہ کرتے اور یہ واضح بات ہے والحمد للہ۔

ہم نے جو باتیں ذکر کی ہیں جو شخص انھیں تسلیم نہ کرے اسے دو باتیں لازم ہوں گی تیسری کی مطلق گنجائش نہیں۔

۱۔ یا تو وہ یہ کہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مبلغین لوگوں کو عقائد نہیں سکھلاتے تھے اس لئے کہ نبی نے انھیں اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ انھیں صرف احکام کی تبلیغ کا حکم دیا تھا اور یہ بات بدیہی طور پر باطل ہے کیوں کہ سابقہ حدیث معاذ کے یہ بالکل مخالف ہے۔

۲۔ یا وہ یہ کہے کہ وہ عقائد کی تبلیغ پر مامور تھے انھوں نے ایسا کیا بھی انھوں نے تمام اسلامی عقائد کی تبلیغ کی جن میں یہ خیالی عقیدہ بھی شامل ہے کہ

خبر آحاد سے عقیدہ ثابت نہیں ہوتا ہے،، یہ خیال فی نفسہ عقیدہ ہے جیسا کہ گذر چکا ہے اس بنیاد پر یہ مبلغین رضوان اللہ علیہم لوگوں سے کہتے تھے: ہم جو عقائد تم کو سکھلاتے ہیں ان پر ایمان لاؤ لیکن ان پر ایمان لانا واجب نہیں ہے اس لئے کہ یہ اخبار آحاد ہیں اور سابقہ خیالات کی طرح یہ بھی باطل ہے اور جس سے باطل لازم آتا ہے وہ بھی باطل ہے اس سے اس قول کا باطل ہونا ثابت ہوگیا اور عقائد کے باب میں خبر آحاد سے استدلال کرنے کا وجوب بھی ثابت ہوگیا۔

ساتویں وجہ مذکورہ نظرئے سے اعتقادی امر میں مسلمانوں میں باہم تفاوت بھی لازم آتا ہے باوجودیکہ خبر سب تک پہونچی ہے اور یہ بھی باطل ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ لانذرکم بہ ومن بلغ۔ تاکہ اس کے ذریعہ تمہیں خبردار کروں اور جس تک یہ پہونچے اور صحیح مستفیض روایت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

نضر اللہ امرأ سمع مقالتی فاداھا کما سمعھا، فرب مبلغ اوعی لہ من سامع (ترمذی اور ابن ماجہ نے اسے روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے) اللہ اس شخص کو شاداب رکھے جس نے میری بات سنی تو اسے دوسروں تک ویسے ہی پہونچادیا جیسے کہ سنا تھا، سنے ہوئے شخص سے بہت سے سننے ہوئے مخاطب اس بات کو زیادہ سمجھنے والے ہوتے ہیں۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ کسی صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدے سے متعلق کوئی حدیث سنی مثلاً آسمان دنیا پر اللہ تعالیٰ کے نزول کا عقیدہ تو اس صحابی پر اس کا اعتقاد واجب ہے اس لئے کہ خبر اس کے تئیں یقین ہے لیکن وہ شخص خواہ وہ صحابی ہو یا تابعی جس نے اس صحابی سے حدیث کو لیا ہے اس پر اس کا اعتقاد واجب نہیں ہے اگرچہ دلیل اس تک پہونچی اور اس کی صحت پر اس کا یقین ہوا اس لئے کہ وہ اس کے پاس خبر آحاد کے ذریعہ

پہونچی ہے یعنی اس صحابی کے ذریعہ جس نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے اس حدیث کو سنا ہے اس سے متعلق خطا کا احتمال ہے اس لئے ان لوگوں کے نزدیک اس سے عقیدہ ثابت نہیں ہوگا، اور اس توجیہ کا اعتبار کرنے میں فساد ہے، اس لئے کہ اسے باطل قیاس پر قائم کیا گیا ہے یعنی امت کے لئے کسی عام مسئلے یا صفات رب تعالیٰ میں سے کسی صفت کے خبر دینے والے کو کسی مخصوص مسئلے کے متعلق گواہی دینے والے پر قیاس کرنا ان دونوں میں کتنا فرق ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے خبر دینے والے کے متعلق گو یہ فرض کیا جائے کہ اس نے قصداً یا بطور خطا جھوٹ کا استعمال کیا ہے اور اس سے متعلق یہ بات ثابت نہیں کہ وہ جھوٹ بولا ہے تو اس سے حق کا مخدوش کرنا لازم آتا ہے اس لئے کہ گفتگو اس خبر سے متعلق ہے جسے امت نے قبول کیا ہے اور اس کی دلالت پر عمل کیا ہے۔ اور اس کے ذریعہ رب تعالیٰ کی صفات اور اس کے افعال کو ثابت کیا ہے کیونکہ شرعاً جن خبروں کو قبول کرنا واجب ہے وہ واقعتاً باطل نہیں ہو سکتیں خصوصاً جبکہ پوری امت نے انھیں قبول کیا ہو اسی طرح ہر دلیل کے متعلق جس کی اتباع شرعاً واجب ہے یہی کہا جائے گا کہ وہ حق ہی ہے اس لئے اس کا مدلول فی الواقع ثابت ہوگا یہ بات ان باتوں سے متعلق ہے جن کی رب تعالیٰ کی شریعت اور اس کے اسماء و صفات کے متعلق خبر دی جاتی ہے برخلاف کسی معین چیز پر کسی مخصوص شہادت کے کہ حقیقت میں اس کا مقتضیٰ ثابت نہیں ہوتا۔

حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ وہ خبر جس کے ذریعہ اللہ نے امت کو اپنا عبادت گذار بنایا اور اپنے رسول کی زبانی اسے افراد امت کو بتایا جس کا تعلق اللہ کے اسماء صفات کے اثبات سے ہے فی الواقع وہ کذب و باطل نہیں ہو سکتی وہ بندوں پر اللہ کی طرف سے قائم کی ہوئی حجتوں میں سے ایک ہے اور اللہ کی حجتیں کذب و باطل نہیں ہو سکتیں، بلکہ حقیقی طور پر وہ حق ہی ہوں گی، حق اور باطل دلائل باہم مساوی نہیں ہو سکتے، اللہ اس کی شریعت اور اس کے دین پر افترا اس وحی کے مشابہ نہیں ہو سکتا جسے اللہ نے

اپنے رسول پر نازل کیا ہے اور اس کے ذریعہ خلق کو اپنا عبادت گذار بنایا ہے ان دونوں میں عدم تمیز درست نہیں، حق اور باطل، صدق اور کذب وحی شیطان اور اللہ کی طرف سے فرشتے کی وحی کا مسئلہ باہم مشتبہ ہونے سے بالاتر ہے اللہ نے حق بات کے لئے سورج کی روشنی کی طرح اجالا مقدر کیا ہے جو روشن بصیرتوں کے لئے واضح ہے اور باطل کو رات کی تاریکی کی طرح تاریکیوں کا جامہ پہنایا ہے گو یہ بات بعید نہیں کہ کوئی نگاہوں پر رات اور دن میں کوئی فرق نہ ہو جس طرح بصیرت سے کورے لوگوں پر حق اور باطل میں اشتباہ قائم رہتا ہے معاذ بن جبل کہتے ہیں: حق کہنے والے سے حق قبول کر لو اس لئے کہ حق کے لئے ایک روشنی ہے ،، لیکن جب دل تاریک ہو جاتے ہیں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیمات سے اعراض کرنے کے سبب بصیرتیں بے نور ہو جاتی ہیں اور لوگوں کے اقوال سے انھیں مشابہ ٹھہرانے کے سبب تاریکیاں مستزاد ہو جاتی ہیں ایسے لوگوں پر حق اور باطل گڈمڈ ہو جاتا ہے اور وہ امت کے عادل اور صادق ترین لوگوں سے روایت کی ہوئی صحیح احادیث کا کذب ہونا جائز قرار دینے لگتے ہیں اور باطل، جھوٹی اور باہم متضاد روایات کو جو ان کی خواہشات کے مطابق ہوں صدق ٹھہرانے لگتے ہیں اور ان سے حجت پکڑتے ہیں۔ اس مسئلے کی حقیقت یہ ہے کہ ثقہ اور عادل راویوں کے ذریعہ بیان شدہ اخبار جن پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر واجب قرار دیا ہے فی الواقع ان کا کذب اور خطا ہونا درست نہیں ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نہیں بیان کی ہے۔

جو شخص علم کے واجب ہونے کی بات کہتا ہے ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ یہ جائز نہیں کیونکہ جب عمل کو واجب قرار دینے والی شرائط پائی جائیں گی تو اس سے فی الواقع حدیث کی خبر دینے والے کا ثبوت واجب ہو جاتا ہے [1] لیکن اس بات کو وہی سمجھ سکتا

---

[1] الصواعق ۲ / ۳۶۸، ۳۷۰

ہے جیسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث اور آپ کے اخبار و سنن سے لگاؤ ہو دوسرے لوگ اس میں بے بصیرت ثابت ہوں گے لہذا جب وہ یہ کہتے ہیں کہ آپؐ کی خبریں اور صحیح احادیث علم کا فائدہ نہیں دیتیں تو اس وقت وہ اپنے آپ کے متعلق یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان سے انھوں نے کوئی علم حاصل نہیں کیا ہے لہذا اپنے متعلق جس بات کی خبر وہ دے رہے ہیں اس میں وہ سچے ہیں البتہ اس بات میں وہ کاذب ہیں کہ احادیث اہل حدیث وسنت کے لئے علم کا فائدہ نہیں دیتیں [1]

آٹھویں وجہ اس عقیدے کے لوازم میں سے یہ بھی ہے کہ عقیدے کے باب میں حدیث سے مطلق استدلال صحابہ کے بعد کے لوگوں کے لئے باطل ہو جاتا ہے لیکن پہلے کی طرح یہ بات بھی باطل ہے بلکہ اس سے زیادہ باطل ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ جمہور مسلمانوں کو خصوصاً حدیث کے جمع وتدوین سے پہلے حدیث آحاد کے طریقے سے پہونچی ہے۔ جن لوگوں کے پاس کوئی حدیث تواتر کے طریقے سے پہونچی ہے ایسے لوگ ہر دور میں بہت تھوڑے ہیں جنھوں نے حدیث حدیث کے طرق کے احصار وتتبع کی کوشش کی، اور جس سے ان کو حدیث متواتر کا ایک قابل لحاظ مجموعہ مل گیا، لیکن متکلمین اور ان کے مزعومہ قول کو ماننے والے متبعین کا ان مخصوص لوگوں سے استفادہ کرسکنا عقل میں آنے والی بات نہیں، اسس لئے کہ محدث کا یہ کہنا کہ: ھٰذا حدیث متواتر یا یہ حدیث متواتر ہے اس سے انھیں یقین کا فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا کہ وہ حدیث متواتر ہی ہے اسس لئے کہ اس کا کہنے والا فرد واحد ہے اس لئے اس کی خبر خبر واحد ہے۔ جو ان کے نزدیک بھی علم کا فائدہ اس وقت تک نہیں دے سکتی جب تک اس کے ساتھ تواتر کی حد تک پہونچی ہوئی محدثین کی تعداد شامل نہ ہو ان میں سے ہر ایک کہتا کہ: یہ متواتر ہے،، اور یہ عادۃً غیر ممکن ہے۔ خصوصًا ایسے لوگوں کے لئے جن کا حدیث اور کتب محدثین

---

[1] الصواعق ۲ / ۳۷۹

سے کوئی لگاؤ نہیں ہے، بلکہ ان متکلمین کے لئے یہ تو آسان ہے کہ کسی حدیث کے متعدد طرق کا خود سنت کی کتابوں سے استخراج کر لیں، کیونکہ ایسی کتابیں، اور ان سے حدیث کا مراجعہ آسان ہے، لیکن اگر وہ کسی حدیث کے تواتر سے متعلق محدثین کی ایک جماعت کی شہادت جمع کرنا چاہیں تو یہ چیز ان کے لئے آسان نہ ہوگی، کیونکہ تواتر سے متعلق کسی نہ کسی کا قول چھوٹ جائے گا، اور کبھی بعض علماء کلام کا یہ قول سامنے آئے گا کہ یہ حدیث آحاد ہے اس لئے کہ ان کا تعلق محدثین کی کتابوں کے بجائے اپنی کتابوں سے ہوتا ہے۔ اسی لئے ان میں سے کسی ایک کا قول ہی ان کے لئے قابل اعتماد ٹھہرے گا حالانکہ یہ بات اس فن کے ماہر شخص کے خلاف ہوگی اس کی بعض مثالیں آئندہ آئیں گی۔

اس خیال سے دو باتوں میں سے ایک کا لازم آنا ضروری ہے۔

١۔ یا تو یہ کہا جائے کہ عقیدہ خبر آحاد سے ثابت ہوتا ہے اس لئے کہ عام لوگوں تک خبر کا تواتر کے ساتھ پہونچنا مشکل امر ہے اور گذشتہ اور آگے آنے والے وجوہ کے مطابق یہی قطعی طور پر درست بھی ہے۔

٢۔ یا یہ کہا جائے کہ عقیدہ خبر آحاد سے ثابت نہیں ہوتا گو ماہرین فن اس کے تواتر کی گواہی دیں جب تک کہ تمام لوگوں کے نزدیک اس کا تواتر ثابت نہ ہو جائے جیسا کہ پیچھے اس کا بیان گذر چکا ہے کہ ائمہ حدیث کے ایک گروہ کی عام مسلمانوں کیلئے تواتر کی شہادت کا حصول بہت مشکل امر ہے اور جیسا کہ میرا خیال ہے کوئی عاقل شخص اس کا التزام نہیں کرے گا، بلکہ خصوصی طور پر ان میں سے اکثر لوگ اپنے خطبوں اور مقالات میں ہر علم سے متعلق ماہرین لوگوں کی طرف رجوع کو واجب قرار دینے کی تاکید کرتے ہیں انھیں میں سے ایک صاحب ایسے شخص سے متعلق جو اجتہاد کی طاقت نہیں رکھتا تقلید کو ضروری امر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں: ہر علم کے لئے یکسو اور شغف خاص رکھنے والے، نیز اس سے ناآشنا ہو، اس سے بچنے والا ہو اور اس کے اصول واحکام سے بالکل

ناواقف لوگ ہوتے ہیں۔ اگر عدالت میں تمھارا کوئی مقدمہ ہے اور تم قانون داں نہیں ہو تو تمھیں مجبوراً وکیلوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اور ان میں سے کسی کی تقلید کرنی پڑے گی جسے وہ اپنے اجتہاد سے حل کرے گا، اگر تم کسی گھر کی تعمیر کرنا چاہو تو تمھیں انجینیئروں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، اگر تمھارا بچہ بیمار ہو جائے تو تم اطباء کی طرف رجوع کرو گے، اگر فرانس میں پڑھے ہوئے طبیب کو کسی علاج میں شفا نظر آئے اور امریکا سے ڈگری حاصل کئے ہوئے طبیب کو اس علاج میں مضرت نظر آئے اور تمھارے لئے ان میں سے کسی ایک کی تقلید کے سوا چارہ نہ ہو اور دونوں باتوں میں سے کسی ایک کی ترجیح کے لئے تمھارے پاس کوئی راستہ نہ ہو ایسی صورت میں تم کیا کرو گے؟ تم اپنے دل سے فیصلہ لوگے اور جس طرف وہ مائل ہوگا اس کی طرف مائل ہو جاؤ گے دینی معاملات میں یہی حال ایک عامی مقلد کا ہے ایسی صورت میں علم دین اور علوم دنیا میں تقلید ضروری قرار پاتی ہے اس لئے کہ یہ بات محال ہے کہ ہر انسان ہر علم کا جاننے والا ہو اور اسے اس میں رائے، تحقیق اور اجتہاد کا مقام حاصل ہو۔

جب بات اس طرح کی ہے تو تحقیق کرنے والے پر لازم ہے کہ کسی حدیث کے متعلق ثقہ محدث کے ایسے قول کو قبول کرے جس کے متعلق وہ کہتا ہے کہ یہ حدیث صحیح یا متواتر ہے گو اس کا حکم تواتر خبر کی نسبت سے تواتر کا یقین نہیں دے سکتا ہو کیونکہ تواتر کے متعلق اس کا قول آحاد ہے لیکن اس کا مان لینا ضروری ہے جیسا کہ پیچھے بیان ہوا ہے خاص طور سے اس کا قبول کرنا تقلید نہیں بلکہ تصدیق کے باب سے ہے اور دونوں باتوں میں زبردست فرق ہے جیسا کہ اہل علم وتحقیق کی کتابوں میں اس موضوع سے متعلق تفصیلات موجود ہیں اور اسی بنیاد پر ہم آئندہ بات کہہ رہے ہیں۔

نویں وجہ حدیث سے متعلق ایک محدث کے قول کی قبولیت کہ یہ متواتر ہے جب واجب ٹھہری جو عقیدے میں اس سے استدلال کو مستلزم ہے تو اس طرح ہر ثقہ محدث کی حدیث کو لینا بھی واجب ہے اور اس سے عقیدے کا اثبات بھی لازم ہے۔ اور دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے یہ علت بیان کرنا کہ اس بات کا احتمال ہے کہ فی الواقع وہم، یا بھول یا کذب کا صدور اس سے ہوا ہو گو بظاہر وہ ثقہ اور عادل ہو تو یہی بات اس ماہر شخص کے بارے میں بھی کہی جائے گی جس نے حدیث کے تواتر کی بات کہی ہے اس میں بھی دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے یا تو دونوں نے جو خبر دی ہے ان کے متعلق دونوں کی تصدیق کی جائے یا پھر دونوں کی تصدیق نہ کی جائے۔ اور دوسری شق باطل ہے لہذا پہلی بات ثابت ہو گئی اور یہی ہمارا مقصود ہے۔

یہ بات اس بنیاد پر کہی جا رہی ہے کہ مذکورہ احتمال احادیث رسول صلے اللہ علیہ وسلم میں جنھیں امت نے قبول کیا ہے موجود نہیں ہے اس لئے کہ یہ حدیثیں بھی اپنے قائل صلے اللہ علیہ وسلم کی طرح معصوم ہیں جیسا کہ ساتویں وجہ میں اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے [1]

دسویں وجہ تصدیق کسی بات کی ابتدا ہی میں ہوتی ہے خواہ وہ امر اختیاری ہی کیوں نہ ہو اسی سبب سے کسی انسان کے متعلق کہا جاتا ہے: تصدیق کرو یا نہ تصدیق کرو لیکن تصدیق کرنے والا جب کسی راوی پر بھروسہ کرتا ہے تو اپنے نفس کو اس کی تصدیق پر اس طرح مرکوز کر دیتا ہے کہ اس کی تکذیب کرنا یا اسکی خبر میں شک کرنا اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا یہ بات ہم میں سے ہر شخص اپنے ایسے دوست کے متعلق محسوس کرتا ہے جس پر کہ پورا اعتماد ہو۔ ایسی صورت میں با اعتماد راوی کی تصدیق کرنے والے کو اس بات کا پابند کرنا کہ عقیدہ کو چھوڑ کر صرف احکام کے متعلق اسکی

---

[1] اس سے متعلق تفصیلات احکام الاحکام لابن حزم ۱ / ۱۲۸ - ۱۳۳ میں موجود ہیں۔

تصدیق واجب ہے تکلیف مالایطاق کے مشابہ ہے۔ اسی سبب سے میں یقینی طور پر کہوں گا کہ جو لوگ دونوں باتوں میں فرق کرتے ہیں وہ ایک نظریاتی تفریق کرتے ہیں ورنہ پھر وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ تصدیق نہیں پاتے حتیٰ کہ احکام اور اس کے مثل احادیث کے متعلق بھی اس کا سبب راویوں کے احوال اور ان کی عدالت اور ضبط وحفظ سے ان کی ناواقفیت ہے۔ جس کے سبب مطلقا انھیں وہ اطمینان حاصل نہیں ہوتا جو ان کو تصدیق پر ابھارے یہی سبب ہے جو ان میں سے بہت سے لوگوں کو شک پر ابھارتا ہے بلکہ احکام سے متعلق بہت سی صحیح احادیث کے انکار پر بھی، عقیدہ اور امور غیب اس پر مستزاد ہیں۔

اس حقیقت کی طرف شریک بن عبداللہ القاضی نے اس وقت اشارہ کیا جب ان سے کہا گیا (لوگوں نے ان سے صفات سے متعلق کچھ احادیث کا ذکر کیا تھا) کہ ایک گروہ ان احادیث کا انکار کرتا ہے انھوں نے کہا وہ کیا کہتے ہیں؟ کہا ان میں وہ طعن کرتے ہیں انھوں نے کہا جن لوگوں نے ان احادیث کو نقل کیا ہے انھیں لوگوں نے قرآن کو بھی نقل کیا ہے اور یہ بات کہ نماز پانچ وقت کی ہے نیز حج بیت اللہ اور رمضان کے روزہ کی تفصیلات سب انھیں سے منقول ہیں ہم اللہ کو انھیں احادیث کے ذریعہ پہچان سکتے ہیں[1]

امام اسحاق بن راہویہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں میں عبداللہ بن طاہر کے پاس گیا انھوں نے مجھ سے کہا: ابویعقوب تم کہتے ہو اللہ تعالیٰ ہر رات کو اترتا ہے؟ میں نے کہا اے امیر اللہ نے ہماری طرف ایک نبی بھیجا ہے اس کی احادیث ہمارے پاس پہونچی ہیں انھیں سے ہم خون کو حلال اور حرام کرتے ہیں انھیں کے ذریعہ ہم شرمگاہوں کو حلال یا حرام کرتے ہیں انھیں سے ہم مالوں کو جائز یا حرام ٹھہراتے ہیں لہٰذا اگر یہ صحیح ہے

---

[1] کتاب السنۃ لعبداللہ بن الامام احمد۔ (۲) الشریعۃ للآجری ۳۰۶ (۳) العلم الشامخ للمقبلی ر ۲

تو وہ بھی صحیح ہے اور اگر یہ باطل ہے تو وہ بھی باطل ہے انھوں نے کہا کہ اس کے بعد عبداللہ خاموش ہو گیا[1]

گیارہویں وجہ عقیدہ اور عملی احکام کے درمیان تفریق اور عقیدہ کو چھوڑ کر احکام میں حدیث آحاد سے استدلال کا وجوب اس اساس پر مبنی ہے کہ عقیدے کو عمل شامل نہیں ہے اور عملی احکام کو عقیدہ شامل نہیں ہے اور یہ دونوں باتیں باطل ہیں ایک محقق نے کہا ہے : ۔ عملی مسائل میں دو باتیں مطلوب ہیں : علم اور عمل اسی طرح علمیات میں بھی علم اور عمل مطلوب ہیں یعنی دل کی محبت اور اس کا بغض ۔ دل کی محبت اس حق کے لئے جس پر ان کی دلالت ہے اور جسے وہ شامل ہیں اور اس کا بغض اس باطل سے جس کے وہ مخالف ہیں اسلئے عمل اعضاء و جوارح کے عمل پر منحصر نہیں ہے بلکہ دلوں کے اعمال اعضاء کے اعمال کی اصل ہیں اور اعضاء کے اعمال انکے تابع ہیں ، اس لئے کہ دل کا ایمان اور اس کی تصدیق و محبت ہر علمی مسئلے کی تابع ہے اور یہی عمل ہے بلکہ عمل کی اصل ہے یہ ایمان کے ان مسائل میں سے ہے جس سے بہت سے متکلمین نے غفلت برتی ہے کیونکہ انھوں نے گمان کیا کہ ایمان مجرد تصدیق کا نام ہے نہ کہ اعمال کا اور یہ قبیح اور عظیم ترین غلطی ہے ، بہت سے کفار نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا یقین رکھتے تھے اس میں انھیں کوئی شک نہ تھا ، لیکن اس میں وہ تصدیق شامل نہ تھی جو عبارت ہے آپ کی لائی ہوئی چیز سے قلبی محبت ، اس پر رضا مندی اور اس کی بنیاد پر دوستی و دشمنی سے اس سے غفلت نہیں برتی جاسکتی یہ بہت اہم موضوع ہے اسی سے ایمان کی حقیقت پہچانی جاسکتی ہے ، پس یہ تمام علمی مسائل

---

[1] اسے بیہقی نے الاسماء والصفات ص ۲۵۲ میں نقل کیا ہے اور یہ دونوں آثار حافظ ذہبی کی مختصر العلم میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں اللہ تعالی اس کے طبع کی راہ پیدا کرے ۔ (اب الحمد للہ یہ کتاب طبع ہو گئی ہے)

عملی ہیں اور عملی مسائل علمی ہیں، کیونکہ شارع نے عملیات میں مکلف افراد کو صرف عمل کا پابند کر کے علم کو چھوڑ نہیں دیا ہے اور نہ ہی علمیات میں علم کو اپنا کر عمل کو ترک کیا ہے[1]

ایک مثال سے یہ بات وضاحت سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ عملیات میں یا احکام میں عقیدے کا شامل کرنا ضروری ہے فرض کیا جائے کہ ایک شخص غسل یا وضو نظافت اور صفائی کے لئے کرتا ہے یا نماز ریاضت کے لئے پڑھتا ہے یا روزہ صحت کے لئے رکھتا ہے یا حج سیاحت کے لئے کرتا ہے یہ سب کچھ یہ اعتقاد رکھتے ہوئے نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر واجب قرار دیا ہے اور اس کے ذریعہ اسے اپنا عبادت گذار بنایا ہے تو اسے یہ سب کچھ کرنا کچھ فائدہ نہ دے گا جس طرح دل کی معرفت جب کہ وہ دل کے اس عمل کو شامل نہ ہو جسے تصدیق کہتے ہیں اسے کوئی فائدہ نہیں دے سکتی جیساکہ پیچھے گذر چکا ہے۔

لازمی طور پر ہر شرعی عملی حکم کے ساتھ ایسا عقیدہ موجود ہے جس کا تعلق ایسے غیبی معاملے سے ہوتا ہے جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت میں ہمیں اس کی خبر نہ دی ہوتی تو اس کی تصدیق اور اس پر عمل واجب نہ ہوتا اسی سبب سے کسی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ کسی چیز کو حلال یا حرام کرے جب تک کتاب وسنت کی حجت اس کے پاس نہ ہو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلال وھذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب ، ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون ○ (النحل ۱۱۶)

اور اپنی زبانوں کے جھوٹے بیان سے نہ کہا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام کہ تم اللہ پر

---

[1] الصواعق ۲ر۴۲۰ - ۴۲۱

جھوٹ کی بہتان باندھنے لگو جو لوگ اللہ پر افتراء کرتے ہیں ہرگز بامراد نہ ہوں گے۔

اس آیت کریمہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ بغیر اس کی اجازت کے تحریم و تحلیل اللہ کے اوپر جھوٹ اور افتراء ہے پس جب ہم حدیث آحاد سے تحریم و تحلیل کے جواز پر متفق ہوں گے اور اسی طرح ہم اللہ کے اوپر باتیں بنانے سے نجات پا سکتے ہیں تو اسی طرح حدیث آحاد سے عقیدے کا واجب کرنا بھی جائز ہو گا۔ دونوں باتوں میں کوئی فرق نہیں ہے جو شخص فرق کا دعوی کرے اس پر کتاب و سنت سے دلیل واجب ہے جو انتہائی مشکل بات ہے۔

بارہویں وجہ اگر اس باطل عقیدے کے قائلین سے کہا جائے کہ عکس کی صورت ہی درست ہے تو اس کی تردید نہیں کر سکیں گے کیونکہ یہ کہنا ممکن ہے کہ جب عقیدہ اور عمل ایک دوسرے کو شامل ہیں تو عقیدے کو عمل شامل ہوا اور عمل کو عقیدہ شامل ہوا جیسا کہ پیچھے اس کا بیان گذر چکا ہے لیکن دونوں میں ایک واضح فرق ہے اس لئے کہ عقیدہ مومن کی ذات سے متعلق ہے اس کا معاشرے سے کوئی تعلق نہیں ہے بخلاف عمل کے کہ اس کا مضبوط ربط اس معاشرے سے ہے جس میں مومن زندگی گذارتا ہے اسی میں اصلاً حرام شرمگاہوں کو حلال کیا جاتا ہے اور جانوں اور مالوں کو مباح کیا جاتا ہے لہٰذا اس ناحیے سے عملی امور اعتقادی امور سے زیادہ بڑھ کر ہیں۔ اسکے لئے ہم ایک توضیحی مثال بیان کرتے ہیں ایک شخص حدیث آحاد کے مطابق قبر میں فرشتوں کے سوال یا قبر کے بھینچنے کے حق ہونے کا اعتقاد کرتا ہے اور اسی پر مر جاتا ہے اور دوسرا شخص اعتقاد رکھتا ہے کہ زیادہ نشہ آور نبیذ سے تھوڑا سا پی لینا مباح ہے یا حلالہ کو وہ حلال سمجھتا ہے۔ جیسے دمشقی (تجیشہ) کہتے ہیں بعض مذاہب طبعی طور پر کسی دلیل کے سبب اس کی اباحت کے قائل ہیں لیکن وہ دلیل قطعی طور پر ظنی ہے پھر اسی پر مر جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک سنت صحیحہ کی شہادت کے مطابق غلطی پر تھا سوال یہ ہے

کہ ان دونوں میں سے معاشرے کے لئے کون زیادہ خطرناک تھا؟ کیا وہ شخص جو اعتقاد کے متعلق دھوکے میں تھا یا دوسرا جو حرام شراب اور شرمگاہوں کے مباح سمجھنے میں دھوکے میں تھا۔

اسی بنا پر اگر کوئی کہنے والا کہے کہ حرام اور حلال خبر آحاد سے ثابت نہیں ہوتے بلکہ ان کے لئے کوئی قطعی الدلالت آیت کا ہونا ضروری ہے یا ایسی حدیث متواتر کا ہونا ضروری ہے جو قطعی الدلالت ہو تو متکلمین اور ان کے پیرو اس کا جواب نہیں دے سکیں گے۔

ہم اگر جائز قرار دیتے کہ اس طرح کی باتوں میں عقل کو حکم بنائیں اور اللہ نے جن باتوں کی اجازت نہیں دی ہے عقل کے ذریعہ ان کو مشروع مانیں جیسا کہ یہ باطل قول کہہ کر متکلمین نے کیا ہے تو ہم بالکل اس کے خلاف کہتے اس لئے کہ یہ ان کے قول کی بہ نسبت عقل سلیم سے زیادہ قریب ہے۔ لیکن اس طرح کے قول یا اسکی نقیض کے کہنے سے ہم اللہ کی پناہ طلب کرتے ہیں اس لئے کہ دونوں باتیں شریعت میں داخل ہیں لہٰذا اللہ تبارک وتعالیٰ نے جن چیزوں میں برابری کی ہے ان میں ہم فرق نہیں کرتے اور جن میں فرق کیا ہے ان میں ہم برابری نہیں کرتے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ لے کر آئے اور اس کے متعلق خبر صحیح ثابت ہوئی طریق آحاد سے یا تواتر سے اعتقاد کے باب سے ہو یا عمل کے ہم ان تمام باتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ ساری تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جس نے ہمیں اس کی ہدایت دی اگر اللہ ہدایت نہ دیتا تو ہم ہدایت یاب نہ ہوتے۔

تیرہویں وجہ عقیدہ اور اس کے اثبات سے متعلق ان کا تردیدی قول عملی احکام میں بھی حدیث آحاد پر عمل کو بیکار کرنے کو مستلزم ہے اور یہ باطل ہے جس کے وہ بھی قائل نہیں اور جس سے باطل لازم آئے وہ بھی باطل ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ بہت سی عملی احادیث اعتقادی امور کو بھی شامل ہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہم سے فرماتے ہیں :۔ جب تم میں سے کوئی تشہد اخیر میں بیٹھے تو چار باتوں سے اللہ سے پناہ چاہے وہ کہے :۔ اے اللہ میں پناہ چاہتا ہوں قبر کے عذاب سے۔ اور جہنم کے عذاب سے اور مرنے اور جینے کے فتنے سے اور مسیح دجال کے فتنے سے (اسے شیخین نے روایت کیا ہے)

اس طرح بہت سی حدیثیں ہیں جن کا یہاں استقصار مقصود نہیں ہے [1]

اب اس نظریئے کے قائل اگر اپنے نظریئے پر عمل کریں گے اور اس حدیث پر عمل ترک کر دیں گے تو اپنے اصولوں میں سے ایک اصل کو وہ توڑ دیں گے یعنی احکام میں حدیث آحاد پر عمل کا وجوب اور ان کے لئے یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ یہ اصول ٹوٹ گیا اس لئے کہ بیشتر شریعت احادیث آحاد ہی پر قائم ہے اور اگر اصول مذکور سے قطع نظر اس حدیث پر عمل کرتے ہیں تو یہ عمل ان کے اس قول کو باطل کر دے گا۔ پھر اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم اس حدیث پر عمل

---

[1] انھیں میں سے عمار بن یاسر کی حدیث ہے کہ آپؐ یہ دعا کرتے تھے۔ اللھم بعلمک الغیب و قدرتک علی الخلق احینی ما کانت الحیاۃ خیرا لی و توفنی اذا کانت الوفاۃ خیرا لی اللھم انی اسألک خشیتک فی الغیب والشھادۃ واسالک برد العیش بعد الموت واسالک لذۃ النظر الی وجھک الکریم والشوق الی لقائک و فی غیر ضراء مضرۃ ولا فتنۃ مضلۃ، اسے نسائی نے جید سند سے نقل کیا ہے۔ اللہ کے چہرے کی طرف دیکھنے کی لذت کا سوال اور اس کی ملاقات کا شوق اس کے وقوع کا تصور اس شخص کے بارے میں ہو سکتا ہے جو جنت میں اللہ کی رویت کا ایمان رکھتا ہو، کیونکہ مذکورہ دعا کی صورت میں یہ لازم آئے گا کہ اس نے اپنے پروردگار سے ایسی چیز مانگی جس پر خود اس کا ایمان نہیں ہے اور اگر اس سے اعراض کیا تو ایسے حکم پر عمل کرنے سے اعراض کیا جو نبی سے حدیث آحاد سے ثابت ہے یعنی ان الفاظ کے ساتھ ... بھی کرے شریعت سے جو بات ثابت ہے اسکا وہ مخالف قرار پائیگا لہذا ان لوگوں کو کہنا چاہیئے کہ انلوگوں میں سے نہ ہو جائیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (کلا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون) ہرگز نہیں یہ لوگ اپنے رب سے اوٹ میں ہوں گے

کریں گے۔ لیکن اس میں عذاب قبر اور مسیح دجال کا جو اثبات ہے اس کا اعتقاد نہیں کریں گے تو ہم کہیں گے کہ اس حدیث پر عمل اعتقاد کو مستلزم ہے جیسا کہ دسویں وجہ میں اس کا بیان گذر چکا ہے، ورنہ یہ عمل نہ مشروع ہوگا اور نہ عبادت ہوگا، لہذا نتیجے کے طور پر انھوں نے اپنے اصول مذکور پر عمل نہیں کیا اس کے بطلان کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اس سے اس کے وجوب پر قائم صحیح دلائل کا بطلان لازم آتا ہے جس پر تمام مسلمان کا اتفاق ہے۔

چودہویں وجہ اس خیال پر اصولیوں کے اتفاق کا دعویٰ باطل ہے اور یہ جرأت بے جا ہے کتب اصول وغیرہ میں اختلاف معروف چیز ہے۔ کچھ معاصر اہل قلم نے اس باب میں بعض ان معاصرین کی تقلید کی ہے جو اپنی نقل کی ہوئی بات کی تحقیق نہیں کرتے ورنہ اتفاق مذکور کا دعویٰ کیسے صحیح ثابت ہوگا اس بات پر کہ خبر واحد علم کا فائدہ دیتی ہے۔ امام مالک، شافعی، اصحاب ابو حنیفہ اور داؤد بن علی کے اصحاب جیسے ابن حزم[۱] وغیرہ نے اثبات کا خیال ظاہر کیا ہے اس پر حسین بن علی کرابیسی، حارث بن اسد محاسبی نے بھی اثباتی خیال ظاہر کیا ہے۔ ابن خویز منداد نے اپنی کتاب اصول الفقہ میں لکھا ہے (انھوں نے خبر واحد کا ذکر کیا ہے جسے ایک یا دو راویوں نے روایت کیا ہو) کہ اس قسم سے بھی علم یقینی حاصل ہوتا ہے، مالک نے اس کی تائید کی ہے اور احمد نے رویت والی حدیث کے متعلق کہا ہے:- ہم جانتے ہیں کہ یہ حق ہے اور اس کے علم پر ہمیں یقین حاصل ہے۔ قاضی ابو یعلی نے کتاب المخبر کی ابتدا میں کہا ہے[۲] خبر واحد جبکہ اس کی سند صحیح ہو علم کو واجب کرتی ہے نیز یہ کہ اس میں روایت مختلف نہ ہو اور امت نے اسے قبول کیا ہو، لیکن ہمارے

---

[۱] اس کے لئے انھوں نے اتنے زیادہ قوی دلائل پیش کئے ہیں جو اصول کی دیگر کتابوں میں آپ نہیں پا سکتے دیکھئے احکام الاحکام ۱/۱۱۹، ۱۳۸ [۲] اصل اسی طرح ہے شاید وہ کتاب (المجرد) ہے جو امام احمد کے مذہب پر فقہ کی کتاب ہے (الاعلام)

اصحاب کا قول اس کے بارے میں مطلق ہے کہ وہ علم کو واجب کرتی ہے خواہ اسے امت نے قبول نہ کیا ہو انھوں نے کہا :- اور مذہب وہی ہے جو میں نے بیان کیا ہے نہ کہ اس کے علاوہ ۔ شیخ ابو اسحاق شیرازی نے [1] اپنی اصولی کتابوں میں جیسے تبصرہ اور شرح اللمع وغیرہ میں کہا ہے اور یہ شرح کے الفاظ ہیں کہ :-

خبر واحد کو جب امت نے قبول کیا تو اس سے علم اور عمل واجب ہو جاتا ہے خواہ اس پر سب نے عمل کیا ہو یا بعض نے ۔ اس باب میں انھوں نے اصحاب شافعی کے کسی نزاع کا ذکر نہیں کیا ہے ، یہی قول قاضی عبد الوہاب نے مالکیہ کے فقہا کے ایک گروہ سے نقل کیا ہے حنفیہ نے اپنی کتابوں میں تصریح کی ہے کہ خبر مستفیض علم کو واجب کرتی ہے اس کی مثال انھوں نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے بیان کی ہے کہ :- لا وصیۃ لوارث وارث کے لئے وصیت نہیں ہے انھوں نے کہا :- باوجودیکہ یہ روایت طریق آحاد سے منقول ہے انھوں نے کہا اسکے مثل عبد الرحمن بن عوف کی حدیث مجوس سے جزیہ لینے کے متعلق ہے انھوں نے کہا :-

اور ہم نے کہا ہے کہ اس طرح کی خبریں علم کا فائدہ دیتی ہیں اور خبر دینے والے کی صحت کے علم کو واجب کرتی ہیں ۔ اس سے پہلے جب ہم نے سلف کو اسی طریق پر پایا کہ اس طرح کی خبر کو قبول کرنے پر انھوں نے اتفاق کیا ۔ اس میں انھوں نے کسی چھان بین اور اصول یا اس جیسی چیز سے اس کے مقابلے کی ضرورت نہیں سمجھی ۔ باوجودیکہ یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ اخبار کے قبول کرنے ان میں غور و فکر کرنے اور اصول پر انھیں پرکھنے کے متعلق ان کے مخصوص طریقے ہیں اس سے ہمیں ان کے طریقے کے متعلق یہ

---

[1] یہ ابراہیم بن علی بن یوسف فیروز آبادی (۳۹۳ ، ۴۷۶ھ) ہیں مناظر علامہ ہیں ، شافعیہ کے کبار علماء اصول میں سے ہیں یہ مدرسہ نظامیہ بغداد میں مدرس تھے ۔ ان کی کتابوں میں فقہ میں المہذب اور اصول میں التبصرہ ہیں آخری کتاب مخطوطہ ہے ۔

بات وضاحت سے معلوم ہوتی ہے کہ اس کے حکم کی طرف وہ اسی طور پر چلے جس طور پر ان کے نزدیک اس کی صحت اور درستی ثابت ہوئی اس سے ہمارے لئے اس کی صحت کا علم واجب ہوگیا یہ ابوبکر رازی [۱] کی کتاب اصول الفقہ کے الفاظ ہیں [۲]

پندرھویں وجہ بطور جدل مان لیجئے کہ مزعومہ اتفاق صحیح ہے لیکن یہ اصولیوں کے نزدیک علی الاطلاق نہیں ہے بلکہ یہ اس بات سے مقید ہے کہ جب وہاں اس کا کوئی شاہد موجود نہ ہو۔ ابوالطیب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے:۔ خبر آحاد کے ظن یا علم کا فائدہ دینے کے متعلق اختلاف[۳] اس بات سے مقید ہے کہ جب اس سے کوئی ایسی روایت نہ ملائی جائے جو اسے تقویت دے لیکن تقویت دینے والی روایت جب اس سے ملے یا وہ مشہور یا مستفیض ہو تو اختلاف مذکور کا یہاں دخل نہ ہوگا اور اس بات میں کوئی نزاع نہیں کہ جب خبر واحد کے مقتضاً عمل پر اجماع ہو تو وہ علم کا فائدہ دے گی کیونکہ اجماع نے اسے معلوم الصدق بنا دیا، اسی طرح خبر واحد کہ جب امت نے قبول کیا تو اس پر عمل اور اس کی تاویل کے درمیان کا راستہ اپنایا اور تاویل قبولیت کی فرع ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث [۴] کا تعلق اسی قسم سے ہے جن کی صحت میں کوئی طعن نہیں ہے اور ان کی تعداد زیادہ تر ہے۔

سولہویں وجہ اس بنیاد پر کہ اس اختلاف سے پہلے ان احادیث کی قبولیت اور رب تعالیٰ کی صفات اور علمی غیبی امور کے ان احادیث

---

[۱] یہ امام احمد بن علی رازی جصاص صاحب کتاب احکام القرآن متوفی ۳۷۰ھ ہیں۔

[۲] الصواعق ۲ / ۳۶۲، ۳۶۴

[۳] میں کہتا ہوں کہ مزعومہ اتفاق کہاں ہے۔

[۴] حصول المامول من علم الاصول ص ۵۶

سے اثبات پر متیقن اور معلوم اجماع واقع ہوچکا ہے ابن قیم رحمہ اللہ نے کہا ہے : جس شخص کو روایات کا کچھ تجربہ ہے وہ اس امر میں شک نہیں کرے گا کہ وہ صحابہ ہی ہیں جنھوں نے ان احادیث کو روایت کیا ہے اور بعض نے بعض سے قبول کیا ہے اور کسی نے بھی روایت کرنے والے سے ان کا انکار نہیں کیا پھر ان صحابہ سے اول اور آخر کے تمام تابعین نے لیا اور جس نے بھی ان سے ان روایتوں کو سنا انھیں قبول کیا اور ان کی تصدیق کی اور جس نے ان سے نہیں سنا تو اسی طرح انھیں تابعین سے لیا اور تبع تابعین نے تابعین سے لیا یہ ایسی بات ہے جسے اہل الحدیث عام طور پر جانتے ہیں جس طرح وہ صحابہ کے عدل اور ان کے صدق و امانت کو جانتے ہیں اور جیسے ان کا نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے وضو، غسل جنابت، نماز کی تعداد اور اوقات، اذان، تشہد جمعہ اور عیدین وغیرہ کا روایت کرنا، جن لوگوں نے ان چیزوں کی روایت کی ہے انھیں لوگوں نے احادیث صفات کو بھی نقل کیا ہے اگر ان کے نقل میں ان سے متعلق خطا و کذب کا جواز ہوتا تو ان روایات کے علاوہ مذکورہ دوسری روایتوں میں بھی یہ بات جائز ہوتی ایسی صورت میں قطعی طور پر نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے منقول روایات میں سے کسی پر ہمارے لئے وثوق نہیں رہ جاتا اور یہ دین، علم اور عقل سے دوری کی بات ہے کیونکہ اسلام پر تنقید کرنے والے بہت سے لوگوں نے اسے عام قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ :- ہمیں ان میں سے کسی چیز پر مطلق بھروسہ نہیں ہے - ابن قیم نے کہا ان لوگوں کو سنت اور دین حق سے دوری نصیب ہوئی کہ انھوں نے کفر کو ظاہر کیا اور اسلام کا پٹہ اپنے گلے سے نکال دیا حدیث کے رد میں ان کے اس قول نے مختلف فرقے پیدا کر دئے [1]

پھر دس سے زیادہ گروہوں اور ان کی انکار کردہ سنتوں کا ذکر کیا ہے وہ

---

[1] الصواعق ۲/ ۳۴۳، ۳۴۴ .

لوگ اس میں افراط اور تفریط کی راہوں میں ہیں اور کچھ احادیث احکام اور احادیث صفات میں فرق کرتے ہیں ابن قیم کی یہ بحث بہت نفیس ہے شائقین کو ان کی پوری بحث دیکھنی چاہیئے اگر مجھے طول کلام کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں پوری کی پوری بحث نقل کرتا۔

گذشتہ بحث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ خبر آحاد جسے امت نے قبول کیا علم کا فائدہ دیتی ہے اگر بات ایسے ہی ہے تو اس سے عقیدہ بھی ثابت ہوگا، متکلمین میں سے جن لوگوں نے اس کی مخالفت کی ہے ان پر کوئی اعتماد نہیں ہے اس لئے کہ ایسے لوگ کتاب وسنت کے دلائل اور صحابہ اور ان کے بعد کے ائمہ کے اجماع کے مخالف ہیں۔

سترہویں وجہ پھر یہ فرض کیجئے کہ احادیث آحاد علم ویقین کا فائدہ نہیں دیتیں لیکن ان کے اتفاق کے مطابق یہ ظن غالب کا فائدہ قطعی طور پر دیتی ہیں۔ ابن قیم رح کہتے ہیں :۔ ان سے اسماء وصفات کا اثبات ناجائز نہیں ہے جس طرح طلبی احکام کا اثبات ناجائز نہیں پھر آخر باب طلب اور باب خبر میں اس اعتبار سے کیا فرق ہے کہ دونوں میں سے ایک میں ان سے حجت پکڑی جائے اور دوسرے میں نہیں ؟ یہ تفریق اجماع امت سے باطل ہے، ہمیشہ ان احادیث سے خبریات میں ایسے ہی استدلال کیا جائے گا جس طرح احکامات اور عملیات میں کیا جاتا ہے خصوصاً عملی احکام اس خبر پر مشتمل ہیں کہ اللہ نے اس طرح مشروع فرمایا ہے یا اسے واجب قرار دیا ہے اور دین کے لئے اسے پسند کیا ہے اس طرح اس کی شریعت اور اس کا دین اس کے اسماء وصفات سے متعلق ہیں اور ہمیشہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین اور اہل حدیث وسنت صفات، تقدیر، اسماء اور احکام کے مسائل میں انھیں اخبار سے حجت پکڑتے تھے، قطعی طور پر ان میں سے کسی سے یہ بات منقول نہیں ہے کہ اس نے ان کے ذریعہ احکام کے مسائل میں استدلال کیا ہو اور اللہ کے اسماء وصفات میں نہ کیا ہو دونوں باتوں میں فرق کرنے والوں کے اسلاف کدھر ہیں ؟!

ہاں ان کے سلف کچھ متاخرین متکلمین ہیں جن کو اللہ اور اس کے رسول اور

صحابہ سے منقول چیزوں سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اس باب میں کتاب وسنت اور اقوال صحابہ سے ہدایت طلبی سے دلوں کو باز رکھتے ہیں اور متکلمین کی رایوں اور متکلفین کے قواعد کا حوالہ دیتے ہیں۔ انھیں سے یہ بات جاننے میں آتی ہے کہ دونوں باتوں میں فرق ہے اور اس تفریق پر انھوں نے اجماع کا دعویٰ بھی کیا ہے حالانکہ مسلمان ائمہ میں کسی امام سے یہ خود ساختہ اجماع منقول نہیں ہے اور نہ ہی کسی صحابی اور تابعی سے، یہی اہل کلام کی عادت ہے وہ ایسی باتوں کے لئے اجماع بیان کر دیتے ہیں جیسے مسلمان ائمہ میں سے کسی نے نہ کہا ہو بلکہ ائمہ اسلام تو اس کے خلاف ہیں، امام احمد نے کہا ہے :۔ جس نے اجماع کا دعویٰ کیا اس نے جھوٹ کہا، اصم[1] اور ابن علیہ[2] اور اس جیسے لوگ اپنے دعوی اجماع[3] سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت کو باطل کرنا چاہتے ہیں۔

---

[1] یہ ابوبکر عبدالرحمٰن بن کیسان معتزلی صاحب مقالات فی الاصول ہے یہ ابو الہذیل علاف کے طبقے سے ہے بلکہ اس سے قدیم تر یہ ابراہیم بن علیہ کے شیوخ میں سے ہے جو امام احمد کے کلام میں اس کے ساتھ شامل ہے اس کی بہت سی رائیں ہیں جن میں سے اہل سنت بلکہ کبھی کبھی معتزلہ نے بھی اختلاف کیا ہے جیسے اس نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وجوب کا انکار کیا ہے اس سلسلے میں معلومات کے لئے مقالات الاسلامیین لابی الحسن الاشعری کے درج ذیل صفحات کا مطالعہ کیجئے۔ ۲۲۳، ۲۴۴، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۸، ۳۲۸، ۳۳۱، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۴۴، ۳۴۴، ۴۵۱، ۴۵۶، ۴۶۰، ۴۶۷، ۵۶۴، ۵۸۸۔

[2] یہ ابراہیم بن اسماعیل بن مقسم الاسدی ابو اسحاق مصری ہے، ذہبی نے میزان میں لکھا ہے گمراہ جہمی ہے مناظرہ کرتا تھا اور خلق قرآن کا قائل تھا ۲۱۸ھ میں وفات پایا اس کے والد اسماعیل ثقہ اور حافظ تھے۔ شیخین کے رجال میں سے تھے ۱۹۳ھ

[3] الصواعق ۲ / ۴۱۲، ۴۱۳۔

اٹھارویں وجہ دلیل کا ظنی یا قطعی امور سے ہونا ایک اضافی امر ہے جو حاصل کرنے والے اور استدلال کرنے والے کے بدلنے سے بدل جاتا ہے یہ کوئی حقیقی صفت نہیں ہے ابن قیم نے لکھا ہے :۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس کے متعلق کوئی ذی عقل نزاع نہیں کر سکتا۔ زید کے نزدیک کبھی وہ دلیل قطعی ہوتی ہے جو عمرو کے نزدیک ظنی ہے لہذا ان کا یہ کہنا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیثیں جوامت میں رائج ہیں علم کا فائدہ نہیں دیتیں بلکہ یہ ظنی ہیں اس سے وہ اپنی حالت کی خبر دے رہے ہیں کیونکہ اہل سنت نے جن طریقوں سے جو علم حاصل کیا ہے وہ انھیں حاصل نہیں ہوا لہذا ان کا یہ کہنا کہ ان سے علم کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا ان سے حکم عام لازم نہیں آتا یہ اس استدلال کے مشابہ ہے کہ : کسی چیز کو پانے والا اور اس کا جاننے والا اس کا پانے والا اور جاننے والا نہیں ہے وہ ایسے شخص کی طرح ہے جو تکلیف یا لذت یا محبت یا بغض اپنے اندر محسوس کرتا ہے، لیکن کوئی ایسا شخص اس کے سامنے آتا ہے جو اس بات کی دلیل پیش کرتا ہے کہ اسے درد، یا تکلیف یا محبت یا بغض نہیں ہے ، اور دیگر بہت سے شبہات کا بیان کیا جاتا ہے جن کا حاصل یہ ہے کہ جو چیز تمھیں حاصل ہے وہ مجھے حاصل نہیں اور اگر حق ہوتی تو ہم اور تم اس میں مشترک ہوتے اور یہ عین باطل ہے۔ کتنی اچھی بات کہی گئی ہے۔

اقول للائم المهدی ملامته ذق الهوی فان اسطعت الملام لم

ملامت کا ہدیہ بھیجنے والے سے میں کہتا ہوں کہ محبت کا مزہ چکھ لے۔ پھر ملامت کی طاقت ہو تو ملامت کر۔

ایسے لوگوں سے کہا جائے گا کہ اپنی توجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی باتوں کی طرف پھیر دو اس کے خواہش مند ہو اس کا تتبع کرو اور اسے جمع کرو اسے نقل کرنے والوں کے اصول اور ان کی سیرت سے آگاہی حاصل کرو اور اس کے سوا ہر بات سے اعراض کر لو اسے اپنی طلب کی منزل اور اپنے ارادے کی آخری حد بنا لو بلکہ

اس کے لئے ایسے ہی حریص بن جاؤ جیسے ارباب مذاہب کے پیرو اپنے ائمہ کے مذاہب کی معرفت کے حریص ہوتے ہیں کہ انھیں اتنا ضروری علم حاصل ہوجاتا ہے کہ یہ ان کے مذاہب کے خیالات واقوال ہیں اور اگر کوئی انکار کرنے والا ان کا انکار کرے تو اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس وقت تم کو معلوم ہو جائے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث علم کا فائدہ دیتی ہیں یا نہیں حدیثوں اور ان کے طلب سے تمھارا اعراض تمھیں علم کا فائدہ نہیں دے سکتا اور اگر تم یہ کہو کہ یہ تمھیں بطور ظن کے کوئی فائدہ نہیں دے سکتیں تو اس سے گویا تم اس بات کا اظہار کر رہے ہو کہ حدیثوں کے متعلق تم کتنے پانی میں ہو[1]

ابن قیم نے دوسرے مقام پر لکھا ہے :- جب حدیثوں سے اعراض ان کی روایت سے نفرت اور ان کے خلاف کہنے والوں سے حسن ظن اس کیلئے طے ہوچکا ہے یا شیطانی خیالی تعارض اس کے دل میں جاگزیں ہے تو ایسی صورت میں معاملہ اس آیت کے مطابق ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قل ھو للذین امنوا ھدی وشفاء .... مکان بعید[2] کہدو وہ ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت اور شفاء ہے۔ اگر اس کا عشر عشیر بھی ہو تو انھیں علم اور ایمان حاصل نہیں ہو سکتا اور دل میں تواتر کے ذریعہ علم کا حصول آسودگی اور سیرابی کی طرح ہے اور ہر خبر علم کے کسی حصے کا فائدہ ضرور دیتی ہے پھر جب کئی خبریں ہو جائیں اور باہم قوی ہوجائیں تو علم کا فائدہ دیتی ہیں یا تو کثرت کے سبب سے یا قوت کے سبب یا دونوں

---

[1] الصواعق ۲ / ۳۲۲، ۳۲۴

[2] پوری آیت اس طرح ہے۔ ولو جعلنا ہ قرآنا اعجمیا لقالوا: لولا فصلت آیاتہ ءاعجمی وعربی؟ قل ھو للذین امنوا ھدی وشفاء والذین لا یومنون فی اذانھم وقر وھو علیھم عمی اولئک ینادون من مکان بعید (فصلت ۴۴)

کے مجموعے سے پس جب سامع کے دل میں ان خبروں سے متعلق ان کے طرق کا علم ان کے رواۃ کے حالات کی معرفت ان کے معانی کا فہم جمع ہو گیا تو اسے ایسا ضروری علم حاصل ہو گیا جسے دور کرنا ممکن نہیں ہے اسی وجہ سے تمام ائمہ حدیث جن کے بارے میں تمام امت کلمۂ خیر کہتی ہے ان احادیث کے مضمون کے متعلق یقین رکھتے ہیں اور ان کے ذریعہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر گواہی دیتے ہیں اس علم کے باوجود کہ جن کو ان کی سیرت اور ان کے حالات کی خبر ہے کہ وہ صدق اور امانت و دیانت میں سب لوگوں سے بڑھ کر ہیں تمام لوگوں سے زیادہ صاحب فہم ہیں اور سب سے زیادہ صدق کے ماننے والے اور اس کا تحفظ کرنے والے ہیں اور کذب سے پرہیز کرنے والے ہیں اور اس معاملے میں وہ اپنے باپ بیٹے، استاد اور دوست کے لئے کوئی رواداری نہیں برتتے انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی روایات کو اس طرح قلم بند کیا کہ ان کے سوا کوئی اس مقام تک نہیں پہونچ سکا نہ انبیاء سے نقل کرنے والے اور نہ غیر انبیاء سے انھوں نے اپنے اساتذہ کو اسی حال پر بلکہ اس سے بھی بڑھ کر پایا اور انھوں نے اپنے سے اوپر والوں کو اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر پایا یہاں تک کہ معاملہ ان لوگوں تک پہونچ جاتا ہے جن کی اللہ نے بے مثال تعریف کی ہے ان سے اپنی رضامندی کی خبر دی اور یہ کہ اس نے انھیں منتخب کیا ہے اور قیامت کے دن دیگر امتوں پر انھیں گواہ بنائے گا جو شخص اس میں غور و فکر کرے گا اسے اس بات سے علم یقینی کا فائدہ حاصل ہوگا جسے وہ لوگ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں جو ہر اس علم سے بڑھ کر ہے جسے ہر گروہ اپنے پیشوا سے نقل کرتا ہے یہ ان کے نزدیک ایک وجدانی امر ہے بلکہ لذت والم، محبت و بغض کے احساس کے منزلے میں ہے یہاں تک کہ وہ اس کی گواہی دیتے ہیں، قسم کھاتے ہیں، اور اس کی مخالفت کرنے والے سے مباہلہ کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اخبار و سنن میں جرح کرنے والوں کے قول کے

مطابق یہ بات جائز قرار پاتی ہے کہ ان اخبار کے راوی کاذب اور غلطی کرنے والے ہوں آپ کے دشمنوں کے اس قول کے مشابہ کہ : یہ بات ہو سکتی ہے کہ یہ باتیں لے کر جو اس کے پاس آیا ہے وہ جھوٹا شیطان ہو جبکہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اہل الحدیث تمام گروہوں میں سب سے صادق تر ہیں جیسا کہ عبد اللہ بن مبارک نے کہا ہے :۔ میں نے دین اہل الحدیث کے لئے پایا اور کلام معتزلہ کے لئے اور کذب رافضہ کے لئے اور اور حیلے اہل رائے کے لئے ۔ اہل الحدیث کو جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیثیں فرمائی ہیں اور انھیں مختلف جگہوں اور مختلف اوقات میں بیان فرمایا ہے اس سے انھیں ضروری یقینی علم حاصل ہو گیا اس کے بعد سنت و حدیث سے کوئی لگاؤ نہ رکھنے والے کا یہ قول کہ : اخبار آحاد علم کا فائدہ نہیں دیتیں ان کے نزدیک مقبول نہیں اس لئے کہ یہ علم یقینی کے حصول کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان کے مخالف یا تو اپنے لئے علم کے حصول کا انکار کرتے ہیں یا اہل الحدیث کے لئے اگر اپنے لئے کرتے ہیں تو یہ بات دوسرے کے حصول میں حارج نہیں ہو سکتی اور اگر اہل الحدیث کے لئے انکار کرتے ہیں تو ان کے اپنے نفس کے علم سے مکابرہ کرتے ہیں ، جیسے کہ ایک شخص اپنے نفس میں فرحت یا الم اور خوف و محبت کے احساس سے اپنے غیر سے مکابرہ کرے اور مناظرہ جب اس حد تک پہونچ جائے تو اس میں کوئی فائدہ باقی نہیں رہ جاتا ایسی صورت میں اللہ اور رسول کے حکم مباہلہ کی طرف لوٹنا مناسب تر ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : فمن حاجك فيه من بعد ما جاءك من العلم فقل : تعالوا ندع ابناءنا وابناءكم ونساءنا ونساءكم ، وانفسنا وانفسكم ، ثم نبتهل فنجعل لعنة الله على الكاذبين (آل عمران ۶۱) [1]

---

[1] الصواعق ۲ / ۳۵۷ ، ۳۵۹

اس کے بعد کہ تجھ کو علم پہونچ چکا ہے جو تجھ سے جھگڑا کرے تو کہدے آؤ ہم اپنے بیٹوں کو اور تمھارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمھاری عورتوں کو بلائیں اور اپنی جان اور تمھاری جان کو پھر دعا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔

انیسویں وجہ

اس باطل نظریئے کے لوازم میں سے یہ بھی ہے کہ صرف قرآن میں جو عقیدہ مذکور ہے اسی کے ماننے پر اکتفا کیا جائے اور حدیث کو اس سے جدا کر دیا جائے۔ حدیث میں جتنے عقائد اور غیبی امور موجود ہیں انھیں کسی شمار میں نہ رکھا جائے جیسے کہ اہل قرآن کے نام سے معروف گروہ کا خیال ہے اس لئے کہ یہ لوگ حدیث کو مطلق محل استدلال میں نہیں رکھتے سوائے ان کے جو قرآن کے موافق ہوں اسی بنا پر ان کی نماز ہماری نماز کی طرح نہیں ہے [1] ان کی زکوٰۃ ہماری زکوٰۃ کی طرح نہیں ہے ان کی ہر عبادت ہماری عبادات سے مختلف ہے جس کے نتیجے میں ان کے عقائد ہمارے عقائد سے مختلف ہیں اس لئے قدرتی طور پر یہ غیر مسلمین کی طرح ہیں انھیں کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح حدیث میں اشارہ فرمایا ہے:

سنو! مجھے قرآن عطا کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اسی کے مثل ایک اور چیز سنو! قریب ہے کہ ایک آسودہ حال شخص کہے گا تم قرآن کو لازم پکڑ لو پس اس میں جو تم حلال پاؤ اسے حلال کرو اور جو حرام پاؤ اسے حرام کرو۔ سنو! تمھارے لئے گھریلو گدھا حلال نہیں اور نہ ہی درندوں میں دانت والے جانور اور نہ کسی معاہد کا لقطہ

---

[1] ان میں سے ایک شخص سے میں نے مطالبہ کیا کہ اپنی نماز دکھلاؤ تو اس نے ایسی نماز پڑھی جس پر قرآن کی بھی دلالت نہیں ہے کیونکہ وہ کچھ ایسی دعاؤں اور اذکار کا مجموعہ تھی جن کی کوئی اصل نہیں سنت تو اس سے بہت دور کی بات ہے۔

مگر یہ کہ اس کا مالک اس سے استغنا ظاہر کرے اور جو شخص کسی قوم کا مہمان ہو تو ان کا فرض ہے کہ اس سے حسن سلوک کریں پس اگر اچھی ضیافت نہ کریں تو اسے چاہیئے کہ اپنی مہمان نوازی سے محرومی کا عوض ان سے لے لے (ابوداؤد ۲ر ۵۰۵)

میں کہتا ہوں کہ جو لوگ یہ باطل قول ثابت کرتے ہیں وہ اپنی گمراہی کے ایک بڑے حصے میں ان گمراہوں کے شریک ہیں یعنی عقیدے سے متعلق امور میں صرف قرآن پر اکتفا کرنا یہ بات اگرچہ پہلی منزل میں بظاہر ان لوگوں کے مذکورہ قول کے مخالف ہے کیونکہ یہ لوگ حدیث متواتر سے عقیدہ کو ثابت کرتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ صرف لفظی اختلاف ہے نہ کہ معنوی۔ تحقیق یہ کہتی ہے کہ ان کی نسبت سے یہ بات نظری ہے نہ کہ عملی ورنہ جو لوگ اس بات کو ثابت کرتے ہیں حدیث متواتر کی بنیاد پر اپنے عقائد میں سے کسی ایک عقیدے کی خبر کریں میں شخصی طور پر نہیں سمجھتا کہ علماء کلام میں سے کوئی فرد حدیث متواتر سے کوئی عقیدہ ثابت کرتا ہو کیونکہ حدیث اور اس کے طرق کے متعلق یہ لوگ سب سے زیادہ نادان ہیں نیز حدیث سے شغل اور اس کے طلب سے سب سے زیادہ بچنے والے ہیں جس کے سبب اکثر احادیث کے متعلق یہ حکم لگا دیتے ہیں کہ یہ احادیث آحاد ہیں حالانکہ علم حدیث کے جاننے والوں کے نزدیک یہ متواتر ہیں۔

مجھے شدید افسوس اس بات پر ہوتا ہے جب میں کچھ اہل قلم کو دیکھتا ہوں کہ وہ خود اپنی بعض کتابوں میں اپنے ثابت کردہ اس اصول کو بھول جاتے ہیں کہ ہر علم میں ماہرین اشخاص کی طرف رجوع کرنا واجب ہے پھر ہم انھیں دیکھتے ہیں۔ کہ متواتر احادیث پر احادیث آحاد کا حکم لگا دیتے ہیں یہ بات گذشتہ اور معاصر علماء علم کلام کی تقلید میں ہوتی ہے وہ ان اہل الحدیث کی طرف رجوع نہیں کرتے جو حدیث کے طرق اور رجال کے جاننے والے ہیں مثال کے طور پر انھیں لوگوں میں سے ایک شخص ہر رات آسمان دنیا کی طرف اللہ کے نزول کی حدیث پر تعلیق لگاتے ہوئے کہتا ہے :- نزول اور اللہ کے آسمان میں ہونے کے بارے میں احادیث آحاد وارد ہیں اور

یہ علم کا فائدہ نہیں دیتیں جب کہ حدیث نزول اہل الحدیث کے نزدیک متواتر ہے علامہ ابن قیم نے تہذیب السنن (۷/ ۱۰۷) میں اس کی توضیح کی ہے کہتے ہیں :- اس حدیث کو بیس سے زیادہ صحابہ نے روایت کیا ہے ۔ بیہقی نے اپنی کتاب الاسماء والصفات صفہ ۲۵۱ میں ان میں سے دس سے زیادہ صحابیوں کا نام گنایا ہے انھوں نے خود اور شیخین اور آجری نے صفحہ ۳۰۷، ۳۰۹ میں ان میں سے کچھ کی احادیث روایت کی ہیں اور رارواء الغلیل فی تخریج احادیث منار السبیل ر رقم ۴۴۹) اور رتخریج کتاب السنۃ لابن ابی عاصم رقم ۴۹۲ - ۵۰۸ میں ۔ میں نے ان میں سے بعض کی تخریج کی ہے ۔

اللہ کے آسمان میں ہونے سے متعلق احادیث اگر متواتر نہیں ہیں تو مستفیض ضرور ہیں صرف بیہقی نے ۴۲۱ - ۴۲۴ میں ان میں سے پانچ کی روایت کی ہے اور ان پر آیت پاک ' أأمنتم من فی السماء کیا تم اس ذات سے بے خوف ہو جو آسمان میں ہے ، کی شہادت مستزاد ہے بشرطیکہ مصنوعی مجاز کے نام پر تاویل و تعطیل کا سہارا نہ لیا جائے ؎۱

ان میں سے کچھ حدیث رویت کے متعلق بھی حکم لگاتے ہیں کہ یہ حدیث آحاد ہے حالانکہ ماہرین حدیث اور ان کے علاوہ کے نزدیک یہ متواتر حدیث ہے اس کے تواتر کی توضیح ابو الحسن اشعری نے کی ہے ؎۲

اسی طرح نزول مسیح اور ظہور دجال کی حدیث پر عدم تواتر کا حکم لگاتے ہیں

؎۱ جو شخص یہ جاننا چاہے کہ مجاز کہنے کی لغت میں کوئی اصل نہیں ہے اور لغت کے ائمہ میں سے کسی نے اسے نہیں کہا ہے اسے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی اس تحریر کو پڑھنا چاہئے جو انھوں نے کتاب الایمان میں اس سے متعلق لکھی ہے نیز ابن قیم کی الصواعق کی طرف رجوع کرنا چاہیئے

؎۲ دیکھو المذاہب الاسلامیہ لابی زہرہ ص ۲۶۷

اور یہ ان عقائد کے متعلق بطور مثال کے ہے کہ بقول ان کے نوجوان جن پر ایمان کے مکلف نہیں ہیں حالانکہ حدیث نزول اہل الحدیث کے نزدیک متواتر ہے میں نے خود تنہا اس روایت کے بیس طرق بیس صحابیوں سے جمع کئے تھے جن میں سے ہر ایک عیسیٰ علیہ السلام کے آخری زمانے میں نزول کی تصریح کرتی ہے اور ان صحابہ میں سے بعض کی حدیث کے ایک سے زیادہ طرق ہیں اور سب کے سب صحیح ہیں، میں نے ایک مفصل مقالہ مجلہ الرسالہ میں شائع شدہ ایک تحریر کے جواب میں لکھا تھا جو اس حدیث اور حیات عیسیٰ اور ان کی وفات سے متعلق ایک سوال کا جواب ہے ، صاحب مقالہ نے اس میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ حدیث آحاد ہے میں نے یہ مقالہ مجلہ کے پاس بھیجنے کا ارادہ کیا تھا لیکن کچھ باہوش احباب نے مجھے ایسا نہ کرنے کا مشورہ دیا کہ اہل مجلہ صاحب تحریر کے بیچ میں اسے شائع نہیں کریں گے اگر ضروری ہے تو اس کا اختصار کر دیجئے میں نے ڈیڑھ صفحے میں اس کا خلاصہ کر دیا جبکہ اس کی اصل بیس صفحے پر پھیلی ہوئی ہے لیکن پھر بھی اس کی اشاعت نہ ہو سکی

بے شمار متواتر احادیث کی یہ تھوڑی سی مثال ہے جن پر احادیث کا علم نہ رکھنے والے حدیث آحاد کا حکم لگاتے ہیں حالانکہ علم حدیث کے جاننے والوں کے نزدیک یہ مشہور ترین متواتر احادیث میں سے ہیں پھر بھی اگر اہل کلام ان کے حقائق کو ثابت نہ کریں ، ان کے مضمون پر یقین نہ کریں اور ان پر اعتقاد نہ کریں تو فبای حدیث بعدہ یومنون اس کے بعد کس بات پر یہ لوگ ایمان لائیں گے ۔

حق وہی ہے جو میں نے عرض کیا ہے یہ باطل قول اپنے قائلین کو عقیدے کے باب میں اہل قرآن کی اقتدا میں صرف قرآن پر انحصار کرنے کی طرف لے جائے گا اور پیش کی گئی مثالیں میری اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں لیکن یہ سب استنباط اور بطور الزام تھا۔ اس بارے میں معاصر اہل قلم میں سے ایک شخص کے کلام کی واضح تحریر پڑھیے جو صراحت سے اس نظریئے کے اثبات کا دعویٰ کرتا ہے کہا ہے :

توحید کے باب میں صرف آیات قرآنی کی طرف رجوع کے انحصار کا اثبات سلہ

اس باطل قول کی طرف بعض معاصر مشائخ نے بھی سبقت کی ہے جن میں مشہور شیوخ ازہر میں سے بھی ایک ہیں وہ بہت صریح عبارت میں جس میں تاویل کی گنجائش نہیں کہتے ہیں:

وہ مسلمان جو اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ غیبی امور میں صرف قرآن ہی عقیدے کا مصدر ہے (اور اسی حق بات پر ہمارا بھی ایمان ہے) فرشتوں پر ایمان سے متعلق اس حد پر ٹھہر جاتے ہیں کہ ان کے متعلق قرآن نے جس حد کی خبر دی ہے سلہ ۲۳۱ پر مزید کہتے ہیں :-

اور عقائد میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جسے منفرد طور پر حدیث ثابت کرتی ہو ص ۶۱ پر لکھتے ہیں۔ کتاب (المقاصد) کے مؤلف نے (جو علم کلام کی ایک کتاب ہے) یہ بیان کیا ہے کہ علامات قیامت کی تمام احادیث آحادی ہیں یہ وہ نتیجہ ہے جس تک یہ لوگ احادیث میں مذکور مطلق اعتقاد کے انکار سے پہونچے ہیں اور یہ لوگ اس مقام تک ہرگز نہ پہونچتے اگر ان لوگوں نے یہ باطل قول نہ کہا ہوتا اس عظیم باطل کا لازم آنا اس خیال کے بطلان پر حکم لگانے کے لئے کافی ہے پیچھے بیان کی گئی وجوہات نیز یہ آخری وجہ بھی جس کا ذکر ہونے جا رہا ہے جو اس باطل قول سے متعلق آخری مقصد کا بیان ہے اس پر مستزاد ہیں ، یہ باطل قول سلف سے خلف تک منقول و متوارث اسلامی عقائد کی بربادی یا کم از کم انکے متعلق تشکیک ہے۔

بیسویں وجہ عیسیٰ علیہ السلام سے ایک حکمت روایت کی جاتی ہے جو جھوٹے مدعیان نبوت اور دجالوں کے سلسلے میں ہے کہ "من ثمارھم

سلہ دیکھو کتاب فصول اسلامیہ ص ۱۵۲

سلہ الاسلام عقیدۃ وشریعۃ ص ۲۴۲ شیخ محمد شلتوت۔

تعرفونہم ،، ان کے اقوال و اعمال سے تم انھیں پہچان لوگے ۔ لہذا مسلمانوں میں سے جو شخص اس باطل قول کا نتیجہ دیکھنا چاہے کہ عقیدہ حدیث آحاد سے ثابت نہیں ہوتا ہے اسے ان اسلامی عقائد پر غور کرنا چاہیئے ہم ذیل میں بیان کر رہے ہیں اور جن کو خلف نے سلف سے پایا ہے اور ان کے متعلق شہادت دینے والی کثیر وبیشمار روایات آئی ہیں اس وقت اس قول کی زبردست خطرناکی واضح ہو جائے گی جسے یہ مخالفین ثابت کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ مسلمان جن صحیح عقائد پر ہیں ان کے انکار سے انھیں کتنی زبردست گمراہی میں ڈال رہے ہیں وہ اسلامی عقائد یہ ہیں

① آدم علیہ السلام اور ان کے علاوہ دیگران انبیاء کی نبوت جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے

② جملہ انبیاء ورسل پر ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت

③ محشر میں آپؐ کی شفاعت کبریٰ

④ آپؐ کی شفاعت اپنی امت کے مرتکبین کبائر کے لئے

⑤ قرآن کے سوا آپؐ کے معجزات جن میں معجزہ شق القمر بھی ہے، قرآن میں اس کے ذکر کے باوجود انھوں نے اس کی ایسی تاویل کی ہے جو ان صحیح احادیث کے خلاف ہے جن میں بحیثیت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے معجزے کے چاند کے پھٹنے کی تصریح ہے ۔

⑥ آپؐ کی جسمانی صفات اور کچھ اخلاقی شمائل

⑦ وہ احادیث جن میں خلق کی ابتداء ملائکہ اور جن، جنت اور دوزخ کی صفت مذکور ہے اور یہ کہ دونوں مخلوق ہیں اور یہ کہ حجر اسود جنت سے آیا ہے [۱]

---

[۱] شیخ محمد شلتوت نے ص ۱۱۲ میں تصریح کی ہے کہ وہ مکہ کے پتھروں میں سے ایک طبعی پتھر ہے جس طرح انھوں نے ص ۲۴ ، ۲۵ میں اشارہ کیا ہے کہ وہ اعتقاد نہیں رکھتے کہ ملائکہ نور سے پیدا ہوئے ہیں

(۸) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وہ خصوصیات جنھیں سیوطی نے اپنی کتاب (الخصائص الکبریٰ) میں جمع کیا ہے جیسے جنت میں داخل ہونا، جنتیوں کو دیکھنا نیز ان نعمتوں کو دیکھنا جنھیں متقیوں کے لئے تیار کیا گیا ہے اور ایک جن ساتھی کا اسلام وغیرہ۔

(۹) یہ یقین کہ عشرہ مبشرہ اہل جنت میں سے ہیں۔

(۱۰) قبر میں منکر نکیر کے سوال پر ایمان۔

(۱۱) عذاب قبر پر ایمان۔

(۱۲) قبر کے بھینچنے پر ایمان

(۱۳) قیامت میں نصب دو پلڑے والی میزان پر ایمان

(۱۴) صراط پر ایمان

(۱۵) آپ کے حوض پر ایمان اور اس پر ایمان کہ جو شخص اس سے ایک بار سیراب ہو جائے گا دوبارہ کبھی پیاسا نہ ہوگا۔

(۱۶) آپ کی امت میں سے ستر ہزار اشخاص کا جنت میں بغیر حساب کے داخل ہونا۔

(۱۷) محشر میں انبیاء سے تبلیغ کے متعلق سوال

(۱۸) قیامت اور حشر و نشر کی جو صفت صحیح حدیثوں میں بیان ہوئی ہے ان سب پر ایمان۔

(۱۹) قضاء و قدر اور اس کے خیر و شر پر ایمان اور اس بات پر ایمان کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی سعادت و شقاوت اور اس کی رزق اور موت لکھ دی ہے۔

(۲۰) اس قلم پر ایمان جس نے ہر چیز لکھی ہے۔

(۲۱) اس بات پر ایمان کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے حقیقتاً نہ کہ مجازاً

(۲۲) بطور حقیقت عرش اور کرسی پر ایمان نہ کہ مجازاً [1]

(۲۳) اس بات پر ایمان کہ اہل کبائر جہنم میں ہمیشہ نہیں رہیں گے۔

(۲۴) اور یہ کہ شہداء کی روحیں جنت میں سبز پرندوں کی شکل میں ہوں گی۔

(۲۵) اور یہ کہ اللہ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ نبیوں کا جسم کھائے۔

(۲۶) اور یہ کہ اللہ کے کچھ سرگرم سفر فرشتے ہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو آپ کی امت کا سلام پہونچاتے ہیں۔

(۲۷) تمام علامات قیامت پر ایمان لانا جیسے مہدی کا خروج، عیسیٰ علیہ السلام کا نزول دجال کا خروج اور اپنے مقام سے دابۃ الارض کا نکلنا وغیرہ جنکے متعلق صحیح احادیث وارد ہیں

(۲۸) اور یہ کہ مسلمان تہتر فرقوں میں بٹ جائیں گے ایک کے علاوہ سب جہنم میں جائینگے اور وہ وہی گروہ ہے جو ان تمام باتوں کو مانتا ہے جن کو صحابہ مانتے تھے خواہ ان کا تعلق عقیدہ سے ہو یا عبادت وہدایت سے

(۲۹) اللہ کے ان تمام اسماء حسنیٰ اور اس کی صفات علیا پر ایمان جو سنت صحیحہ میں وارد ہیں جیسے علم، قدیر اور فوقیت اور نزول وغیرہ صفات۔

(۳۰) بلند آسمانوں کی طرف آپ کی معراج اور رب تعالیٰ کی بڑی بڑی نشانیوں کا دیکھنا یہ وہ صحیح اسلامی عقائد ہیں جو ثابت، متواتر یا مستفیض احادیث میں وارد ہیں اور جنھیں امت نے قبول کیا ہے جن کی تعداد سیکڑوں میں ہے میں نہیں خیال کرتا کہ کوئی مسلمان ان کے انکار کی جرأت کریگا یا ان میں تشکیک پیدا کرے گا گویہ بات ان لوگوں پر لازم آتی ہے جو حدیث آحاد سے عقیدے کو ثابت نہیں کرتے اللہ تعالیٰ ہمیں اور انکو سیدھے راستے کی ہدایت دے۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔ ○

دوسرا رسالہ تمام ہوا

---

[1] ان میں سے ایک شخص نے الفصول ص ۱۵۲ میں تصریح کی ہے کہ کرسی پر ایمان مجازاً ہے اور اس پر ایمان کا انکار حقیقۃ ہے اور اسی پر ایمان کی دعوت دی ہے۔

۳

تیسرا رسالہ

عقائد واحکام کے لئے حدیث ایک مستقل حُجّت

پہلی فصل

حدیث کی طرف مراجعت کا وجوب اور اس کی مخالفت کی حرمت

معزز بھائیو! صدر اول کے تمام مسلمانوں کا یہ متفق علیہ مسئلہ رہا ہے کہ حدیث نبوی علی صاحبہا افضل الصلوٰۃ والسلام ہر شعبۂ حیات میں شریعت اسلامی کا دوسرا اور آخری مرجع ہے۔ چاہے یہ شعبۂ حیات میں شریعت اسلامی کا دوسرا اور آخری مرجع ہے۔ چاہے یہ شعبہ ان دیکھی اعتقادی چیزوں سے متعلق ہو۔ یا عملی، سیاسی اور تربیتی احکام سے اور کسی بھی چیز میں قیاس یا اجتہاد یا رائے سے اس کی مخالفت جائز نہیں۔ جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے "الرسالۃ" کے آخر میں فرمایا ہے "حدیث کی موجودگی میں قیاس جائز نہیں" اسی جیسی بات متاخرین اصولیین کے یہاں مشہور ہے کہ "جب حدیث آجائے تو غور و فکر باطل" اور "جہاں نص ہو وہاں اجتہاد کا کوئی کام نہیں" اس سلسلے میں ان کی سند قرآن کریم اور سنت مطہرہ ہے۔

قرآن کا حدیث رسول سے فیصلہ کرانے کا حکم

قرآن کریم کے اندر بہت سی آیتیں ہیں جن کو میں اس مقدمہ میں ذکر کر رہا ہوں (کیونکہ یاد دہانی مومنوں کے لئے نفع بخش ہے)

۱۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وما كان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضى الله ورسوله امرًا ان يكون لهم الخيرة من امرهم ومن يعص الله ورسوله فقد ضل	جب اللہ اور اس کے رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو کسی مومن مرد اور کسی مومنہ عورت کے لئے اپنے معاملہ میں کسی طرح کے اختیار استعمال کرنے کا حق باقی نہیں رہ جاتا ہے

ضلالا مبینا (الاحزاب ٣٦)

اور جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ کھلم کھلا گمراہ ہوا۔

٢۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

یاایها الذین آمنوا لاتقدموا بین یدی اللہ ورسولہ واتقوا اللہ ان اللہ سمیع علیم (الحجرات ١)

اے مومنو! اللہ اور اس کے رسول کے آگے خود کو نہ بڑھاؤ اور اللہ سے ڈرو بیشک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

٣۔ اور فرمایا۔

قل اطیعوا اللہ والرسول فان تولوا فان اللہ لا یحب الکفرین۔
(آل عمران ٣٢)

(اے محمدؐ) کہہ دیجئے کہ تم لوگ اللہ اور رسول (محمدؐ) کی اطاعت کرو۔ اب اگر وہ پیٹھ پھیریں تو اللہ کافروں کو پسند بھی نہیں کرتا۔

٤۔ نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وارسلناک للناس رسولا وکفیٰ باللہ شهیدا ۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ ومن تولیٰ فما ارسلناک علیهم حفیظا۔
(النساء ٧٩ - ٨٠)

ہم نے آپ کو پیغامبر بنا کر بھیجا ہے اسکی شہادت کے لئے اللہ کافی ہے جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جنھوں نے پیٹھ پھیرا ان کا محافظ بھی آپ کو ہم نے نہیں بنا کر بھیجا ہے۔

٥۔ اور فرمایا۔

یاایها الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر ذالک خیر و

اے مومنو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور اولی الامر (یعنی مسلمانوں کے امور کے نگران) کی اطاعت کرو پھر اگر کسی چیز کے بارے میں جھگڑ بیٹھو تو اگر اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو تو اس معاملے کو اللہ اور رسول کی طرف

احسن تاویلا (النساء ۵۹)

لوٹاؤ یہی صورت بہتر اور اچھے نتیجے والی ہے۔

۶۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

اطیعوا اللہ ورسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم واصبروا ان اللہ مع الصابرین۔
(الانفال ۴۶)

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں نہ جھگڑو جس کی وجہ سے تم کم ہمت ہو جاؤ اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے اور صبر کرو بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

۷۔ اور فرمایا۔

واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واحذروا فان تولیتم فاعلموا انما علی رسولنا البلاغ المبین ۝
(المائدہ ۹۲)

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور احتیاط کرتے رہو اگر کہیں تم نے پیٹھ پھیر لیا تو جان لو کہ ہمارے رسول پر کھلی ہوئی تبلیغ کی ذمہ داری ہے اور بس۔

۸۔ اور فرمایا۔

لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا قد یعلم اللہ الذین یتسللون منکم لواذا فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبھم فتنۃ او یصیبھم عذاب الیم (النور ۶۳)

تم اپنے درمیان رسول کو ایسے نہ پکارو جیسے تم میں سے ایک دوسرے کو پکارتا ہے اللہ تم میں سے ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو چھپ چھپا کر کھسکتے ہیں جو لوگ رسول کے مشن کی مخالفت کرتے ہیں انھیں ڈرنا چاہئے کہ کوئی مصیبت ان کو آدبوچے یا دردناک عذاب ان کو آلے۔

۹۔ اور فرمایا۔

یا ایھا الذین آمنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم واعلموا ان اللہ یحول بین المرء

اے مومنو! تم اللہ کی بات کو اور رسول کی بات کو قبول کرو جب رسول تم کو ایسی چیز کے لئے بلائیں جو تمھیں حیات نو عطا کرنے والی ہے

وقلبہ وانہ الیہ تحشرون ٥ (الانفال ۲۴)

اور جان لو کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے پاس ہی ہے اور یہ بھی جان لو کہ تم کو اسی کے پاس اکٹھا کیا جائے گا۔

۱۰۔ اور فرمایا۔

ومن یطع اللہ ورسولہ یدخلہ جنات تجری من تحتہا الانہار خالدین فیہا وذلک الفوز العظیم ومن یعص اللہ ورسولہ ویتعد حدودہ یدخلہ نارا خالدا فیہا ولہ عذاب مہین ٥ (النساء ۱۳-۱۴)

اور جو کوئی اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا۔ وہ اسے ایسے باغات میں داخل کریگا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے یہ بہت بڑی کامرانی ہے اور جو کوئی اللہ کی اور اسکے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی سرحد سے آگے بڑھے گا وہ اسے آگ میں ڈال دے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے رسواکن عذاب ہے۔

۱۱۔ اور فرمایا:

الم تر الی الذین یزعمون انہم امنوا بما انزل الیک وما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بہ ویرید الشیطان ان یضلہم ضلالا بعیدا ۔ واذا قیل لہم تعالوا الی ما انزل اللہ والی الرسول رأیت المنافقین یصدون عنک صدودا (النساء ۶۰-۶۱)

(اے محمدؐ) کیا آپ نے انھیں نہیں دیکھا جو کہتے ہیں کہ وہ اس پر بھی ایمان لے آئے جو آپ پر نازل ہوا اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل ہوا وہ چاہتے یہ ہیں کہ طاغوت سے فیصلہ کرائیں حالانکہ انھیں اس کے انکار کا حکم دیا گیا ہے، شیطان تو چاہتا ہی ہے کہ انھیں دور کی گمراہی میں ڈال دے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی نازل کردہ چیز کی طرف اور رسول کی طرف آؤ تو آپ منافقوں کو دیکھیں گے کہ وہ آپ کے

پاس آنے سے ڈھٹائی سے روکتے اور رکتے ہیں۔

۱۲۔ اور فرمایا

انما قول المومنین اذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا واطعنا واولئک ھم المفلحون ومن یطع اللہ ورسولہ ویخش اللہ ویتقہ فاولئک ھم الفائزون ٥	جب مومنوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے انھیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تو ان کی بات یہ ہوتی ہے کہ ہم نے سن لیا اور مان گئے یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور جو کوئی اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے اور اللہ سے ڈرتا اور اس کا تقویٰ (دل میں) رکھتا ہے تو یہی لوگ کامران ہیں۔
(النور ۵۱۔۵۲)	

۱۳۔ اور فرمایا :۔

وما اٰتکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب ٥	اور رسول تمھیں جو کچھ بھی دیں اسے لے لو اور جس سے بھی روک دیں اس سے ہاتھ کھینچ لو اور اللہ سے ڈرو بیشک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔
(الحشر۔ ۷)	

۱۴۔ اور فرمایا۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الآخر وذکر اللہ کثیرا۔	تمھارے لئے اللہ کے رسول کے اندر بہترین نمونہ ہے اس کے لئے جو اللہ اور آخرت کے دن کی امید رکھتا ہے اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہے۔
(الاحزاب ۲۱)	

۱۵۔ اور فرمایا :۔

والنجم اذا ھویٰ ٥ ما ضل صاحبکم وما غویٰ ٥ وما ینطق عن الھویٰ ٥	قسم ہے ستارے کی جب وہ غائب ہو جائے تمھارا ساتھی نہ تو گمراہ ہوا ہے اور نہ غلط راہ

ان ھو الا وحی یوحیٰ ۵
(النجم - ۴)

پر پڑا اور وہ خواہش سے بات بھی نہیں کرتا وہ جو کچھ کہتا ہے وہ صرف وحی کی گئی ہوتی ہے

۱۶ - اور فرمایا :-

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون
(النحل ۴۴)

ہم نے آپ پر قرآن اس لئے اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لئے اتاری گئی چیز کی توضیح فرمائیں اور تاکہ وہ لوگ غور فکر کر سکیں۔

اس کے علاوہ بھی اور بہت سی آیتیں ہیں۔

ہر چیز میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی دعوت دینے والی حدیثیں

حدیث کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ ایسا موجود ہے جس سے ضروری قرار پاتا ہے کہ ہم اپنے تمام دینی امور میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی عمومی اتباع کریں چند ثابت شدہ حدیثیں ملاحظہ فرمایئے۔

۱ - عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال کل امتی یدخلون الجنۃ الا من ابی قالوا من ابی ؟ قال من اطاعنی دخل الجنۃ ومن عصانی فقد ابی
(بخاری کتاب الاعتصام)

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کے تمام لوگ جنت میں داخل ہوں گے مگر وہ جس نے انکار کیا لوگوں نے پوچھا کون ہے جو انکار کرتا ہے ؟ آپ نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو گیا اور جس نے میری نافرمانی کی۔ اسی نے انکار کیا۔

۲ - عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ قال جاءت ملائکۃ الی النبی صلے اللہ علیہ وسلم وھو نائم فقال

حضرت جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے انھوں نے کہا کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس فرشتے آئے اور آپ سو رہے تھے ان میں سے کسی نے

بعضهم انه نائم وقال بعضهم ان العين نائمة والقلب يقظان فقالوا ان لصاحبكم هذا مثلا فاضربوا له مثلا فقالوا مثله كمثل رجل بنى دارا وجعل فيها مأدبة وبعث داعيا فمن اجاب الداعي دخل الدار واكل من المأدبة ومن لم يجب الداعي فلم يدخل الدار ولم يأكل من المأدبة فقالوا اولوها له يفقهها فقال بعضهم ان العين نائمة والقلب يقظان فقالوا فالدار الجنة والداعي محمد صلى الله عليه وسلم فمن اطاع محمدا صلى الله عليه وسلم فقد اطاع الله ومن عصى محمدا صلى الله عليه وسلم فقد عصى الله ومحمد صلى الله عليه وسلم فرق بين الناس

(بخاری)

کہا، آپ سوتے ہیں اور کسی نے کہا کہ آنکھ سو رہی ہے مگر دل بیدار ہے پھر انھوں نے کہا کہ تمھارے اس ساتھی پر ایک مثال منطبق ہوتی ہے اس کے لیے مثال بیان کرو ان لوگوں نے کہا کہ آپ کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے ایک گھر بنایا پھر اس میں دستر خوان چن دیا اور ایک بلانے والے کو بھیجا جس نے اس کی دعوت قبول کر لی وہ گھر میں آیا اور اس نے دستر خوان سے کھایا اور جس نے اس کی دعوت قبول نہ کی وہ گھر میں آیا نہ دستر خوان سے کھایا فرشتوں نے کہا کہ اس کی توجیہ کرو تاکہ وہ اسے سمجھ سکیں انھیں سے کسی نے کہا کہ آنکھ سوتی ہے دل بیدار ہے (یہ تو واضح چیز ہے) پھر انھوں نے کہا دیکھو! گھر تو جنت ہے اور داعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور جس نے محمدؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمدؐ کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مومنوں اور کافروں کے مابین امتیاز ہو جائے گا۔

۳- عن ابی موسیٰ رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال انما مثلی ومثل ما بعثنی الله به کمثل رجل اتی قوما فقال یا قوم انی رایت الجیش

حضرت ابو موسیٰ رضؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا میری مثال اور اس چیز کی مثال جسے دے کر اللہ نے مجھے بھیجا ہے اس شخص جیسی ہے جو کسی قوم کے پاس آیا اور کہا

بعینی الی انا النذیر العریان ، فالنجاء النجاء ، فاطاعہ طائفة من قومہ فادلجوا فانطلقوا علی مھلھم فنجوا وکذبت طائفة منھم فاصبحوا مکانھم فصبحھم الجیش فاھلکھم واجتاحھم فذلک مثل من اطاعنی فاتبع ما جئت بہ ومثل من عصانی وکذب بما جئت بہ من الحق ‘‘ (بخاری ومسلم)

اے میری قوم بیشک میں نے اپنی دونوں آنکھوں سے لشکر کو دیکھا ہے اور بلا شبہ میں کھلا ڈرانے والا ہوں بچو، بچو۔ اس پر اس کی قوم کے ایک گروہ نے اس کی بات مان لی اور راتوں رات چل پڑے اور موقع پاکر نکل گئے اس طرح بچ گئے اور ایک گروہ نے اسکو جھٹلا دیا اور اپنی ہی جگہ ٹھہرے رہے لشکر نے صبح تڑکے ہی انکو آلیا اور انھیں نیست ونابود کردیا۔ یہی ہے مثال اس کی جس نے میری اطاعت کی اور جسے میں لایا ہوں اس کی پیروی کی۔ اور اس کی جس نے میری نافرمانی کی اور جو حق بات میں لایا ہوں اس کی تکذیب کی۔

۴ ۔ عن ابی رافع رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لا الفین احدکم متکئا علے اریکتہ یاتیہ الامر من امری مما امرت بہ او نھیت عنہ فیقول لا ادری ما وجدنا فی کتاب اللہ اتبعناہ (والا فلا) احمد، ابوداؤد، ترمذی تصحیح کے ساتھ، ابن ماجہ، طحاوی وغیرہ سند صحیح کے ساتھ۔

حضرت ابو رافع کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تم میں سے کسی کو ایسا نہ پاؤں کہ وہ اپنی مسند پر ٹیک لگائے ہو اور اس کے پاس میری ان باتوں میں سے کوئی بات پہونچے جس کا میں نے حکم دیا یا جس سے میں نے روکا ہے۔ تو وہ کہے مجھے نہیں معلوم! ہمیں تو قرآن میں جو ملتا ہے اس کی پیروی کرتے ہیں (ورنہ نہیں)

۵ ۔ عن المقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم الا انی اوتیت القرآن

حضرت مقدام بن معدیکرب رضؓ سے مروی ہے انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خبردار! میں قرآن دیا گیا ہوں اور

ومثله معه الا یوشک رجل شبعان علی اریکته یقول علیکم بهذا القرآن فما وجدتم فیه من حلال فاحلوه وما وجدتم فیه من حرام فحرموہ وان ما حرم رسول اللہ کما حرم اللہ الا لا یحل لکم الحمار الاھلی ولا ذی ناب من السباع ولا لقطۃ معاھد الا ان یستغنی عنھا صاحبھا ومن نزل بقوم فعلیھم ان یقروہ فان لم یقروہ فله ان یعقبھم بمثل قراہ (ابو داؤد، ترمذی، حاکم تصحیح کے ساتھ احمد سند صحیح کے ساتھ)

اسی کے ساتھ اسی جیسی ایک اور چیز۔ خبردار! قریب ہے کہ ایک ایسا آسودہ شخص اپنی مسند پر ہوگا جو کہتا ہوگا۔ (لوگو!) اس قرآن کو لازم پکڑو جو اس میں حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جو حرام پاؤ اسے حرام سمجھو (حضورؐ فرماتے ہیں) لوگو! حالانکہ جسے رسول اللہ نے حرام کر دیا وہ ویسے ہی ہے جیسے اللہ نے حرام کیا! خبردار! گھریلو گدھا تمھارے لئے حلال نہیں ہے نہ جنگلی جانوروں میں سے کوئی درندہ اور نہ کسی بھی معاہدہ والے شخص کی کوئی گری پڑی چیز الا یہ کہ کوئی معمولی سی چیز ہو۔ اور جو کسی قوم کے یہاں اترے تو اس قوم کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ضیافت کریں اگر وہ اس کی ضیافت نہ کریں تو اس کے لئے جائز ہے کہ اپنی مہمانی کے مثل ان سے بدلہ لے لے۔

۴ - عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنه قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ترکت فیکم شیئین لن تضلوا بعدھما ما تمسکتم بھما، کتاب اللہ وسنتی ولن یتفرقا حتی یردا علی الحوض (مالک مرسلا، حاکم، سند صحیح کے ساتھ)

حضرت ابو ہریرہ نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں ان دونوں کے بعد (جب تک تم انھیں تھامے رہو گے) کبھی بھی گمراہ نہیں ہو گے (وہ دونوں چیزیں یہ ہیں) اللہ کی کتاب اور میری سنت اور یہ دونوں جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوض پر میرے پاس آئیں گے ۞

۞ ۞ ۞ ۞

مندرجہ بالا نصوص کا خلاصہ استدلال

ان آیات واحادیث کے اندر کچھ نہایت اہم چیزیں ہیں جن کو مجملاً یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) اللہ کے فیصلے اور رسول کے فیصلے میں کوئی فرق نہیں ہے ان میں سے کسی کی مخالفت کا اختیار کسی بھی مومن کو نہیں ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی طرح ہے اور یہ کھلی ہوئی گمراہی ہے۔

(۲) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے آگے اپنے آپ کو بڑھانا جائز نہیں ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے آگے اپنے آپ کو بڑھانا جائز نہیں اور یہ اپنے آپ کو آگے بڑھانا اس بات کا کنایہ ہے کہ آپ کی سنت کی مخالفت جائز نہیں ہے۔ امام ابن قیم اعلام الموقعین (۱ر۵۸) میں فرماتے ہیں "یعنی تم لوگ کہو نہ حتی کہ آپ کہہ دیں تم حکم نہ دو حتی کہ آپ حکم دے دیں تم فتویٰ نہ دو حتی کہ آپ فتویٰ دے دیں اور تم کسی چیز کے بارے میں قطعی فیصلہ نہ کرو حتی کہ آپ ہی اس کام کا فیصلہ کریں اور اسے نافذ کریں۔

(۳) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے پیٹھ پھیرنا کافروں کا شیوہ ہے۔

(۴) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمانبردار اللہ کا فرمانبردار ہے۔

(۵) دین کے کسی بھی معاملے میں اختلاف اور نزاع کے وقت اللہ کی طرف اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف مراجعت کرنا اور لوٹنا ضروری ہے۔ علامہ ابن قیم اعلام الموقعین (۱ر۵۴) میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے اپنی اطاعت اور رسول کی اطاعت کا حکم دیا اور فعل کو لوٹایا (یعنی اطیعوا الرسول کہا) تو یہ بتانے کے لئے کہ رسول کی اطاعت مستقلاً واجب ہے اور آپ کے حکم کو قرآن پر پیش کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ جب آپ حکم دیں تو اس کی اطاعت مطلقاً واجب ہے خواہ قرآن میں اس کا حکم موجود ہو یا نہ ہو کیونکہ آپ کو کتاب اللہ اور اس کے ساتھ ہی اس جیسی ایک اور چیز (جسے حدیث کہا

جاتا ہے) دی گئی ہے۔ دیکھو! اللہ نے اولی الامر (مسلمانوں کے معاملات کے نگراں) کی اطاعت کو مستقلاً تسلیم کرنے کا حکم نہیں دیا ہے بلکہ فعل کو حذف کردیا اور اولی الامر کی اطاعت کو رسول کی اطاعت کے ضمن میں رکھا۔

علماء کے نزدیک اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اللہ کی طرف رجوع کرنا۔ اس کی کتاب کی طرف رجوع کرنا ہے اور رسول کی طرف رجوع کرنا ان کی زندگی میں تو انھیں کی طرف رجوع کرنا ہے اور ان کی وفات کے بعد ان کی سنت کی طرف رجوع کرنا ہے اور یہ بھی متفق علیہ بات ہے کہ ایسا کرنا ایمان کی شرائط میں سے ایک ہے۔

(۶) باہمی اختلاف سے چھٹکارا پانے کیلئے سنت کی مراجعت کو ترک کرکے جھگڑے اور اختلاف ہی پر خوش رہنا، شریعت کی نظر میں مسلمانوں کی تمام کوششوں میں ناکامی اور قوت وطاقت اور شان وشوکت کے ختم ہو جانے کا ایک اہم سبب ہے۔

(۷) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مخالفت سے بچنا چاہیئے کیونکہ اس مخالفت کا برا انجام دنیا اور آخرت دونوں میں ہے۔

(۸) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مشن اور حکم کی مخالفت کرنے والے دنیا میں مصیبت اور آخرت میں دردناک عذاب کے مستحق ہیں۔

(۹) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حکم اور آپ کی دعوت کو قبول کرنا واجب ہے اور یہ خوشگوار زندگی اور دنیا اور آخرت کی سعادت کا سبب ہے۔

(۱۰) نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت دخول جنت اور عظیم کامرانی کا سبب ہے اور آپ کی نافرمانی اور آپ کے متعین کردہ حدود سے تجاوز جہنم اور رسواکن عذاب میں دخول کا موجب ہے۔

(۱۱) جو منافقین، اسلام کو ظاہر کرتے اور کفر کو چھپائے رکھتے ہیں ان کی خاصیت یہ ہے کہ جب انھیں رسول اور رسول کی سنت سے فیصلہ کرانے کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ اسے نہیں قبول کرتے بلکہ اس سے لوگوں کو روکتے ہیں۔

(۱۲) مومنین منافقین کی طرح نہیں ہیں کیونکہ جب انھیں رسول سے فیصلہ کرانے کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو اسے فوراً قبول کر لیتے ہیں اور بزبان حال وقال کہتے ہیں "ہم نے سنا اور مان لیا"۔ اسی کے ذریعہ وجنات نعیم کو پاکر کامران اور کامیاب ہوں گے۔

(۱۳) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جس چیز کا بھی حکم دیں اس کی اتباع اسی طرح ضروری ہے جس طرح ہم پر یہ ضروری ہے کہ جس چیز سے بھی ہمیں روکیں اس سے ہم رک جائیں۔

(۱۴) نبی صلے اللہ علیہ وسلم دین کے ہر معاملے میں ہمارے لئے اسوہ اور نمونہ ہیں اگر ہم مسلمان ہیں۔

(۱۵) جو کچھ بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلے وہ اللہ کی طرف سے وحی ہے۔ اگر اس کا تعلق دین سے اور ایسے غیبی امور سے ہے جسے عقل سے جانا جا سکتا ہے نہ تجربہ سے۔ حضورؐ کے پاس سے باطل کا گذر نہیں ہو سکتا نہ آگے سے نہ پیچھے سے۔

(۱۶) نبی صلے اللہ علیہ وسلم پر جو قرآن نازل ہوا ہے آپ کی سنت اس کی شرح ہے۔

(۱۷) قرآن سنت سے بے نیاز نہیں کرتا بلکہ سنت کی اطاعت اور پیروی قرآن ہی کی طرح لازم اور ضروری ہے۔ جو شخص قرآن کھولے کر سنت سے خود کو بے نیاز کرلے وہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مخالف اور آپ کا نافرمان ہے اس طرح وہ مندرجہ بالا آیات کا بھی مخالف ہے۔

(۱۸) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جسے حرام کر دیا وہ ٹھیک اسی طرح حرام ہے جیسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ اسی طرح ہر وہ چیز جسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا ہے اور وہ قرآن میں نہیں ہے اس کی ٹھیک وہی حیثیت ہے جو قرآن کے اندر وارد حکم کی ہے کیونکہ آپ کا یہ فرمان " الا انی اوتیت القرآن ومثلہ معہ " (خبردار مجھے قرآن اور اس کے ساتھ اور اسی جیسی دوسری چیز بھی) عمومی حیثیت رکھتا ہے۔

(۱۹) گمراہی اور ضلالت سے بچنا صرف قرآن وحدیث سے تمسک ہی پر منحصر ہے۔ یہ حکم

قیامت تک کے لئے ہے۔ اس لئے اللہ کی کتاب اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت کے درمیان تفریق قطعاً جائز نہیں ہے۔

عقائد اور احکام کے اندر سنّت کی اتباع ہر زمانے میں لازم ہے

محترم بھائیو! کتاب وسنت کی مندرجہ بالا نصوص جہاں قطعیت کے ساتھ اس بات کو بتاتی ہیں کہ سنت کی پیروی ہر اس چیز میں مطلقاً واجب ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اور یہ کہ اگر کوئی سنت سے فیصلہ کرانے اور اس کے تابع ہونے پر راضی نہ ہو تو وہ مومن ہی نہیں ہے۔ وہیں میں چاہتا ہوں کہ آپ کی توجہ اس بات پر مبذول کراؤں کہ یہ نصوص اپنی عمومیت اور اطلاق کی وجہ سے دوسری دو اہم چیزوں کو بھی بتاتی ہیں۔

اوّل یہ کہ ان نصوص کا حکم ان تمام لوگوں کو شامل ہے جن کو یہ دعوت قیامت تک پہونچے۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ کے اس قول سے صاف ظاہر ہے۔

"لانذرکم بہ ومن بلغ" (الانعام ـ ۱۹) تاکہ میں تم کو اس کے ذریعہ ڈراؤں اور ان کو بھی جنھیں یہ بات پہونچے۔

"وما ارسلنٰک الا کافۃ للناس بشیرا ونذیرا" (سبا ـ ۲۸) ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لئے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر، حدیث میں اس طرح کی ہے۔

وکان النبی یبعث الی قومہ خاصۃ وبعثت الی الناس کافۃ متفق علیہ

پہلے نبی، خاص اپنی قوم کے پاس بھیجا جاتا تھا اور میں تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

اور فرمایا :-

والذی نفسی بیدہ لا یسمع بی رجل من ھذہ الامۃ ولا یھودی ولا

خدا کی قسم کوئی یہودی یا نصرانی یا اس امت کا کوئی اور آدمی اگر میرے بارے میں سنے گا

نصرانی ثم لم یومن بی الا کان | اور مجھ پر ایمان نہیں لائے گا تو وہ جہنمی
من اهل النار۔ (مسلم، ابن مندہ وغیرہ | ہوگا
الصحیحہ - ۱۵۷)

دوم - یہ کہ ان نصوص کا حکم دین کے تمام امور کو شامل ہے۔ خواہ وہ چیز علمی عقیدہ ہو یا عملی حکم یا اس کے سوا کوئی اور چیز - چنانچہ جب ہر صحابی پر یہ چیز واجب تھی کہ وہ ہر اس چیز پر ایمان لائے جو اس کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے یا کسی دوسرے صحابی کے واسطے سے پہونچے تو ٹھیک اسی طرح سے تابعی پر بھی ایمان لانا واجب تھا جب اسے کوئی چیز صحابی کے واسطے سے معلوم ہو۔ جب صحابی کے لئے یہ چیز جائز نہیں تھی کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو جو عقیدے کے سلسلے کی ہے، محض اس دلیل کی بنیاد پر رد کر دے کہ وہ خبر واحد ہے اور اسے اس جیسے ایک صحابی نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے تو صحابی کے بعد آنے والوں کے لئے بھی اس دلیل سے حدیث کا رد کرنا جائز نہیں ہوگا جب تک یہ معلوم رہے کہ اس حدیث کا بیان کرنے والا ثقہ ہے ٹھیک اسی طرح یہ چیز قیامت تک کے لئے مستمر ہونی چاہیئے ویسے یہ تابعین اور ائمہ مجتہدین کے زمانے میں اسی طرح تھی بھی۔ چنانچہ امام شافعی رحمہ سے اس سلسلے کی تصریح آگے آرہی ہے

متاخرین کا سنت کو حَکَم بنانے کے بجائے خود اس پر حاکم بن جانا

پھر صحابہ اور تابعین کے بعد کچھ ایسے نا اہل آئے جو سنت نبویہ کو چند ایسے اصول و قواعد کی بنیاد پر چھوڑ بیٹھے جنھیں کچھ متکلمین، اصولیین اور فقہائے مقلدین نے وضع کیا تھا۔ جس کا نتیجہ انکار سنت اور اہمال حدیث کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس طرح احادیث کے ایک بڑے ذخیرے میں شک و شبہ پیدا ہوگیا اور اس کا ایک خاصہ حصہ ان اصولوں کے خلاف ہونے کے ناطے متروک قرار پاگیا۔ اب ان لوگوں کے نزدیک آیت کا مفہوم ہی الٹا ہو گیا اس کے بجائے کہ وہ قواعد کے سلسلے میں سنت کی طرف رجوع کرتے اور اسے حکم مانتے

انھوں نے معاملہ ہی الٹ دیا اور سنت کو اپنے قواعد و اصول پر پیش کیا۔ روایت ان کے اصولوں پر پوری اتری تو اسے قبول کر لیا ورنہ رد کر دیا۔ یہی سبب ہے کہ مسلمانوں اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے درمیان کامل رابطہ منقطع ہو گیا۔ خصوصاً متاخرین کے عہد میں (تو تعلق اور بھی کٹ گیا) اس طرح لوگ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے عقیدہ، سیرت، عبادات، صیام، قیام، حج، احکام اور فتاویٰ سے لاعلم ہو گئے۔ اب ان چیزوں میں سے کسی کے متعلق پوچھا جاتا ہے تو اس کا جواب یا تو ضعیف حدیث سے دیتے ہیں یا ایسی حدیث سے جس کی کوئی اصل نہیں ہوتی یا کسی خاص مذہب کو جواب میں پیش کرتے ہیں۔ اگر اس بات پر اتفاق ہو کہ وہ صحیح حدیث کے خلاف ہے اور انھیں توجہ دلائی جاتی ہے تو توجہ نہیں دیتے ہیں اور کچھ ایسے شکوک وشبہات کی بنیاد پر صحیح حدیث کی طرف رجوع نہیں کرتے جن کے ذکر کی یہ جگہ نہیں ہے۔

یہ سب کچھ کرنے کی وجہ وہی اصول وقواعد ہیں جن کی طرف اشارہ گذر چکا اور ان میں سے کچھ کا ذکر انشاء اللہ آگے آئے گا۔ یہ وبا اس قدر عام ہو گئی ہے کہ تمام اسلامی ممالک، علمی رسائل ومجلات، اور تمام دینی کتابوں کو اس نے اپنی زد میں لے لیا ہے۔ شاذ ونادر رہی کوئی چیز محفوظ ہو گی۔ کتاب وسنت کے مطابق فتویٰ دینے والا آپ معدودے چند افراد کو پائیں گے جو یک وتنہا ہوں گے۔ جمہور مفتی، مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک کے اوپر اعتماد کرتے ہیں اور اگر اپنی خود ساختہ کوئی مصلحت پیش آگئی تو دوسرے مذہب کو بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ حدیث تو ان کے یہاں قطعاً نسیاً منسیا ہو گئی ہے الا یہ کہ اس پر عمل کرنے کی کوئی مصلحت آپڑے جیسا کہ بعضوں نے طلاق کے سلسلے میں ابن عباس کی روایت میں تین کے لفظ کے ساتھ وارد روایت پر کیا جس میں ہے کہ وہ (تین طلاق) نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک تھی۔ ان لوگوں نے اب اسے ایک مذہب کا مقام دے دیا ہے جبکہ وہ اس اصول کے گھڑنے سے پہلے اس حدیث پر نکتہ چینی کرتے تھے اور اس کی طرف بلانے والوں سے لڑائیاں کرتے تھے۔

متاخرین کے یہاں حدیث کی اجنبیت

اس زمانے میں حدیث کی اجنبیت وغربت اور اہل علم اور اہل فتاویٰ کی جہالت پر ایک دلیل وہ جواب ہے جسے ایک معروف اسلامی پرچے نے اس سوال پر دیا ہے کہ کیا حیوانات کو دوبارہ اٹھایا جائے گا؟ جواب کے الفاظ یہ ہیں: امام آلوسی نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ "اس (یعنی قیامت کے روز حیوانات کے اٹھائے جانے" کے بارے میں قرآن کی کوئی ایسی تصریح ہے نہ قابل اعتماد حدیث جو ثقلین (انسان وجنات) کے سوا چڑیوں اور حیوانات کے اکٹھا کئے جانے پر دلالت کرتی ہو" یہی وہ دلیل ہے جس کا سہارا مجیب نے لیا ہے۔ یہ نہایت عجیب چیز ہے۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اہل علم نے، علم حدیث کو کس قدر متروک قرار دے دیا ہے۔ غیر اہل علم کو تو چھوڑیئے (واقعہ یہ ہے) کہ اس سلسلے میں ایک سے زائد حدیثیں ثابت ہیں جن میں تصریح موجود ہے کہ حیوانات کو اٹھایا جائے گا اور ایک کو دوسرے کا قصاص دلایا جائے گا اسی سے متعلق صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے۔

لتؤدن الحقوق الی اھلھا حتی یقاد للشاۃ الجلحاء من الشاۃ القرناء	البتہ ضرور ضرور حق والوں کو حق دلایا جائے گا یہاں تک کی بے سینگ کی بکری کو سینگ والی بکری سے بدلہ دلایا جائے گا۔

عبداللہ بن عمرو وغیرہ سے ثابت ہے کہ کافر جب اس قصاص کو دیکھے گا تو کہے گا۔ یٰلیتنی کنت ترابا (النباء ۴۰) اے کاش! میں مٹی ہو جاتا۔

متاخرین کے وہ اصول جن کی وجہ سے حدیثیں متروک ہوئیں

وہ کون سے اصول و قواعد ہیں جن کو متاخرین نے بنایا اور جن کی وجہ سے لوگ حدیثوں کے پڑھنے پڑھانے اور اس پر عمل کرنے کو ترک کر بیٹھے اس کے جواب میں میں کہتا ہوں کہ ان اصولوں کا حصر مندرجہ ذیل چیزوں میں ممکن ہے۔

اوّل :۔ بعض متکلمین کا یہ قول کہ حدیث آحاد سے عقیدہ ثابت نہیں ہو سکتا آج کے بعض مبلغین اسلام نے تو اس کی تصریح کی ہے کہ آحاد کو عقیدہ کی بنیاد بنانا ناجائز نہیں ہے بلکہ حرام ہے۔

دوم :۔ بعض وہ قواعد جنہیں کچھ مروج مسالک نے اپنے اصول کے اندر گھڑ کے رکھ لیا ہے۔ میرے سامنے اس وقت یہ چند چیزیں ہیں۔

(الف) قیاس کو خبر واحد پر مقدم کرنا۔ (الاعلام ۱/۳۲۷ و ۳۰۰، شرح المنار ص ۶۲۳)

(ب) اگر خبر واحد اصول کے مخالف ہو تو اسے رد کر دینا۔ (الاعلام ۱/۳۲۹ شرح المنار ۶۴۶)

(ج) اس حدیث کا رد کر دینا جس میں نص قرآنی سے زائد کوئی حکم آیا ہو کیونکہ اس طرح حدیث قرآن کی ناسخ بن جائے گی حالانکہ سنت قرآن کی ناسخ نہیں۔

(شرح المنار ۶۴۷۔ الاحکام ۲/۶۱۱)

(د) تعارض کے وقت عام کو خاص پر مقدم کر دینا یا خبر واحد کے ذریعہ عموم قرآنی کی تخصیص کا جائز نہ ہونا (شرح المنار ص ۲۸۹۔ ۲۹۴۔ ارشاد الفحول ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۳، ۱۴۴)

(ھ) اہل مدینہ کے عمل کو صحیح حدیث پر مقدم کر دینا۔

سوم۔ تقلید کرنا اور اسی کو مذہب اور دین بنا لینا۔

دوسری فصل

حدیث پر قیاس وغیرہ کی تقدیم کا بطلان

صحیح حدیث کا قیاس یا اس کے علاوہ اوپر ذکر کئے گئے قواعد میں سے کسی کے ذریعہ رد کرنا، اسی طرح اہل مدینہ کی مخالفت کی وجہ سے صحیح حدیث کا رد کر دینا ان آیات اور احادیث کی صریح مخالفت ہے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے اور جن کا فیصلہ یہ ہے کہ اختلاف اور نزاع کے وقت قرآن وسنت کی طرف رجوع کرنا واجب ہے جو قواعد ہم ذکر کر آئے ہیں ان جیسے قواعد سے حدیث کا رد کرنا اہل علم کا متفق علیہ اصول نہیں ہے جمہور علماء ان اصولوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور قرآن وحدیث کی اتباع کرتے ہوئے صحیح حدیثوں کو ان اصولوں پر مقدم رکھتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں نہ ہو جب کہ حدیث پر عمل کرنا واجب ہے گو حدیث کے خلاف لوگوں کے اتفاق کا گمان ہو یا یہ معلوم نہ ہو سکے کہ کسی نے اس حدیث پر عمل بھی کیا ہے امام شافعی "الرسالہ ص ۴۲۲ تا ۴۶۴" میں فرماتے ہیں۔ حدیث جس وقت بھی ثابت ہو اسی وقت اس کو قبول کرنا واجب ہے گو اس کے مطابق کسی امام کا عمل نہ ہوا ہو۔ علامہ ابن قیم اعلام الموقعین (۱/ ۳۲، ۳۳) میں کہتے ہیں امام احمدؒ صحیح حدیث پر کسی عمل، رائے، قیاس اور کسی کے قول کو مقدم کرتے تھے، نہ مخالف حدیث کے عدم علم کو ہی مقدم کرتے تھے جسے بہت سے لوگ اجماع کا نام دیتے ہیں اور اسے صحیح حدیث پر مقدم کر دیتے ہیں امام احمد نے ان لوگوں کی تکذیب کی ہے جنھوں نے اس طرح کے اجماع کا دعویٰ کیا ہے انھوں نے ثابت شدہ حدیث پر ایسے اجماع کو مقدم کرنا جائز نہیں قرار دیا اسی طرح امام شافعی نے بھی رسالہ جدیدہ میں اس بات کی تصریح کی ہے کہ جس چیز کے بارے میں کوئی مخالف دلیل معلوم نہ ہو اس کو اجماع نہیں کہتے امام احمد اور دوسرے ائمہ محدثین کے نزدیک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صریح حدیثیں

اس سے کہیں برتر ہیں کہ ان پر یہ لوگ وہمی اجماع کو مقدم کر دیں جس اجماع کی کل پونجی یہ ہوتی ہے کہ مخالف معلوم نہیں ہے اگر ایسا کرنا جائز ہو جاتا تو تمام نصوص بیکار ہو جاتیں اور ہر اس شخص کے لئے جو کسی مسئلہ کے اندر کوئی مخالف رائے بھی نہیں جانتا یہ جائز ہو جاتا کہ وہ اپنی اس جہالت ہی کو نصوص پر مقدم کر دے ۔"

ابن القیم نیز فرماتے ہیں (۳ر ۴۶۴ - ۴۶۵)

"سلف صالحین اس شخص پر سخت نکیر کرتے اور غصہ ہوتے تھے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے مقابل میں رائے، قیاس، استحسان یا کسی کا قول لائے وہ شخص خواہ کوئی بھی ہو ایسا کرنے والے کو برا بھلا کہتے تھے اور اس شخص پر نکیر کرتے تھے جو اس کے لئے ادھر ادھر کی مثالیں پیش کرے اور انقیاد و تسلیم اور سمع وطاعت کے ذریعہ قبول کرنے کے علاوہ کسی اور چیز کو جائز نہیں قرار دیتے تھے، حدیث کو قبول کرنے میں توقف کرنے کا وہم وخیال بھی ان کے دلوں پر نہیں گذرتا تھا کہ وہ اس حدیث کے لئے کسی کے عمل یا قیاس کو بطور شاہد پیش کرتے یا زید و بکر کے قول کی موافقت دکھاتے وہ لوگ تو اللہ تعالیٰ کے اس قول پر عمل کرنے والے تھے ۔

وما کان لمؤمن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ۔	جب اللہ اور اس کے رسول نے کسی چیز کا فیصلہ کر دیا۔ تو کسی مومن مرد اور کسی مومنہ عورت کے لئے اپنے معاملہ میں کسی طرح کے اختیار استعمال
(الاحزاب ۔ ۳۶)	کرنے کا حق باقی نہیں رہ جاتا ۔"

اس سلسلے کی بہت سی مثالیں گذر چکی ہیں اب ہم ایسے زمانے میں آگئے ہیں کہ جب کسی سے کہا جاتا ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے ایسا اور ایسا فرمایا ہے تو وہ کہتا ہے یہ کس کا قول ہے؟ وہ اس کے کسی کے نہ جاننے کو اپنی مخالفتِ حدیث اور ترکِ عمل بالحدیث کی سند لاتا اور حجت بناتا ہے اگر وہ اپنے تئیں مخلص ہوتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کی یہ بات حد درجہ باطل اور لغو ہے ۔ اور اس کے لئے اپنی

اس جیسی جہالت کی بنیاد پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو رد کر دینا جائز نہیں اس کی لاعلمی کا عذر تو اور زیادہ قبیح ہے کیونکہ اس کو یقین ہے کہ اس سنت کے خلاف اجماع ہو چکا ہے جو مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ بدگمانی ہے۔ کیونکہ وہ انکی کی طرف منسوب کر رہا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت کی مخالفت پر اتفاق کر لیا ہے۔ دعوۂ اجماع کا عذر تو اور بھی زیادہ قبیح ہے۔ یہ تو حدیث کے مطابق جن بزرگوں کا قول ہے ان کے بارے میں اس کی جہالت اور لاعلمی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حدیث پر اپنی جہالت کو مقدم کر رہا ہے اللہ ہی مددگار ہے"

میں کہتا ہوں، یہ تو اس شخص کی بات ہے جو حدیث کی مخالفت اس خیال سے کر رہا ہے کہ علماء اس کے خلاف پر متفق ہیں۔ اس شخص کو کیا کہا جائے جو یہ جانتا ہو کہ بہت سے علماء کا قول اس کے مطابق ہے اور جن جن لوگوں نے اس حدیث کی مخالفت کی ہے ان کے پاس مذکورہ بالا اصول و قواعد یا تقلید جس کا ذکر فصل رابع میں آرہا ہے کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے۔

حدیث پر اصول اور قیاس کو مقدم کرنے کی غلطی کا سبب

میری نظر میں، حدیث پر مذکورہ بالا قواعد کو مقدم کرنے کی غلطی کی بنیاد ایک طرف تو حدیث کے بارے میں ان کا یہ نظریہ ہے کہ اس کا درجہ اس درجہ سے نیچے ہے جس کے اندر اسے اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے اور دوسری طرف اس کے ثبوت کے سلسلے میں ان کا شبہ ہے، ورنہ حدیث پر قیاس کو مقدم کرنا ان کے لئے یہ جانتے ہوئے کیونکر جائز ہوتا کہ قیاس، رائے اور اجتہاد کی بنیاد پر قائم ہے اور یہ جیسا کہ معلوم ہے معرض خطا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے بوقت ضرورت ہی کام لیا جاتا ہے جیسا کہ امام شافعی کے قول میں گذر چکا ہے کہ حدیث کی موجودگی میں قیاس کرنا جائز نہیں ہے اور یہ جاننے کے باوجود کہ انھیں بوقت نزاع حدیث ہی کو حکم بنانے کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ گذر چکا، ان کے لئے کسی شہر کے باشندوں کے عمل

مقدم کرنا کیسے جائز ہوتا ؟ امام سبکی نے ایسے ہمعین مذہب اختیار کرنے والے کے بارے میں کیا خوب کہا ہے جو حدیث پا کر اسے اپنا مذہب نہ بناتا ہو اور نہ اپنے مذہب کے علاوہ کسی اور کو اس کا قائل ہی پاتا ہو۔" حدیث کی اتباع میرے نزدیک اولی اور افضل ہے انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا فرض کرلے اور اسی حالت میں اس نے یہ حدیث آپ سے سنی ہو کیا اس صورت میں وہ تھوڑی دیر کے لئے بھی اس حدیث پر عمل کو مؤخر کر سکتا ہے۔ نہیں بخدا نہیں۔ بہرحال ہر ایک آدمی اپنی سمجھ کے بقدر مکلف ہے" (رسالہ "معنی قول الامام المطلبی : اذا صح الحدیث فہو مذہبی"، ص ۱۰۲ ج ۳ - مجموعۃ الرسائل المنبریۃ)

میں کہتا ہوں اس سے میری مذکورہ بالا بات کی تائید ہوتی ہے کہ حدیث میں شبہہ ان چیزوں میں سے ایک ہے جس کی وجہ سے ان سے یہ غلطی سرزد ہوئی۔ ورنہ اگر وہ لوگ یہ جانتے کہ اسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تو وہ ان قائل عدول اور اصولوں کے ساتھ زبان نہ کھولتے چہ جائیکہ ان اصولوں کو فٹ کرتے اور ان کی بنیاد پر سیکڑوں ثابت حدیثوں کی مخالفت کرتے جبکہ ان کے پاس رائے، قیاس اور ایک ایسی جماعت کے عمل کی پیروی کے سوا کوئی سند موجود نہیں جس کا ذکر ہم کر آئے ہیں عمل صحیح تو وہ ہے جو سنت کے موافق ہو اس پر زیادتی دین کے اندر زیادتی ہے اور اس میں کمی دین کے اندر کمی ہے۔ علامہ ابن قیم نے مذکورہ زیادتی اور کمی کی توضیح کرتے ہوئے کہا ہے (۱/ ۲۹۹)

"پہلا قیاس ہے اور دوسرا باطل تخصیص، اور دونوں چیزیں دین سے نہیں ہیں۔ جو شخص نصوص سے واقفیت نہیں رکھتا وہ کبھی نص کے اندر ایسی چیز بڑھا دیتا ہے جو اس میں نہیں ہے۔ اور کہتا ہے یہ قیاس ہے۔ اور کبھی اس چیز کو کم کر دیتا ہے جس کا تقاضہ نص کرتی ہے۔ اور اسے اس نص کے حکم سے خارج کر دیتا ہے اور کہتا ہے یہ تخصیص ہے اور کبھی نص کو بالکلیہ چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے اس پر عمل نہیں، ا

یا کہتا ہے یہ خلاف قیاس ہے یا خلاف اصول ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قیاس کے اندر آدمی جتنا ہی غلو کرتا ہے۔ اس کی سنت کی مخالفت اتنی ہی شدید ہو جاتی ہے ہم حدیثوں اور سنتوں کی مخالفت صرف اصحاب رائے اور ارباب قیاس ہی کے یہاں دیکھتے ہیں۔ خدا کی پناہ کتنی ہی صحیح اور صریح حدیثیں اسی وجہ سے متروک ہو گئیں اور کتنے ہی آثار ہیں جن کا حکم اسی سبب سے ختم ہو گیا۔ اہل رائے اور اہل قیاس کے یہاں حدیثیں اور سنتیں اپنی چھتوں کے بل الٹی پڑی ہیں۔ ان کے احکام متروک ہیں۔ ان کی حکمرانی اور ولایت معزول ہے نام ان کا ہے اور حکم غیروں کا چلتا ہے۔ سکہ اور خطبہ انکا چلتا ہے اور امر و نہی غیروں کی چلتی ہے اگر ایسا نہیں تو وہ متروک کیونکر ہوئیں"

احادیث صحیحہ کی چند مثالیں جن کی مخالفت مذکورہ بالا اصولوں کی بنیاد پر کی گئی ہے۔

(۱) ابتداءً باری تقسیم کرنے کی حدیث، اور یہ کہ بیوی اگر باکرہ ہو تو اسے سات رات کا اور اگر ثیبہ ہو تو تین رات کا حق عقد ہوتا ہے۔ اس کے بعد تمام بیویوں کے لئے برابر برابر باری متعین کر دی جائے گی۔

(۲) غیر شادی شدہ زانی کی جلا وطنی والی حدیث

(۳) حج میں شرط لگانے اور شرط لگا کر حلال ہو جانے کے جواز والی حدیث

(۴) جوربین پر مسح والی حدیث

(۵) حضرت ابوہریرہ اور معاویہ بن حکم کی اس سلسلے کی حدیث کہ بھول جانے والے اور نہ جاننے والے کا بول دینا نماز کو باطل نہیں کرتا۔

(۶) اس شخص کے، نماز مکمل کرنے کی حدیث جس نے نماز فجر کی ایک رکعت ادا کی اور سورج نکل آیا۔

(۷) بھول کر کھا لینے والے کے لئے روزہ پورا کرنے والی حدیث

(۸) میت کی طرف سے روزہ رکھنے کی حدیث۔

⑨ ایسے مریض کی طرف سے حج کرنے کے حدیث جو شفا پانے سے مایوس ہو چکا ہے

⑩ شاہد مع الیمین کے ساتھ فیصلہ کرنے کی حدیث

⑪ ربع دینار میں چور کا ہاتھ کاٹنے کی حدیث

⑫ اس شخص کے مال ضبط کر لینے اور گردن مار دینے کی حدیث جس نے اپنے باپ کی بیوی سے شادی کر لی ہے۔

⑬ مومن کو کافر کے بدلے نہ قتل کئے جانے کی حدیث۔

⑭ محلل (حلالہ کرنے والا) اور محلل لہٗ (جس کے لئے حلالہ کرایا جائے) پر لعنت الٰہی کی حدیث۔

⑮ بغیر ولی، نکاح کے عدم جواز کی حدیث

⑯ تین طلاق دی گئی عورت کو سکنیٰ (گھر) اور نفقہ (خرچ) نہ دینے کی حدیث۔

⑰ بیوی کو مہر دینے کی حدیث چاہے لوہے کی ایک انگوٹھی ہی ہو۔

⑱ گھوڑے کے گوشت کی حلت والی حدیث

⑲ ہر مسکر (سکر پیدا کرنے والی چیز جس سے عقل میں فتور آجائے) کی حرمت والی حدیث۔

⑳ پانچ وسق (لگ بھگ سوا بیس من) کچے سیر سے، سے کم میں زکوٰۃ فرض نہ ہوتے والی حدیث۔

㉑ مزارعہ اور مساقاہ (بٹائی پر کھیت دینے اور بٹائی پر باغ دیتے) والی حدیث۔

㉒ یہ حدیث کہ جنین کا ذبح ماں کا ذبح ہے

㉓ رہن (کے جانور) پر سواری کرنے اور اس کا دودھ دوہنے والی حدیث

㉔ شراب کو سرکہ بنانے کی ممانعت والی حدیث

㉕ رضاعت کے باب میں عورت کی پستان کو بچے کے، ایک مرتبہ یا دو مرتبہ

چوسنے سے حرمت نہ ثابت ہونے والی حدیث

(۲۶) یہ حدیث کہ تم اور تمھارا مال تمھارے باپ کا ہے

(۲۷) اونٹ کے گوشت سے وضو کرنے کی حدیث

(۲۸) عمامہ پر مسح کرنے کی حدیث

(۲۹) صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھنے والے کے لئے نماز کو دوبارہ پڑھنے کی حدیث۔

(۳۰) جمعہ کے دن امام کے خطبہ کی حالت میں مسجد میں داخل ہونے والے کے لئے تحیۃ المسجد پڑھنے والی حدیث

(۳۱) نماز جنازہ غائبانہ والی حدیث

(۳۲) نماز میں زور سے آمین کہنے والی حدیث

(۳۳) یہ حدیث کہ باپ کا اپنے بیٹے کو ہبہ کر کے واپس لے لینا جائز ہے۔ دوسرے کے لئے جائز نہیں۔

(۳۴) آج زوال کے بعد عید کا دن معلوم ہونے پر اگلے دن عید کے لئے نکلنے والی حدیث۔

(۳۵) طفل شیر خوار (یعنی ایسا دودھ پینے والا لڑکا جو ابھی کھانا نہ کھاتا ہو) کے پیشاب پر چھینٹا مارنے والی حدیث

(۳۶) قبر پر نماز جنازہ پڑھنے کی حدیث

(۳۷) حضرت جابر کے اونٹ بیچنے اور اس پر مدینہ تک سوار ہو کر آنے کی شرط والی حدیث۔

(۳۸) درندوں کے چمڑے استعمال کرنے کی ممانعت والی حدیث

(۳۹) یہ حدیث کہ کوئی اپنے پڑوسی کو اپنی دیوار میں میخ گاڑنے سے نہ روکے۔

(۴۰) یہ حدیث کہ جب کوئی مسلمان ہو اور اس کے نکاح میں دو بہنیں ہوں تو دونوں میں سے جسے چاہے پسند کرلے۔

(۴۱) سواری پر وتر پڑھنے والی حدیث

(۴۲) درندوں میں سے ہر ذی ناب (دانت سے پھاڑنے والے) کی حرمت والی حدیث

(۴۳) یہ حدیث کہ نماز میں دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھنا سنت ہے [1]

(۴۴) یہ حدیث کہ ایسی نماز نہیں ہوتی جس میں نمازی اپنے رکوع اور سجدے میں اپنی پیٹھ سیدھی نہ کرتا ہو۔

(۴۵) نماز میں رکوع جاتے اور اس سے اٹھتے وقت دونوں ہاتھوں کو اٹھانے والی حدیثیں۔

(۴۶) نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنے والی حدیثیں۔

(۴۷) یہ حدیث کہ نماز میں تمام چیزوں کو حرام کرنے والی چیز تکبیر اور حلال کرنے والی چیز سلام ہے۔

(۴۸) نماز میں بچی کو اٹھانے والی حدیث۔ (۴۹) عقیقہ کی حدیثیں۔

(۵۰) یہ حدیث کہ اگر کوئی تمھارے پاس تمھاری اجازت کے بغیر آجائے۔

(۵۱) بلال کے رات میں اذان دینے کی حدیث۔

(۵۲) جمعہ کے دن روزہ رکھنے کی ممانعت کی حدیث

(۵۳) سورج گہن اور چاند گہن کی نماز اور نماز استسقاء والی حدیث

(۵۴) نر کے بیج کی حدیث۔

(۵۵) یہ حدیث کہ جب محرم ہو جائے تو اس کا سر ڈھکا جائے گا نہ اس کو خوشبو لگائی جائے گی۔

میں کہتا ہوں کہ کل کی کل حدیثیں یا اکثر حدیثیں اور اس سے کئی گنا زیادہ حدیثیں مذکورہ بالا قواعد و اصول اور قیاس کی وجہ سے چھوڑ دی گئی ہیں، ان میں

---

[1] مالکیہ جو ارسال (یعنی نماز میں ہاتھ لٹکا کر چھوڑے رہنا) کے قائل ہیں اسکی مخالفت کرتے ہیں۔

سے بعض وہ ہیں جن کو ابن حزم نے ان لوگوں کی طرف منسوب کیا ہے جنھوں نے عمل اہل مدینہ کی وجہ سے چھوڑ دیا ہے۔

ان لوگوں کی حدیث کی مخالفت کی چند اور مثالیں دیکھئے۔ انھیں میں سے ان حدیثوں کی مخالفت ہے۔

(۱) نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی مغرب میں سورۂ طور پڑھنے اور اخیر عمر میں سورۂ مرسلات پڑھنے والی حدیث۔

(۲) نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا فاتحہ کے بعد آمین کہنا۔

(۳) نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا اذا السماء انشقت میں سجدہ کرنا۔

(۴) نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا لوگوں کو بیٹھ کر نماز پڑھانا اور لوگوں کا آپ کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھنا۔ اس پر لوگوں نے کہا کہ جو اس طرح نماز پڑھے گا۔ اس کی نماز باطل ہے۔

(۵) یہ حدیث کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو نماز پڑھانے کی ابتدا کی نبی صلے اللہ علیہ وسلم آئے اور ابوبکر رض کے بازو میں بیٹھ گئے اور آپ نے لوگوں کو نماز پوری کرائی۔ لوگوں نے کہا کہ اس پر کسی کا عمل نہیں ہے۔ جو شخص اس طرح پڑھے گا اس کی نماز باطل ہے۔

(۶) ظہر اور عصر کی نماز (مدینہ میں) بلا کسی خوف اور کسی سفر کے اکٹھا پڑھنے کی حدیث [1]

(۷) یہ حدیث کہ آپ کے پاس ایک بچہ لایا گیا۔ اس نے آپ کے کپڑے پر پیشاب کر دیا

---

[1] یہ اس وقت کی بات ہے جب کچھ حرج پایا جائے جیسا کہ ابن عباس نے ایک سوال کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم اس سے کیا چاہتے تھے کے جواب میں بتایا کہ آپ کی امت حرج میں نہ پڑے

آپ نے پانی مانگا اور کپڑے پر چھینٹا مار لیا اسے دھلا نہیں۔

⑧ یہ حدیث کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم عید کی نماز میں سورۂ قٓ اور سورہ اقتربت الساعۃ پڑھتے تھے۔

⑨ یہ حدیث کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے سُہیل بن بیضار کی نماز جنازہ مسجد میں پڑھی

⑩ یہ حدیث کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دو یہودیوں کو جنھوں نے زنا کیا تھا رجم کر دیا۔ لوگوں نے کہا کہ یہودیوں کا رجم کرنا جائز نہیں ہے۔

⑪ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بحالت احرام پچھنا لگوانے والی حدیث۔

⑫ خانۂ کعبہ کا طواف کرنے سے پہلے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا حلال ہونے کے لئے خوشبو لگوانے کی حدیث [1]

⑬ نماز میں دو سلام کی حدیثیں۔

اس کے علاوہ بے شمار ایسی حدیثیں ہیں جن میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ اگر ان حدیثوں کا کوئی تتبع کرے تو ابن حزم رہ کے بقول ان کی تعداد ہزاروں تک پہونچ سکتی ہے۔

گذشتہ فصلوں میں حدیث پر قیاس وغیرہ کے مقدم کرنے کی بحث آچکی ہے۔ اب آگے دو فصلوں کے اندر کتاب وسنت اور مذکورہ تصریحات کی روشنی میں دو دوسری چیزوں پر بحث آرہی ہے تاکہ حقیقت حال واضح ہو جائے۔

---

[1] ابن حزم "الاحکام فی اصول الاحکام" ۲/۱۰۰ - ۱۰۵ -

تیسری فصل

عقائد اور احکام دونوں میں خبر واحد کی حجیت

جن لوگوں کا خیال ہے کہ خبر واحد سے عقیدہ نہیں ثابت ہو سکتا وہ ایک ہی وقت میں یہ بھی کہتے ہیں کہ شرعی اور عملی احکام خبر واحد سے ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ عقائد اور اعمال کے درمیان تفریق کرتے ہیں۔ قرآن وسنت کے جو دلائل اوپر ذکر کئے جا چکے ہیں کیا ان میں یہ تفریق موجود ہے؟ نہیں اور ہزار بار نہیں، بلکہ وہ تو اپنے اطلاق اور عمومیت کے لحاظ سے عقائد کو بھی شامل ہیں اور عقائد کے اندر نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو لازم کرتے ہیں۔ کیونکہ "امر" کا جو لفظ درج ذیل آیت میں آیا ہوا ہے وہ بلاشبہ عقائد کو بھی عام ہے (آیت یہ ہے)

وما کان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی اللہ ورسوله امرا ان یکون لھم الخیرة من امرھم۔ (الاحزاب ۳۶)

جب اللہ اور اس کے رسول کسی "امر" کا فیصلہ کر دیں تو کسی مومن مرد اور کسی مومنہ عورت کیلئے اپنے "امر" کے اختیار کرنے کا کوئی حق باقی نہیں رہ جاتا ہے۔

اسی طرح اللہ کا، اپنے نبی کی فرمانبرداری کا حکم دینا، ان کی نافرمانی سے روکنا، ان کی مخالفت سے ڈرانا اور ان مومنوں کی تعریف کرنا جو اس وقت "سمعنا" اور "اطعنا" (ہم نے سن لیا اور مان لیا) کہتے ہیں جب انھیں اللہ اور رسول سے فیصلہ کرانے کی دعوت دی جاتی ہے اس قسم کی جتنی بھی چیزیں ہیں سب کی سب اس بات پر دلیل ہیں کہ عقائد اور اعمال (دونوں چیزوں) میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان "ما آتاکم الرسول

فخذوہ "" (الحشر۔ ۷) (رسول تمھیں جو کچھ دیں اسے مضبوطی سے تھام لو) کے اندر "ما" الفاظ عموم میں سے ہے جیسا کہ معلوم ہے۔ اب اگر آپ ان لوگوں سے دلیل مانگئے جو کہتے ہیں کہ احکام اور اعمال کا خبر واحد سے اخذ کرنا واجب ہے، تو وہ انھیں گذری ہوئی آیتوں اور کچھ دوسری ایسی آیتوں سے استدلال کریں گے جن کو ہم نے اختصار کے پیش نظر ذکر نہیں کیا ہے۔ ان تمام آیتوں کو امام شافعی نے اپنی کتاب "الرسالہ" کے اندر بالاستیعاب ذکر کیا ہے، جو چاہے اس کی طرف مراجعت کرلے ان چیزوں کے ہوتے ہوئے بھی آخر کس بنیاد پر انھوں نے عقیدے کو، ان چیزوں سے مستثنیٰ کر دیا جن کا (اخبار آحاد سے) اخذ کرنا آیات کے ذریعہ واجب ہے، حالانکہ عقیدہ بھی آیتوں کے عموم میں داخل تھا۔ ان آیتوں کو اعمال کے ساتھ (عقیدے کو چھوڑ کر) مخصوص کرنا تخصیص بلا مخصص ہے جو باطل ہے اور جس چیز سے باطل لازم آتا ہو وہ خود بھی باطل ہوتی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

لوگوں کو اولاً ایک بات کے اندر شبہ ہوا تھا جو دھیرے دھیرے عقیدہ بن گیا۔ شبہ اس بات کا تھا کہ خبر واحد صرف ظن کا فائدہ دیتی ہے۔ اس ظن سے ان کی مراد طبعاً راجح ظن ہے اور احکام کے باب میں ظن راجح پر عمل کرنا بالاتفاق واجب ہے البتہ اَنْ دیکھی چیزوں اور علمی مسئلوں کے سلسلے میں یہ لوگ استدلال کو جائز نہیں قرار دیتے اور عقیدے سے مراد یہی چیزیں ہیں۔

اگر ہم ان کی یہ بات مان لیں کہ خبر واحد سے صرف ظن کا فائدہ ہوتا ہے تو پھر سوال کریں گے کہ آپ نے (عقیدہ اور عمل کے حکم میں) تفریق کہاں سے کی اور اس بات پر کیا دلیل ہے کہ خبر واحد سے عقیدہ اخذ کرنا جائز نہیں ہے۔

بعض معاصرین، اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں جو مشرکوں کے بارے میں نازل ہوا ہے۔

ان یتبعون الا الظن وما تھوی الانفس (النجم - ۲۳)	وہ صرف ظن اور خواہش نفس کی پیروی کرتے ہیں۔
اور "ان الظن لا یغنی من الحق شیئا (النجم - ۲۸)	حق کے مقابل میں ظن کچھ بھی فائدہ نہیں پہونچا سکتا۔

یہ لوگ اس طرح کی اور دوسری ان آیتوں سے استدلال کرتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اتباع ظن کے سلسلے میں مشرکوں کی مذمت کی ہے یہ لوگ استدلال کرتے ہوئے یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ان آیتوں کے اندر جس ظن کا ذکر ہوا ہے وہ ویسا ظن غالب نہیں ہے جس کا فائدہ خبر واحد سے حاصل ہوتا ہے اور جس پر عمل کرنا بالاتفاق واجب ہے بلکہ یہاں ظن سے مراد وہ شک اور تردد ہے جسے خرص اور اندازہ کہتے ہیں چنانچہ "النہایہ" اور "لسان العرب" وغیرہ کتب لغت میں ہے۔

"الظن" الشک یعرض لك فی الشیء فتحققه وتحکم به"	ظن اس شک کو کہتے ہیں جو تمھیں کسی چیز کے سلسلے میں پیش آجاوے۔ پھر تم اس کی تحقیق کرو اور حکم لگاؤ۔

یہی وہ ظن ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کی مذمت کی ہے۔ مشرکوں ہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

ان یتبعون الا الظن وان ھم الا یخرصون (الانعام - ۱۱۶)	وہ صرف ظن کی پیروی کرتے اور صرف اندازے کرتے ہیں۔

یہاں ظن کو خرص بتایا گیا ہے جس میں صرف اندازہ اور تخمینہ ہوتا ہے۔ جس ظن کی بنیاد پر ان آیتوں میں مشرکوں کی مذمت کی گئی ہے اگر وہ ظن غالب ہوتا جیسا کہ استدلال کرنے والوں کا خیال ہے تو اعمال کے باب میں بھی دو چیزوں کی بنیاد پر اس سے استدلال جائز نہ ہوتا۔

اول :- یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر مطلقاً نکیر کی ہے اور انکار میں احکام کو چھوڑ

کہ عقیدے کی تخصیص نہیں کی ہے۔
دوم :- یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بعض آیات میں یہ تصریح کی ہے کہ اس نے جس ظن کے سلسلے میں مشرکوں پر نکیر کی ہے۔ وہ احکام کو بھی شامل ہے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا صریح فرمان سنئے۔

سیقول الذین اشرکوا لو شاء اللہ ما اشرکنا ولا آباونا (فھذا عقیدۃ) ولا حرمنا من شی (و ھذا حکم) کذلک کذب الذین من قبلھم حتی ذاقوا باسنا قل ھل عندکم من علم فتخرجوہ لنا ؟ ان تتبعون الا الظن وان انتم الا تخرصون ٥ (الانعام - ۱۴۸)

عنقریب مشرک کہیں گے اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا شرک نہیں کرتے (یہ عقیدہ ہوا) اور ہم کوئی چیز حرام نہیں کرتے (یہ حکم ہوا) ایسے ہی ان سے پہلے کے لوگوں نے تکذیب کی تھی پھر تو انھوں نے میرا عذاب چکھ لیا۔ آپ پوچھئے کہ تمھارے پاس کوئی دلیل ہے ؟ ہے تو پیش کرو، تم لوگ صرف ظن کی پیروی کرتے ہو اور صرف اندازے کرتے ہو۔

اس آیت کی تفسیر درج ذیل آیت سے ہوتی ہے۔

قل انما حرم ربی الفواحش ما ظھر منھا وما بطن والاثم والبغی بغیر الحق وان تشرکوا باللہ مالم ینزل بہ سلطانا وان تقولوا علے اللہ ما لا تعلمون ٥ (الاعراف - ۳۳)

آپ فرما دیجئے کہ میرے رب نے تمام ظاہری و باطنی برائیوں، گناہوں ناحق مظالم، اللہ کے ساتھ شرک، جس کے لئے اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور بغیر جانے اللہ کے سلسلے میں کوئی بات کہنے کو حرام قرار دے دیا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ جس ظن سے اخذ اور استدلال جائز نہیں ہے وہ لغوی ظن ہے جو اندازہ، تخمینہ اور بلا علم بات کہنے کے مرادف ہے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ احکام کے سلسلے میں اس سے کوئی حکم لگانا ویسے ہی حرام ہے جیسے عقائد کے سلسلے

میں اس سے استدلال کرنا دونوں میں کچھ فرق نہیں۔

جب بات اس طرح ہے تو ہمارا گذشتہ قول اپنی ہی جگہ پر رہا کہ گذشتہ وہ تمام حدیثیں اور آیتیں جو احکام کے باب میں اخبار آحاد سے استدلال کے وجوب پر دلالت کرنے والی ہیں وہ اپنی عمومیت کے لحاظ سے عقائد کے باب میں بھی خبر واحد سے استدلال کے وجوب پر دلالت کرتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خبر واحد سے اخذ کے وجوب کے سلسلے میں عقائد اور احکام کے درمیان تفریق اسلام کے اندر ایک دخیل فلسفہ ہے جو سلف صالحین اور ان ائمہ اربعہ کے یہاں نہیں پایا جاتا جن کی تقلید عصر حاضر کے اکثر مسلمان کرتے ہیں۔

خبر واحد کے حجت نہ ہونے کا عقیدہ وہم وخیال کی بنیاد پر ہے

آج ایک صاحب شعور مسلمان کے لئے اس چیز سے بڑھ کر زیادہ تعجب خیز اور کچھ نہیں جسے اکثر واعظین اور اہل قلم بار بار دہراتے رہتے ہیں۔ جب کبھی بھی اپنی ایمانی کمزوری کی وجہ سے کسی حدیث کی تصدیق نہیں کر پاتے گو وہ حدیث محدثین کے نزدیک متواتر ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً آخری زمانے میں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی حدیث (اس موقعہ پر) وہ لوگ یہ کہہ کر اپنی کمزوری کو چھپاتے ہیں کہ "خبر واحد سے عقیدہ نہیں ثابت ہوتا"

مقام تعجب تو یہ ہے کہ ان کی یہ بات بھی فی نفسہٖ عقیدہ ہے جیسا کہ میں نے اس مسئلے میں اپنے ساتھ ایک بحث کرنے والے سے کہا تھا۔ چونکہ ان کی یہ بات خود ایک دعویٰ ہے اس لئے انھیں اس کی صحت کے اوپر قطعی دلیل پیش کرنی ضروری ہے ورنہ ان کی بات میں تناقض لازم آئے گا لیکن ان کے پاس صرف دعویٰ ہے دلیل کہاں ہے؟ اور اس طرح کی چیز اعمال کے باب میں بھی مردود ہوتی ہے عقیدہ کے سلسلے میں کیوں نہ ہوگی۔ اس کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ عقیدہ کو ظن راجح سے ماننے سے بھاگے تو وہ اس سے کہیں زیادہ بری چیز میں

پڑگئے، وہ ہے ظن مرجوح سے عقیدہ کی بات مان لینا۔ اہل بصیرت عبرت حاصل کریں
یہ چیز صرف اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ کتاب وسنت کے سمجھنے اور ان کے نور سے براہ راست ہدایت حاصل کرنے سے دور رہتے اور اسے چھوڑ کر اقوال رجال میں مشغول رہتے ہیں۔

خبر واحد سے عقیدہ حاصل کرنے کے وجوب پر دلیلیں

ابھی چند ایسی اور بھی دلیلیں ہیں جو خبر واحد سے عقیدہ اخذ کرنے کے وجوب پر ماسبق دلیلوں سے زیادہ خاص ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے کچھ کا ذکر کرنا اور ان کی وجہ دلالت کو بیان کرنا ضروری ہے

پہلی دلیل :-

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے :-

وما کان المومنون لینفروا کافۃ فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون (التوبہ - ۱۲۲)	تمام مومنوں کے لئے نکل پڑنا ممکن نہیں تھا تو ہر جماعت سے ایک ٹولی کیوں نہیں نکلی تاکہ وہ دین کی سمجھ حاصل کرتی اور قوم کے پاس کر آتی تو انھیں ڈراتی تاکہ لوگ بچتے۔

یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مومنوں کو اس بات پر ابھارا ہے کہ ان میں سے ایک ٹولی نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس نکل آتی تاکہ آپ سے اپنا دین سیکھتی اور دین کی سمجھ حاصل کرتی۔ اور اس میں تو کچھ شبہ نہیں ہے کہ یہ صرف ان چیزوں کے ساتھ خاص نہیں جنھیں فروغ اور احکام کا نام دیا جاتا ہے بلکہ عام ہے۔ قطعی بات تو یہ ہے کہ معلم اور متعلم ابتدا اسی چیز سے کریں گے جو سیکھنے اور سکھانے کے لئے جتنی ہی زیادہ اہم ہوگی اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ عقائد احکام سے اہم ہیں چنانچہ یہی وجہ ہے جس کی بنیاد پر کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ خبر واحد سے عقائد ثابت نہیں ہو سکتے

ان لوگوں کے اس خیال کو یہ آیت کریمہ باطل قرار دیتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں جہاں "طائفہ" (ٹولی) کو عقائد اور احکام کے سیکھنے اور سمجھنے کی طرف رغبت دلائی ہے وہیں اس چیز پر انھیں توجہ دلائی ہے کہ وہ قوم کے پاس لوٹ کر آئیں تو انھیں ان تمام عقائد اور احکام سے ڈرائیں جنھیں وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیے ہیں۔ اور "طائفہ" عربی زبان میں "ایک" اور اس سے زیادہ پر بولا جاتا ہے۔ اب اگر خبر واحد (ایک آدمی کی اطلاع) عقیدہ اور عمل دونوں میں حجت نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ طائفہ کو تبلیغ کرنے کے لئے اس عمومی تعلیل کے ساتھ تحریض نہ کرتا کہ "لعلهم يحذرون" (تاکہ لوگ بچیں) جو اس سلسلے میں صریح ہے کہ علم یقینی ایک آدمی کے ڈرانے سے بھی حاصل ہوتا ہے کیونکہ یہ آیت آیات تشریعی اور آیات تکوینی کی طرح سے ہے۔ لعلهم يتفكرون (تاکہ لوگ غور کریں) لعلهم يعقلون (تاکہ لوگ سمجھیں) لعلهم يهتدون (تاکہ لوگ ہدایت پائیں)

اس طرح مذکورہ بالا آیت اس بات کی دلیل ہے کہ عقیدہ اور احکام کی تبلیغ کے سلسلے میں خبر واحد حجت اور دلیل ہے۔

دوسری دلیل :- اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ولا تقف ما ليس لك به علم (الاسراء - ۳۶) آپ اس چیز پر اعتماد نہ کیجئے جس کے بارے میں آپ کو علم نہیں ہے یعنی آپ اس کی پیروی نہ کیجئے اور اس پر عمل نہ کیجئے اور یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ مسلمان صحابۂ کرام کے زمانہ ہی سے برابر ایک آدمی کی اطلاع پر اعتماد کرتے رہے۔ اس پر عمل کرتے رہے اور اس کے ذریعہ غیبی امور اور اعتقادی حقائق۔ مثلاً ابتدائے تخلیق اور علامات قیامت، کو ثابت کرتے رہے بلکہ ایک ہی آدمی کی خبر کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے لئے صفات بھی ثابت کرتے رہے۔ اگر خبر واحد سے علم کا فائدہ حاصل نہ ہوتا اور عقیدہ ثابت نہ ہو سکتا تو صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ دین وغیرہ تمام لوگوں کے لئے لازم آتا ہے کہ انھوں نے ایسی چیز

پر اعتماد کیا ہے جس کے بارے میں انھیں علم نہیں تھا جیسا کہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے "مختصر الصواعق ۲ ر ۳۹۶" میں فرمایا ہے حالانکہ اسے کوئی بھی مسلمان نہیں کہتا۔

تیسری دلیل :-

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

یاایھا الذین آمنوا ان جاءکم فاسق بنباء فتبینوا (الحجرات ۔۶) — اے مومنو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی اطلاع لائے تو تحقیق حال کر لو۔

ایک قرأت میں "فتثبتوا" ہے یعنی ٹھہر جاؤ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر عادل آدمی کوئی خبر لائے تو یہ قابل اعتماد دلیل ہو گی، یہاں توقف نہیں اختیار کیا جائے گا بلکہ فوراً اس پر عمل کیا جائے گا۔ چنانچہ علامہ ابن القیم رحمہ اللہ تعالیٰ اعلام الموقعین ۲ ر ۳۹۴) میں فرماتے ہیں "یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ خبر واحد کو قبول کیا جائے گا۔ اور توقف کی ضرورت نہیں ہو گی۔ اگر ایک آدمی کی خبر سے علم کا فائدہ حاصل نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ علم حاصل ہونے تک توقف کا حکم دیتا۔ اس سلسلے میں یہ بھی دلیل ہے کہ سلف صالحین اور ائمہ اسلام برابر یہ کہتے رہے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایسا کہا۔ ایسا کیا، اس چیز کا حکم دیا اور اس چیز سے روکا۔ یہ چیز ان کے کلام سے بالضرورہ ظاہر ہے۔ صحیح بخاری میں متعدد جگہوں پر ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، صحابہ کرام کی بہت سی حدیثیں ہیں کہ ان میں سے ایک کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حالانکہ یہ بات انھوں نے کسی صحابی سے سنی ہے۔ یہ قائل کی طرف سے شہادت ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف جس قول یا فعل کی نسبت کی گئی ہے اس پر قطعی حکم ہے اگر ایک آدمی کی خبر سے علم یقینی کا فائدہ نہ حاصل ہو تو مذکورہ بات کہنے والا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بغیر علم کے شہادت دینے والا مانا جائے گا۔

چوتھی دلیل :- نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی سنت، خبر واحد سے

استدلال کرنے پر دلالت کرتی ہے۔

جس عملی طریقے پر نبی صلے اللہ علیہ وسلم رہے اور آپ کی حیات میں اور آپ کی وفات کے بعد آپ کے ساتھی رہے اس سے بھی قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ خبر واحد سے عقیدہ اور عمل کے اثبات کے درمیان کچھ فرق نہیں اور یہ بھی کہ خبر واحد ان تمام چیزوں کے سلسلے میں مستقل حجت ہے۔ مجھے اس سلسلے میں جو صحیح حدیثیں مل سکی ہیں ان شاء اللہ ان میں سے چند کو ابھی اور ذکر کروں گا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ اپنی صحیح بخاری (۸/۱۳۲) کے اندر فرماتے ہیں۔

"ان چیزوں کا باب جو اذان، نماز، روزہ اور تمام فرائض اور احکام کے متعلق ایک سچے آدمی کی خبر کے جائز ہونے، اور اللہ تعالیٰ کے قول۔

فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة	ہر جماعت سے ایک ٹولی (طائفہ) کیوں نہیں
لیتفقهوا فی الدین ولینذروا	نکلی تاکہ وہ دین کی سمجھ حاصل کرتی اور
قومهم اذا رجعوا الیهم	قوم کے پاس لوٹ کر آتی تو انھیں ڈراتی
لعلهم یحذرون ○ (التوبہ-۱۲۲)	تاکہ لوگ بچتے"

کے بارے میں آئی ہیں۔ طائفہ کا اطلاق ایک آدمی پر ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وان طائفتان من المومنین اقتتلوا ○ (الحجرات-۹) اگر مومنوں کے دو طائفہ (ٹولیاں) آپس میں لڑ پڑیں۔

اب اگر دو آدمی لڑ پڑیں تو وہ بھی آیت کے مفہوم میں داخل ہوں گے نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

ان جاءکم فاسق بنباء فتبینوا	اگر کوئی فاسق کوئی خبر لائے تو تحقیق
(الحجرات - ۶)	حال کر لو۔

اس کے باوجود نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے عالموں کو مختلف علاقوں میں یکے بعد دیگرے کیونکر بھیجا ؟ ساتھ ہی یہ بھی کہ اگر کسی سے چوک ہو جائے تو حدیث

کی طرف مراجعت کی جائے۔

اس طرح باب باندھنے کے بعد امام بخاری نے باب کے اندر ذکر کردہ خبر واحد کے جواز، پر دلیل قائم کرتے ہوئے کئی حدیثیں ذکر کی ہیں۔ جواز سے ان کی مراد بایں طور قول اور عمل کا جواز ہے کہ خبر واحد (دونوں چیزوں کے لئے) حجت ہے۔ میں ان حدیثوں میں سے چند کو ذکر کر رہا ہوں۔

اوّل :- حضرت مالک بن حویرث سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ ہم سب نوجوان اور ہم عمر تھے۔ آپ کے پاس تقریباً بیس دن قیام رہا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بڑے مہربان اور رحم دل تھے۔ آپ کو جب معلوم ہوا کہ ہمیں اپنے گھر والوں سے ملنے کی خواہش ہو رہی ہے یا رغبت ہو رہی ہے تو پوچھا کہ ہم اپنے پیچھے کن لوگوں کو چھوڑ کر آئے ہیں؟ ہم نے بتایا تو آپ نے فرمایا اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ جاؤ۔ انھیں میں قیام کرو۔ انھیں سکھاؤ اور بتاؤ اور مجھے جس طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ اسی طرح نماز پڑھو"

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان نوجوان میں سے ہر ایک کو حکم دیا ہے کہ ہر ایک اپنے گھر والوں کو تعلیم دے اور تعلیم عقیدہ کو بھی شامل ہے بلکہ وہ سب سے پہلی چیز ہے جو عمومیت میں داخل ہوتی ہے۔ اگر ایک آدمی کی خبر سے دلیل نہ بن پاتی تو اس حکم کا کوئی معنیٰ ہی نہیں رہ جاتا۔

دوم :- حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ اہل یمن نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا ہمارے ساتھ ایک ایسا آدمی بھیج دیجئے جو ہمیں سنت اور اسلام سکھائے۔ حضرت انس کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول نے ابو عبیدہ کے ہاتھ کو پکڑا اور کہا یہ اس امت کے امین ہیں"" (مسلم، ۲۹۷) بخاری مختصراً۔

میں کہتا ہوں اگر ایک آدمی کی خبر سے حجت قائم نہ ہو سکتی تو اللہ کے رسول ابو عبیدہ کو اہل یمن کے ساتھ اکیلا نہیں بھیجتے۔

اسی طرح کی بات اس سلسلے میں بھی کہی جا سکتی ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اہل یمن کے پاس بار بار بھیجا ہے یا یہ کہ مختلف صحابۂ کرام کو مختلف جگہوں پر بھیجا ہے مثلاً علی بن ابی طالب۔ معاذ بن جبل اور ابو موسیٰ اشعری ہیں۔ ان لوگوں کی حدیثیں صحیحین اور ان کے علاوہ اور دوسری کتابوں میں موجود ہیں۔

اس بات میں تو کوئی شک و شبہ نہیں کہ یہ لوگ جن لوگوں کے پاس بھیجے گئے تھے ان لوگوں کو منجملہ اور چیزوں کے عقائد بھی سکھاتے تھے اگر ان لوگوں کی باتیں ان قوموں کے لئے حجت نہ ہوتیں تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کو فرداً فرداً نہیں بھیجتے اس لئے کہ یہ لغو چیز تھی۔ جس سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بچتے۔ یہی بات امام شافعی نے الرسالہ ص ۴۱۲ میں یوں کہی ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کسی کو اپنا حکم دے کر صرف اسی صورت میں بھیج سکتے تھے کہ قوموں کے لئے تبشیر و تنذیر کی ہر بات پر دلیل قائم ہو کہ وہ ان کے واسطے سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہر بات کو قبول کریں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس بات پر قادر تھے کہ ان قوموں کے پاس بھیج دئے جاتے اور ان کو بالمشافہ باتیں بتا دیتے یا ان کے پاس کئی آدمیوں کو بھیج دیتے حالانکہ آپ نے صرف ایک ایسے آدمی کو بھیجا جسے لوگ سچا سمجھتے تھے،،

سوم :۔ حضرت عبد اللہ بن عمر سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ لوگ قباء کے اندر فجر کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور کہا۔ رات میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل ہوا ہے اس میں آپ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ کعبہ کو قبلہ بنالیں۔ یہ سن کر ان لوگوں نے کعبہ کا استقبال کر لیا۔ حالانکہ ان کے چہرے شام کی طرف تھے وہ کعبہ کی طرف گھوم گئے (بخاری۔ مسلم)

یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے استقبال بیت المقدس کے وجوب جیسی قطعی اور یقینی چیز کے نسخ کے بارے میں صرف ایک آدمی کی اطلاع

مان لی، اور اسی کے کہنے کی بنیاد پر بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کی طرف رخ کر لیا اگر ان کے نزدیک ایک شخص کی خبر حجت نہ ہوتی تو قبلۂ اول جیسی قطعی چیز کے خلاف اس کے کہنے سے نہیں کرتے۔ علامہ ابن القیم فرماتے ہیں۔

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان پر نکیر نہیں فرمائی بلکہ ایسا کرنے پر انھیں مبارکبادی پیش کی گئی۔

چہارم: ۔ حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں۔ میں نے ابن عباس سے کہا کہ نوف بکالی کہتے ہیں کہ موسیٰ صاحب خضر، موسیٰ بنی اسرائیل نہیں ہیں۔ ابن عباس نے کہا دشمن خدا نے جھوٹ کہا مجھے ابی بن کعب نے بتایا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا تو موسیٰ اور خضر کی کچھ ایسی گفتگو نقل کی جس سے پتہ چلتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام صاحب خضر ہیں۔ بخاری اور مسلم نے تفصیل سے روایت کیا ہے لیکن امام شافعی نے اسی طرح اختصار کیا ہے اور کہا ہے۔

(۴۴۲ / ۱۲۱۹)

امام شافعی کا خبر واحد سے عقیدہ کا اثبات

کہ ابن عباس اپنے تفقہ اور پرہیزگاری کے باوجود ابی بن کعب کی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے نقل کردہ خبر کا صرف اثبات نہیں کرتے بلکہ اسی کی بنیاد پر ایک مسلمان آدمی کو جھوٹا بتاتے ہیں کیونکہ ابی بن کعب نے انھیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیث بیان کی تھی جس میں موسیٰ بنی اسرائیل کے صاحب خضر ہونے پر دلالت پائی جاتی تھی۔"

میں کہتا ہوں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ قول اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اخبار آحاد سے استدلال کرنے میں عقیدہ اور عمل کے مابین کوئی تفریق نہیں کرتے ہیں کیونکہ موسیٰ علیہ السلام ہی کا صاحب خضر ہونا کوئی عملی حکم نہیں، علمی مسئلہ ہے جیسا کہ واضح ہے۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ آپ "الرسالہ" میں عنوان

" خبرِ واحد کے اثبات کی دلیل " کے تحت ایک اہم فصل لائے ہیں اور اس کے اندر کتاب وسنت کی بہت سی دلیلیں پیش کی ہیں (ص ۴۰۱ - ۴۵۳) یہ دلیلیں یا تو مطلق ہیں یا عام، جو اپنی عمومیت اور اطلاق کی وجہ سے خبرِ واحد کی، عقیدہ کے لئے بھی حجیت کو شامل ہیں اور عقیدہ کے سلسلے میں ان کی اپنی باتیں بھی عام ہیں۔ آپ نے اس بحث کو اس طرح ختم کیا ہے۔

" خبرِ واحد کے اثبات کے لئے بہت سی مختلف حدیثیں ہیں جن میں سے یہی چند کافی ہیں۔ ہمارے سلف کا اور ان کے بعد سے اب تک کے لوگوں کا یہی طریقہ رہا ہے۔ اسی طرح سے مختلف ممالک کے جن اہل علم کے بارے میں ہم سے بیان کیا گیا یونہی بیان کیا گیا ہے۔"

آپ کا یہ قول عام ہے اسی طرح آپ کا وہ قول بھی عام ہے جو ص ۴۵۷ پر ہے کہ " اگر کسی شخص کے لئے خواص کے علم کے متعلق یہ کہنا جائز ہو کہ "متقدمین اور متاخرین تمام مسلمانوں نے خبرِ واحد کے اثبات اور اس سے علی الاطلاق استدلال پر اجماع کر لیا ہے اس وجہ سے کہ مسلمان فقہاء میں سے ایک بھی ایسا معلوم نہیں جس نے خبرِ واحد کا اثبات نہ کیا ہو " تو میرے لئے بھی ایسا کہنا جائز ہو گا، مگر میں یہ کہتا ہوں کہ " مسلمان فقہاء کے متعلق یہ بات مجھے معلوم نہیں ہے کہ انھوں نے خبرِ واحد کے اثبات میں اختلاف کیا ہو۔"

عقیدہ کیلئے خبرِ واحد کو دلیل نہ بنانا بدعت محدثہ ہے

خلاصہ یہ ہے کہ کتاب وسنت کے دلائل صحابہ کا عمل اور علماء کے اقوال ہماری گذشتہ وضاحت کے مطابق قطعی طور پر دلالت کرتے ہیں کہ حدیث آحاد سے، شریعت کے ہر باب میں استدلال واجب ہے خواہ وہ اعتقادیات سے متعلق ہو یا عملیات سے۔ اور ان دونوں کے درمیان تفریق ایسی بدعت ہے جو سلف کے یہاں نہیں ملتی یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن القیم

رحمہ اللہ (۲ ر ۴۱۲) میں فرماتے ہیں "یہ تفریق اجماع امت سے باطل ہے کیونکہ امت ہمیشہ ان حدیثوں سے علمی خبروں (یعنی عقائد) اور عملی مطالبوں پر استدلال کرتی رہی اور ایسا کرنا ضروری بھی تھا۔ چونکہ عملی احکام کے اندر اللہ کے بارے میں یہ خبر ہوتی ہے کہ اس نے یہ چیز مشروع کی، اس چیز کو واجب کیا اور اسے دین بنانے پر خوش ہوا اس لئے اس کی شریعت اور اس کا دین اس کے اسماء وصفات کی طرف پلٹتا ہے۔ صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور محدثین اسماء وصفات قضاء وقدر اور اعمال واحکام کے مسائل میں برابر ان حدیثوں سے استدلال کرتے رہے ان میں سے کسی ایک سے بھی قطعاً یہ ثابت نہیں ہے کہ انھوں نے ان حدیثوں سے احکام کے مسائل میں استدلال کو جائز قرار دیا ہو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے اسماء وصفات کے بارے میں جائز نہ کیا ہو۔ آخر وہ سلف کہاں ہیں جنھوں نے دونوں چیزوں میں فرق کیا ہے؟ ہاں دونوں میں تفریق کرنے والوں کے سلف بعض ایسے متاخرین متکلمین ہیں جن کو ان چیزوں سے کوئی سروکار نہیں جو اللہ، اللہ کے رسول اور رسول کے ساتھیوں سے منقول ہیں۔ بلکہ وہ اس سلسلے میں اپنے دلوں کو کتاب وسنت اور اقوال صحابہ سے ہدایت یاب ہونے سے باز رکھتے ہیں اور متکلمین کے آراء اور متکلفین کے قواعد پر پورا انحصار کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن سے دونوں چیزوں میں تفریق کرنے کی بات معلوم ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے دعویٰ تو اس تفریق پر اجماع کا کر دیا حالانکہ یہ اجماع مسلمانوں کے کسی امام سے منقول ہے نہ صحابہ اور تابعین میں سے کسی ایک سے۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ یہ لوگ اس چیز کے درمیان صحیح فرق پیش کریں کہ دین کی کس بات کا خبر واحد سے ثابت کرنا جائز ہے اور کس کا نہیں جھوٹ موٹ کی باتیں تو یہ لوگ بنالیں، صحیح فرق پیش کرنے کے لئے یہ کوئی راستہ ہی نہیں پا سکتے ہیں۔ مثلاً کوئی کہتا ہے کہ اصولیات علمی مسائل ہیں اور فروعات عملی مسائل (یہ باطل تفریق ہے کیونکہ علمیات سے دو چیزیں مطلوب

ہیں[1]۔ علم اور عمل ۔ اور عملیات سے بھی دو ہی چیزیں مطلوب ہیں علم اور عمل علمی مطلوب، حب قلب اور بغض قلب ہے ۔ حب قلب اس حق کے لئے ہوتا ہے جس کے اوپر خبر کی دلالت ہوتی ہے اور جس چیز پر وہ مشتمل ہوتی ہے اور بغض قلب اس باطل کے لئے ہوتا ہے جو اس خبر کے مخالف ہوتا ہے ۔ اس طرح عمل صرف عمل جوارح نہیں ہے بلکہ اعمال قلوب اعمال جوارح کے لئے اصل ہیں اور اعمال جوارح تابع ہیں ۔ کسی بھی علمی مسئلہ کو لیجئے اس کے پیچھے ایمان قلب، تصدیق قلب اور حب قلب ہوگا ۔ اور یہ عمل ہے بلکہ ایمان کے مسئلہ میں اصل عمل یہی چیز ہے جس پر بہت سے متکلمین نے دھیان نہیں دیا اور سمجھے کہ ایمان صرف تصدیق کا نام ہے، عمل کا نہیں یہ بڑی فاش اور نہایت قبیح غلطی ہے ۔ چنانچہ بہت سے کافروں کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے صدق کے سلسلے میں کچھ بھی شبہ نہیں تھا پورا یقین تھا لیکن اس تصدیق کے ساتھ عمل قلب یعنی آپ کی لائی ہوئی چیزوں سے محبت کرنا، اس کو پسند کرنا، اس کو چاہنا، اور اسے مسلسل کرنا (اگر محبوب کے جنس سے ہے ۔ مترجم) اور اس سے نفرت کرتے رہنا (اگر مبغوض کے جنس سے ہے ۔ مترجم) نہیں پایا گیا ۔ اس کو یونہی سی چیز نہ سمجھا جائے، یہ بہت اہم چیز ہے اس سے ایمان کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے ۔ بہر حال علمی مسائل عملی ہیں اور عملی مسائل علمی ۔۔ شارع نے متکلفین کے لئے عملیات کے اندر علم نہ رکھنے بلکہ صرف عمل کر لینے کو اور علمیات کے اندر عمل نہ کرنے بلکہ صرف علم رکھنے کو کافی نہیں سمجھا ہے"

علامہ ابن قیم کے بات سے ثابت ہوا کہ مذکورہ بالا تفریق سلف کے طریق کار کی مخالفت کی بنیاد پر، اجماع سے اور مذکور الصدر بہت سے دلائل کے خلاف ہونے کے ناطے سے باطل ہونے کے باوجود اس جہت سے بھی باطل ہے کہ تفریق کرنے والوں

---

[1] اصل میں "والمطلوب منہما امران" ہے ہم نے جو بات لکھی ہے وہ اقرب الی الصواب ہے ۔

کے یہاں عمل کے ساتھ علم اور علم کے ساتھ عمل کے شامل ہونے کا تصور نہیں ہے۔ یہ نہایت اہم نقطہ ہے جو ایک مومن کے لئے موضوع کو ٹھیک سے سمجھنے اور مذکورہ بالا تفریق کے یقیناً باطل ہونے کا اعتقاد رکھنے میں معاون ہو سکتا ہے۔

بہت سی اخبار آحاد کا علم اور یقین کا فائدہ پہونچانا

عقیدہ اور عمل کے درمیان تفریق کے بطلان کے بارے میں جو بحث و تحقیق گذری اس کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ خبر واحد صرف ظن راجح کا فائدہ دیتی ہے۔ یقینی اور قطعی علم کا نہیں۔

اس سلسلے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ بات علی الاطلاق مسلم نہیں بلکہ اس میں تفصیل ہے۔ جو اپنی جگہ میں مذکور ہے یہاں جتنا بتانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ خبر واحد بہت سے اوقات میں قطعی اور یقینی علم کا فائدہ پہونچاتی ہے اس میں سے وہ حدیثیں ہیں جنھیں امت میں تلقی بالقبول حاصل ہے۔ کچھ وہ حدیثیں ہیں جنھیں بخاری اور مسلم نے اپنی اپنی صحیح میں نکالا ہے اور ان پر کوئی تنقید نہیں ہوئی ہے۔ ان کی صحت قطعی ہے اور نظری۔ علم یقینی ان سے حاصل ہے جیسا کہ امام ابن صلاح نے اپنی کتاب علوم الحدیث (یعنی مقدمہ ابن صلاح) ص ۲۸-۲۹ میں اسے پورے وثوق کے ساتھ کہا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی مختصر (یعنی موجودہ کتاب الباعث الحثیث) میں اور ان سے پہلے شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے بعد علامہ ابن القیم الجوزیہ نے مختصر الصواعق ۲ر۳۸۳ میں اس کی تائید کی ہے اور کئی حدیثوں سے اس کی مثال دی ہے۔ انھیں میں سے ایک حدیث حضرت عمر کی ہے "انما الاعمال بالنیات" اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ ایک حدیث ہے۔ اذا جلس بین شعبها الاربع ثم جهدها فقد وجب الغسل" جب مرد عورت کے چاروں شاخوں (مراد دونوں ہاتھ اور دونوں پیر) کے درمیان بیٹھے پھر کوشش کرے تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث ابن عمر کی ہے۔ فرض رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ[۱] الفطر فی رمضان علے الصغیر والکبیر والذکر والانثیٰ،، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں صدقہ فطر کو چھوٹے بڑے، مرد اور عورت پر فرض کیا۔ اسی طرح اور بہت سی مثالیں ہیں۔

علامہ ابن القیم فرماتے ہیں (۲ / ۳۷۲) "شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔" یہ حدیث امت محمدیہ میں سے اولین وآخرین جمہور امت کے نزدیک علم یقینی کا فائدہ پہونچاتی ہے۔ سلف کے درمیان تو اس کے بارے میں کوئی نزاع سرے سے تھا ہی نہیں۔ خلف کے اندر بھی ائمہ اربعہ کے اصحاب میں سے بڑے فقہاء کا یہی مذہب ہے۔ یہ مسئلہ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی تمام مذاہب کی کتابوں میں منقول ہے۔ مثال کے طور پر حنفیہ میں سرخسی اور ابوبکر رازی۔ شافعیہ میں سے شیخ ابو حامد، ابو الطیب اور شیخ ابو اسحاق، مالکیہ میں سے ابن خویز منداد وغیرہ اور حنبلیہ میں سے قاضی ابو یعلی، ابن ابی موسیٰ اور ابو الخطاب وغیرہ اور متکلمین میں سے ابو اسحاق اسفرائینی، ابن فورک اور ابو اسحاق نظام کی کتابیں۔ اسے ابن صلاح نے ذکر کیا ہے۔ اس کی تصحیح کی ہے اور اس کو مختار قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے قائلین کی کثرت معلوم نہیں ہے تاکہ اسے تقویت دی جا سکے۔ ابن صلاح نے یہ قول صحیح دلیل کی بنیاد پر اختیار کیا ہے جن بزرگوں نے ان پر اعتراض کیا ہے گو وہ صاحب علم اور دیندار ہیں لیکن انھیں اس مسئلے میں پوری آگاہی نہیں ہے انھوں نے یہ سمجھا کہ ابو عمرو ابن العاص نے یہ بات کہہ کر جمہور سے الگ رائے قائم کی ہے۔ کریں کیا وہ بھی معذور ہیں کیونکہ وہ ان مسائل میں جو مرجع پاتے ہیں وہ ابن حاجب کی تحقیقات ہیں، اگر ایک درجہ اوپر آتے ہیں تو سیف آمدی اور

---

[۱] صلوٰۃ الفطر کے بجائے صدقۃ الفطر ہونا چاہیئے۔ مترجم ۱۲

ابن الخطیب تک پہونچتے ہیں اور اگر ان کی سند اور عالی ہوئی تو وہ غزالی، جوینی اور باقلانی تک پہونچتے ہیں۔

(آپ فرماتے ہیں کہ) جمیع محدثین شیخ ابو عمرو کے بیان کردہ مذہب پر ہیں۔ جمہور کے قول کے خلاف دلیل یہ ہے کہ امت کا خبر کو تصدیقاً اور عملاً ہاتھوں ہاتھ لینا سب کا اجماعی مسئلہ ہے اور امت ضلالت کے اوپر اکٹھی نہیں ہو سکتی مثلاً اگر وہ کسی عموم یا مطلق سے ثابت ہونے والی چیز پر، یا کسی حقیقت کے نام پر یا کسی قیاس سے ثابت ہونے والے چیز پر اکٹھی ہو جائے تو وہ خطا پر اکٹھی نہیں ہو سکتی اور اگر امت میں سے کوئی ایک اور صرف اسی شخص کو دیکھا جائے تو وہ خطا سے مامون نہیں ہو سکتا اس لئے کہ عصمت اجتماعی حیثیت سے ثابت ہوتی ہے جیسے کہ متواتر خبر کے اندر رواۃ میں سے ایک ایک کے لئے انفرادی حیثیت سے خطاء اور کذب کا صدور جائز ہے۔ لیکن کل کے مجموعے سے نہیں۔ اور یہ تو متعین ہے کہ پوری امت روایت کرنے اور رائے قائم کرنے میں خطاء سے محفوظ اور معصوم ہے (آپ فرماتے ہیں کہ) ایک ایک کی انفرادی باتیں اپنے شرائط کے اعتبار سے کبھی ظن کے درجہ میں ہوتی ہیں لیکن اگر قوت آگئی تو علم بن جاتی ہیں اور اگر ضعف آگیا تو وہ وہم اور فاسد خیال بن جاتی ہیں (آپ فرماتے ہیں) خوب جان لو کہ بخاری اور مسلم کی تمام حدیثیں اسی قبیل سے ہیں جیسا کہ شیخ ابو عمرو اور ان کے پہلے حافظ ابو طاہر سلفی وغیرہ جیسے علماء نے کہا ہے۔ پھر جس حدیث کو محدثین اور علماء حدیث نے قبول کیا اور اس کی تصدیق کی اس سے علم یقینی کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ متکلمین اور اصولیین کی بات کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ کسی دینی چیز پر اجماع میں خاص اس چیز کے ماہرین کا اعتبار کیا جاتا ہے دوسروں کا نہیں مثلاً شرعی احکام پر اجماع میں صرف علماء شریعت ہی کا اعتبار ہوگا متکلمین نحاۃ اور اطباء کا نہیں۔ اسی طرح کسی حدیث کے صحیح ہونے پر اجماع میں انھیں

لوگوں کا اعتبار ہوگا جو حدیث، طرق حدیث اور علل حدیث کی معرفت رکھنے والے ہیں۔ اور ایسے لوگ "علماء حدیث" ہیں جو اپنے نبی کے حالات پر دستگاہ رکھتے ان کے اقوال و افعال کو ضبط کرتے ہیں اور مقلدین اپنے متبوعین کے اقوال پر جتنی توجہ دیتے ہیں اس سے کہیں زیادہ توجہ وہ احادیث پر دیتے ہیں۔ علم متواتر جس طرح عام اور خاص کی طرف منقسم ہوتا ہے اور بعض چیزیں خواص کے نزدیک متواتر ہوتی ہیں اور دوسروں کو وہ چیز معلوم بھی نہیں ہوتی چہ جائیکہ ان کے نزدیک متواتر ہو، ٹھیک اسی طرح سے محدثین اپنے نبی کی سنت پر بہت زیادہ توجہ دینے اور ان کے اقوال افعال اور احوال کو منضبط کرنے کے باعث اس کا ایسا علم رکھتے ہیں کہ اس میں انھیں ذرہ برابر بھی شک و شبہ نہیں ہوتا جبکہ دوسروں کو اس کا قطعاً کوئی شعور ہی نہیں ہوتا۔"

افادۂ علم میں خبر شرعی کو دوسری خبروں پر قیاس کرنے کا فساد

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں (۲ - ۳۶۸) جس شخص نے خبر واحد کے علم یقینی کے فائدہ پہونچانے کا انکار کیا ہے اس نے قیاس فاسد کی جہت سے انکار کیا ہے، اس نے امت کے لئے عمومی شریعت کو، یا اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی صفت کے متعلق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے نقل کی گئی خبر کو ایک خاص معاملے میں شہادت دینے والے کی خبر پر قیاس کیا ہے دونوں کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے خبر دینے والے کے بارے میں اگر مان لیا جائے کہ اس نے عمداً جھوٹ بولا ہے یا خطاءً جھوٹ بولا ہے لیکن اس کے جھوٹ پر دلالت کرنے والی کوئی چیز ظاہر نہیں ہو سکی ہے تو اس شخص پر مخلوق کو گمراہ کرنے کا الزام عائد ہوگا۔ یہاں تو بات ایسی خبر کی چل رہی ہے جسے امت کے اندر تلقی بالقبول حاصل ہے، امت نے

اس کے بموجب عمل کیا ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی صفات اور افعال کو ثابت کیا ہے تو جس خبر کا شرعًا قبول کرنا واجب ہوتا ہو وہ نفس الامر میں باطل نہیں ہوگا۔ خصوصًا اس صورت میں جب پوری امت نے اسے قبول کیا ہو۔ اسی طرح ہر اس دلیل کے بارے میں کہنا ضروری ہے جس کی اتباع شرعًا واجب ہے کہ وہ حق ہی ہوگا اور اس کا مدلول نفس الامر میں ثابت ہوگا۔ یہ اس صورت کی بات ہے جس میں ہم اللہ تعالیٰ کی تشریع، اور اس کے اسماء وصفات سے متعلق خبر دے رہے ہوں۔ معین مشہود علیہ پر معین شہادت کا مسئلہ اس سے مختلف ہے اس میں تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نفس الامر میں اسکا مقتضیٰ ثابت نہیں ہوتا۔

اس مسئلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس خبر کو اپنے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانی امت کو دے کر اس سے عبادت کرایا اور اپنے اسماء وصفات کو ثابت کرنے کے لئے اپنے آپ یا وہ خبر نفس الامر میں کذب اور باطل نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ بندوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہے اور اللہ تعالیٰ کی حجت کذب اور باطل نہیں ہوتی بلکہ واقعی اور نفس الامری اعتبار سے صرف حق ہوتی ہے۔ حق اور باطل کی دلیلوں کا برابر درجہ کا ہونا جائز نہیں اور نہ یہی جائز ہے کہ اللہ اور اس کی شریعت اور اس کے دین کے متعلق جھوٹی بات ان چیزوں کے مشابہ ہو جائے جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ پر نازل کیا ہے اور جس کے ذریعہ مخلوق اللہ کی عبادت کر رہی ہے، اور یہ مشابہت ایسی ہو کہ حق اور باطل میں امتیاز نہ ہو سکتا ہو کیونکہ حق و باطل، صدق وکذب، وحی شیطان اور فرشتے کی اللہ کی طرف سے وحی کے درمیان فرق اس سے کہیں زیادہ واضح اور ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے سے ملتبس ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے حق پر سورج کی سی روشنی ڈال رکھی ہے جو روشن نگاہوں کو معلوم پڑتی ہے

اور باطل کو رات کی تاریکی سے اڑھا دیا ہے۔ یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ آنکھ کے اندھے پر رات دن سے ملتبس ہو جائے۔ اسی طرح دل کے اندھے پر حق باطل سے ملتبس ہو سکتی ہے چنانچہ معاذ بن جبل اپنے فیصلے میں فرماتے ہیں۔ "حق کو جس نے بھی کہا اسے لے لو کیونکہ حق پر نور ہوتا ہے"۔ لیکن جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی چیز وں سے اعراض کرنے کے باعث دل تاریک اور آنکھیں اندھی ہو جائیں اور اقوال رجال پر اکتفا کر لینے کے باعث تاریکی مزید بڑھ جائے تو ایسے لوگوں پر حق باطل سے ملتبس ہو جاتی ہے اور وہ ان صحیح حدیثوں کا "جھوٹا ہونا" جائز قرار دیتے ہیں جنھیں امت کے عادل ترین اور صادق ترین لوگوں نے روایت کیا ہے اور ان جھوٹی باطل اور گھڑی ہوئی حدیثوں کا صحیح اور سچ ہونا" جائز قرار دے دیتے ہیں جو انکی خواہشات کے موافق ہوتی ہیں اور پھر وہ ان سے استدلال کرتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں (۲ر ۳۷۹) ظلم وجور اور جہالت کے پیکر متکلمین صدیق فاروق اور ابی ابن کعب کی خبروں کو ایک عام آدمی کی خبر پر قیاس کرتے ہیں۔ حالانکہ دونوں راویوں کے درمیان واضح فرق موجود ہے۔ آخر اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو علم کا فائدہ نہ پہنچانے میں صحابہ میں سے ایک آدمی کی خبر اور عام لوگوں میں سے ایک آدمی کی خبر کے درمیان برابری دکھائے۔ ایسا شخص ٹھیک ویسے ہی ہے جیسے کسی نے علم وفضل اور دینداری میں ان لوگوں کو برابر کر دیا ہو۔

آپ فرماتے ہیں (۲ر ۳۷۹)

حدیث آحاد کے متعلق علم یقینی کے فائدہ نہ پہونچانے کے دعویٰ کا سبب حدیث سے جہالت ہے:

اگر یہ لوگ کہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خبریں اور صحیح حدیثیں علم کا فائدہ نہیں پہونچاتی ہیں تو یہ دراصل اپنے بارے میں اطلاع دیتے ہیں کہ انھوں نے ان حدیثوں سے علم نہیں حاصل کیا ہے۔ وہ اپنے

بارے میں یہ اطلاع دیتے ہوئے بالکل سچے ہیں لیکن اس اطلاع کے دینے میں جھوٹے ہیں کہ یہ اہل الحدیث اور محدثین کے لئے بھی علم کا فائدہ نہیں پہونچاتی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں (۲ر۴۳۲) ان لوگوں کو جب وہ طریقے حاصل نہیں جو اہل الحدیث کو ان حدیثوں سے استفادۂ علم کے لئے حاصل ہوئے تو ان کا یہ کہنا کہ ہم نے ان حدیثوں سے علم کا فائدہ نہیں اٹھایا یہ اس سلسلے کی عام نفی کو مستلزم نہیں ہے یہ تو اس استدلال کی طرح ہوگا کہ ایک چیز کا پانے والا اور اس کے بارے میں علم رکھنے والا اس کا نہ تو پانے والا ہے نہ جاننے والا۔ ایسا آدمی اس شخص کی طرح ہے جو اپنے اندر تکلیف یا لذت یا محبت یا نفرت پاتا ہو تو ایک آدمی کو اس لئے متعین کردے کر وہ یہ استدلال کرے کہ اسے تکلیف نہیں اسے درد نہیں، اسے محبت نہیں اور اسے نفرت نہیں۔ اس کی مثالیں بہت سی ہوسکتی ہیں جن کی غایت یہ ہوگی کہ جو چیز تم نے پائی ہے وہ میں نے نہیں پائی ہے اگر وہ بات حق ہوتی تو میں اور تم دونوں اس کے پانے میں شریک ہوتے۔ ظاہر ہے یہ عین باطل ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے

"میں اس ملامت کرنے والے سے کہتا ہوں جو اپنی ملامت کو حق بتاتا ہے کہ ذرا محبت کا مزہ چکھ لو پھر ملامت کرسکو تو کرو۔"

جو لوگ خبر واحد کے افادۂ علم سے منکر ہیں ان سے کہا جائے گا کہ پہلے اپنی توجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی چیزوں پر کرو، ان کے حریص بنو۔ ان کا تتبع کرو، انکو اکٹھا کرو، ان کے ناقلین کے حالات اور ان کی سیرت کی معرفت حاصل کرو، احادیث کے سوا تمام چیزوں سے منہ پھیر لو، انھیں انتہائے مقصود اور منتہائے آرزو بنالو۔ بلکہ اور مذاہب کے اتباع اپنے ائمہ کے مذاہب کے اندر جس مہارت کے حریص ہوتے ہیں کہ انھیں اس سلسلے میں بایں طور علم ضروری حاصل ہوتا ہے کہ یہ انھیں ائمہ کے مذاہب اور اقوال ہیں اور اگر کوئی اس کا انکار کرتا ہے تو وہ اس کا مذاق کرتے ہیں، اس طرح حریص تم احادیث کے ہو تو پھر جان لوگے کہ رسول اللہ صلے اللہ

یث علیہ وسلم کی حدیثیں علم یقینی کا فائدہ دیتی ہیں یا نہیں۔ اور اگر تم احادیث سے اور احاد کی تلاش وجستجو سے اعراض کرتے رہو تو یہ تمھیں علم کا فائدہ نہیں دے سکتیں۔ اب اگر تم کہو کہ وہ تمھیں ظن کا بھی فائدہ نہیں پہونچاتیں تو تم احادیث میں سے اپنے ملنے والے حصے اور اپنے نصیبے ہی کی اطلاع دے رہے ہو۔"

حدیث کے بارے میں بعض فقہاء کے موقف سے ان کی ناواقفیت کی دو مثالیں اور سنت

میں کہتا ہوں اور یہ تو ایک حقیقت ہے جسے علم حدیث سے شغل رکھنے والا، اس کے اسانید اور الفاظ کا تتبع کرنے والا، بعض روایتوں کے سلسلے میں بعض فقہاء کے موقف سے آگاہی رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے۔ اس کے لئے میں صرف دو مثالیں بیان کر رہا ہوں ایک پرانی ہے دوسری نئی۔

اوّل: ۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے " لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب "، اس شخص کی نماز جائز نہیں جو سورۂ فاتحہ کو نہ پڑھے اس کی تصریح صحیحین میں کی گئی ہے۔ حنفیہ نے اسے محض اس دعویٰ کی بنیاد پر رد کر دیا کہ یہ ظاہر قرآن کے خلاف ہے۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ کا قول " فاقرؤا ما تیسر منہ " (المزمل - ۲۰) جو کچھ قرآن سے میسر ہو پڑھو۔

حنفیہ نے اپنے خیال کے مطابق تاویل یہ کی ہے کہ یہ خبر واحد ہونے کے ناطے مردود ہے۔ حالانکہ امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب "جزء القراۃ" کے شروع ہی میں اس بات کی تصریح کی ہے کہ یہ حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے متواتر طور پر ثابت ہے۔ کیا خیال ہے؟ کیا ان لوگوں پر ضروری نہیں تھا کہ حدیث میں اختصاص رکھنے والے اس امام کے علم سے استفادہ کرتے۔ اس حدیث کے متعلق خبر واحد ہونے کی اپنی رائے بدل دیتے اور اسے آیت سے ملاتے اور اس سے آیت کی تخصیص کرتے۔ یہ ساری تاویلیں یہ جاننے کے

باوجود کی گئی ہیں کہ مذکورہ بالا آیت کریمہ صلوٰۃ الیل (تہجد) کے سلسلے کی ہے نماز میں فرض قرأت کے سلسلے کی نہیں ہے۔

دوم :۔ اخیر زمانے میں عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی حدیث۔ یہ بھی صحیحین میں مروی ہے۔ چند سال ہوئے اس کے بارے میں مشائخ ازہر سے سوال کیا گیا تھا تو ان میں سے ایک نے مجلہ "الرسالۃ" کے اندر جواب دیا تھا کہ یہ خبر واحد ہے اور اس کی سندوں کا دارومدار وہب بن منبہ اور کعب احبار پر ہے۔ حالانکہ حدیث رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے اندر معرفت اور اختصاص رکھنے والے اس حقیقت کی شہادت دیتے ہیں کہ یہ حدیث متواتر ہے۔ خود میں نے شخصی طور پر نبی صلے اللہ علیہ وسلم تک اس کی پہونچنے والی سندوں کا تتبع کیا تو معلوم ہوا کہ اسے لگ بھگ چالیس صحابہ نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اس میں سے علی الاقل بیس سندیں صحیح ہیں۔ بعض صحابیوں کی روایت بعض رواۃ سے ایک سے زائد صحیح سندوں سے صحیحین، سنن، مسانید اور معاجم وغیرہ کتب حدیث میں آئی ہوئی ہیں۔ اور یہ نہایت تعجب کی بات ہے کہ ان تمام سندوں میں کہیں بھی وہب اور کعب کا مطلقاً ذکر نہیں ہے۔

میں نے مذکورہ تلاش وجستجو کا خلاصہ دو صفحوں میں لکھ کر انھیں دنوں اس امید پر "الرسالہ" میں بھیج دیا تھا کہ بطور خدمت علم ان کی اشاعت ہو جائے گی۔ لیکن اسے شائع نہیں کیا گیا۔ سیکڑوں مثالوں میں سے یہ دو مثالیں ہیں جو بتا رہی ہیں کہ اہل علم نے حدیث نبوی پر وہ توجہ نہیں دی جو انھیں اس اعتبار سے دینی لازم تھی کہ وہ اسلامی شریعت کا ایسا دوسرا سرچشمہ ہے جس کے بغیر پہلے سرچشمے کو صحیح طور پر اللہ تعالیٰ کے منشاء کے مطابق ہرگز نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے بارے میں اس رسوا کن جہالت میں جا گرے اور ان کے ماننے سے اس طرح کا واضح انحراف کیا حالانکہ یہ قطعی ہے کہ اسے نبی صلے اللہ

علیہ وسلم لائے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔

وما آتاکم الرسول فخذوہ (الحشر) اور رسول جو کچھ تمھیں دیں اسے لے لو ۔

ان لوگوں نے کچھ کو لیا اور کچھ کو چھوڑ دیا ۔ جس نے ایسا کیا اس کا بدلہ کچھ نہیں ۔ سوائے ......

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مسلمان پر واجب ہے کہ وہ ہر اس حدیث پر ایمان رکھے جو محدثین کے یہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو خواہ وہ عقائد کے باب کی ہو یا احکام کے باب کی متواتر ہو یا آحاد ، آحاد سے خواہ قطعیت اور یقین کا فائدہ پہونچتا ہو یا ظن غالب کا ، جیسا کہ گذرا ۔ بہر حال ان تمام کے سلسلے میں واجب ہے کہ ان پر ایمان لایا جائے اور انھیں مان لیا جائے اسی طرح پر کر کے مومن اس "استجابت" کو بجا لا سکتا ہے جس کا حکم اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس قول میں دیا گیا ہے ۔

یاایھا الذین آمنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم واعلموا ان اللہ یحول بین المرء وقلبہ وانہ الیہ تحشرون ۝ (الانفال ـ ۲۴)

اے مومنو ! اللہ اور رسول جب تم کو ایسی چیز کے لئے پکاریں جو تم کو زندگی عطا کرتی ہے تو سن لو اور اچھی طرح جان لو کہ اللہ تعالیٰ آدمی کے اور اس کے دل کے درمیان حائل رہتا ہے ۔ اور یہ بھی جان لو کہ تم سب لوگ اسی کے پاس اکٹھا کئے جاؤ گے ۔

اس کے علاوہ اور وہ بہت سی آیتیں ہیں جن کا ذکر اس کتاب کے شروع ہی میں ہو چکا ہے اس کتاب کے بارے میں مجھے توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے فائدہ پہونچائے گا ۔ اسے اپنی رضا کے لئے خالص کرے گا اور اسے اپنی کتاب کا حامی اور اپنے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت کے لئے خادم بنائے گا ۔

چوتھی فصل

تقلید اور تقلید کو مذہب و دین بنا لینا

تقلید کی حقیقت اور اس سے تحذیر

تقلید لغت میں اس قلادہ سے ماخوذ ہے جسے انسان دوسرے کے گلے میں پہنا دیتا ہے۔ اسی سے ہے "تقلید الہدی" (قربانی کے جانور کو قلادہ پہنانا) گویا کہ مقلد جس چیز میں مجتہد کی تقلید کرتا ہے وہ اس قلادہ کی طرح ہے جو اس شخص کی گردن میں ہوتا ہے جس کو قلادہ پہنایا جاتا ہے۔ اور اصطلاحاً تقلید، "غیر کی بات پر بغیر دلیل کے عمل کرنے" کو کہتے ہیں۔ اس تعریف کی بنیاد پر، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قول پر اور اجماع پر عمل کرنا، عامی آدمی کا مفتی کی طرف اور قاضی کا عادل شخص کی شہادت کی طرف رجوع کرنا تقلید نہیں ہو گا۔ کیونکہ ان چیزوں میں دلیل موجود ہے [1]

اس اصولی نص سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں :۔

اول :۔ یہ کہ تقلید نفع بخش علم نہیں ہے۔

دوم :۔ یہ کہ یہ عامی اور جاہل آدمی کا کام ہے۔

ان دونوں چیزوں پر تھوڑا سا غور کر کے ان کی حقیقت کو بیان کرنا اور ان

---

[1] ارشاد الفحول ص ۲۳۴، میں کہتا ہوں کہ اس چیز کی رعایت مناسب ہے کہ علامہ شوکانی نے عامی کے مفتی کی طرف رجوع کرنے کو تقلید سے اس اصطلاح کی بنیاد پر خارج قرار دیا ہے جس کو انہوں نے بیان کیا ہے اسلئے اس کا لغت میں بعینہٖ تقلید ہونا اس کے منافی نہیں ہے۔

میں سے ہر ایک پر اقوال ائمہ سے اشتہاد پیش کرتے ہوئے کتاب وسنت کی روشنی میں نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اس کے بعد ہم اماموں کے بزعم خویش متبعین کے حالات پر نظر ڈالیں گے اور ان کے اماموں کے فرمودات کے مطابق ان کی اتباع کی صحت کو پرکھیں گے

(۱) تقلید علم نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی بہت سی آیتوں کے اندر اس کی مذمت کی ہے جبھی تو ائمہ متقدمین نے یکے بعد دیگرے مسلسل اس سے روکا ہے۔ امام اندلس ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اپنی بیش قیمت کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ" کے اندر اس کی تحقیق کے لئے ایک مخصوص باب باندھا ہے۔ ان کی بات کا خلاصہ یہ ہے (۲-۱۰۹-۱۱۴)

تقلید کی خرابی، اس کی ممانعت اور تقلید اور اتباع کے درمیان فرق کا باب" ــــ اللہ تعالیٰ نے ایک سے زیادہ جگہوں پر تقلید کی مذمت کی ہے ارشاد باری ہے۔ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ (البراءۃ - ۳۱) لوگوں (یہودیوں) نے اپنے عالموں اور راہبوں کو اللہ کے سوا رب بنالیا۔

حضرت حذیفہ وغیرہ سے مروی ہے یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہودیوں نے اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت نہیں کی تھی البتہ انھوں نے جو کچھ ان کے لئے حلال کیا اور جو کچھ ان پر حرام کیا اس کو انھوں نے مان لیا تھا۔ عدی بن حاتم کہتے ہیں میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو میری گردن میں صلیب پڑا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا عدی! اس بت کو اپنی گردن سے نکال دو میں آپ کے پاس پہونچا تھا تو آپ سورۂ برائت کی تلاوت فرمارہے تھے جب اس آیت پر پہونچے۔

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ (البراءۃ ۳۱)

لوگوں (یہودیوں) نے اپنے عالموں اور راہبوں کو اللہ کے سوا رب بنالیا۔ تو میں نے کہا اے اللہ کے رسول! ہم نے ان کو رب نہیں بنایا تھا۔ آپ نے فرمایا

کیوں نہیں ۔ کیا یہ بات نہیں تھی کہ تمھارے اوپر جو چیز حرام تھی اسے وہ حلال کر دیتے تھے تو تم اسے حلال مانتے تھے اور جسے اللہ تعالیٰ نے تمھارے لئے حلال کیا تھا اسے وہ حرام کر دیتے تھے تو تم اسے حرام مانتے تھے ۔؟ میں نے کہا ضرور ! آپ نے فرمایا یہی ان کی عبادت ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ۔

وکذلک ما ارسلنا من قبلک فی قریة من نذیر الا قال مترفوھا انا وجدنا آباءنا علی امة وانا علی آثارھم مقتدون ٥ قال اولو جئتکم باھدی مما وجدتم علیه آباءکم (الزخرف ۲۳-۲۴)

اس طرح ہم نے آپ سے پہلے جس گاؤں میں بھی کوئی ڈرانے والا بھیجا تو وہاں کے مالداروں نے کہا ہم نے اپنے آباء کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انھیں کے آثار کی پیروی کر رہے ہیں تو اس نے کہا کیا اگرچہ میں تمھارے پاس اس سے زیادہ ہدایت کی چیز لایا ہوں جس پر تم نے اپنے آباء کو پایا ہو !

اس طرح باپ دادا کی اقتدار نے ان کو ہدایت قبول کرنے سے روک دیا اور ان لوگوں نے جواباً کہا ۔

انا بما ارسلتم به کافرون ٥ (الزخرف ۔ ۲۴)

ہم سب ان تمام چیزوں کے منکر ہیں جنھیں دے کر تم بھیجے گئے ہو ۔

اللہ عزوجل نے کافروں پر عیب لگاتے ہوئے اور ان کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا ۔

ماھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون قالوا وجدنا آباءنا لھا عابدین[1] ٥ (الانبیاء ۵۳-۵۴)

یہ کیا مجسمے ہیں جن کے لئے تم اعتکاف کرتے ہو، انھوں نے کہا ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسے ہی کرتے پایا ہے ۔

---

[1] کتاب میں لھا عابدین کے بجائے کذلک یفعلون ہے ۔ مجھے یہ آیت نہیں ملی (مترجم)

اس طرح آباء اور رؤساء کی تقلید کی مذمت قرآن میں بہت کافی ہے ۔ علماء نے تقلید کو باطل کرنے میں انھیں آیتوں سے استدلال کیا ہے ۔ ان لوگوں کا (جن کا ذکر آیت میں ہے) کافر ہونا ان آیتوں سے علماء کے استدلال کے راستے میں مانع نہیں ہوا کیونکہ یہاں تشبیہ ایک کے کافر اور دوسرے کے مومن ہونے کے اعتبار سے نہیں آئی ہے بلکہ تشبیہ دونوں تقلیدوں میں مقلد کے پاس کسی حجت کے بغیر (دونوں کے اتباع ہونے کے بارے میں[1] دی گئی ہے ۔ جیسے ایک آدمی نے تقلید کر کے کفر کیا دوسرے نے تقلید کر کے گناہ کیا اور تیسرے نے کسی مسئلہ میں تقلید کی تو اس کی علت میں غلطی کر گیا ۔ ان میں سے ہر ایک بلا دلیل تقلید کرنے کی وجہ سے قابل ملامت ہوگا ۔ اس لئے کہ اس میں سے ہر ایک تقلید ہے اور ہر ایک دوسرے کے مشابہ ہے ۔ گناہ کے اندر اگر چہ اختلاف ہو ۔

اس کے بعد امام اندلس نے ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ وہ کہتے ہیں "عالم ہو جاؤ یا متعلم ہو جاؤ ، لیکن اسکے درمیان ہر ایک کی رائے کو ماننے والے نہ بنو" ۔ ابن مسعود سے دوسری سند سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ہم جاہلیت کے زمانے میں امعۃ اس شخص کو کہتے تھے جسے کھانے پر بلایا جاتا تو اپنے ساتھ غیر کو بھی لے جاتا اور آج تم میں امعۃ وہ شخص ہے جو اپنے دین پر لوگوں کو سوار کرے[2] آپ کی مراد مقلد سے ہے ۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ " عالم کی لغزشوں کی پیروی کرنے والوں کے لئے ویل ہو ۔ کہا گیا آخر یہ کیسے ہے ۔ آپ نے فرمایا کہ عالم

---

[1] اصل میں نہیں ہے مگر کلام اس کا مقتضی ہے (مترجم)

[2] ابن الاثیر کہتے ہیں کہ ابن مسعود نے اس شخص کو مراد لیا ہے جو دین میں ہر شخص کی تقلید کرتا ہے، یعنی اپنے دین کو بلا کسی حجت و دلیل اور بلا کسی تدبر کے غیر کے دین کی تابع کر دیتا ہے "محقب کا لفظ" الارداف علی الحقیبہ سے لیا گیا ہے (یعنی سوار کا اپنے پیچھے رکھی ہوئی تھیلی پر سوار کرنا)

اپنی رائے سے کوئی بات کہتا ہے اس کے بعد اسے کوئی ایسا شخص مل جاتا ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس سے زیادہ جانتا ہے اس لئے وہ اپنی بات کو چھوڑ دیتا ہے اور متبعین اسے کرتے جاتے ہیں ۔،، اس کے بعد علامہ ابن عبد البر فرماتے ہیں۔

"نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا۔ علماء گذر جائینگے اس کے بعد لوگ جاہل لوگوں کو اگوا بنالیں گے ان سے وہ پوچھیں گے تو وہ علم کے بغیر فتوٰی دیں گے اس طرح وہ خود گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو گمراہ کریں گے[1]

یہ سب چیزیں ہر اس شخص کے لئے تقلید کی نفی اور اس کا ابطال کرتی ہیں جو انھیں سمجھتا اور ان کی ہدایت سے فیضیاب ہوتا ہے ۔ ائمہ امصار کا تقلید کے فساد کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے ، اس سے زیادہ میں پیش کرنے سے بے نیاز ہوں ،، یہ بات علامہ ابن قیم نے اعلام الموقعین (۲/۲۹۴-۲۹۸) میں نقل کی ہے ۔ آپ دوسری جگہ فرماتے ہیں ۔ " تقلید کر کے فتوٰی دینا جائز نہیں ہے کیونکہ تقلید علم نہیں اور بغیر علم کے فتوٰی دینا حرام ہے ، لوگوں کے درمیان اس سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں کہ تقلید علم نہیں ہے ۔ اور یہ کہ مقلد پر عالم کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا ۔ (اعلام ۱/۵۱)

اس طرح علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ " مقلد کو عالم نہیں کہا جا سکتا جیسا کہ ابو الحسن سندی حنفی نے ابن ماجہ پر اپنے پہلے حاشیہ میں نقل کیا ہے ۔ علامہ شوکانی نے (ارشاد الفحول ص ۲۳۶) میں اسے جزماً کہا ہے کہ " تقلید جہل ہے علم نہیں ہے ،، یہ اس چیز کے عین موافق ہے جو کتب احناف میں آئی ہے کہ عہدہ قضا

---

[1] اسی کے مثل بخاری اور مسلم نے عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کیا ہے ، اس کی تخریج میری کتاب " الروض النضیر ،، میں رقم ۵۹۴ کے تحت کی گئی ہے ۔ اس کے الفاظ بھی آگے آرہے ہیں ۔

پر جاہل کو فائز کرنا جائز نہیں ہے۔ یہاں جاہل کی تفسیر علامہ ابن الھمام نے مقلد کے ساتھ کی ہے۔

تقلید سے ائمہ کی ممانعت

ائمہ مجتہدین کے اقوال بہت کثرت سے آئے ہیں جنہیں انھوں نے اپنی یا دوسروں کی تقلید سے سختی کے ساتھ روکا ہے۔

۱۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں "کسی بھی شخص کے لئے ہمارے قول سے استدلال کرنا جائز نہیں جب تک وہ یہ نہ جانتا ہو کہ ہم نے اسے کہاں سے لیا ہے" ایک روایت میں ہے "جو شخص میری دلیل نہ جانتا ہو اس پر میرے کلام سے فتویٰ دینا حرام ہے کیونکہ ہم انسان ہیں، آج ایک بات کہتے ہیں کل اس سے رجوع کر لیتے ہیں۔

۲۔ امام مالک رحمہ اللہ کا فرمان ہے۔ "میں انسان ہوں، کبھی صواب کو پہنچتا ہوں کبھی خطا کر جاتا ہوں اس لئے میری بات پر نظر ڈالو اس میں سے جو بھی کتاب و سنت کے موافق ہو اسے لے لو اور جو بھی کتاب وسنت کے موافق نہ ہو اسے چھوڑ دو"

۳۔ امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں۔ "تمام مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ جسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت معلوم ہو گئی اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی کے قول کی وجہ سے سنت کو چھوڑ دے۔" اور فرمایا۔ "اگر محدثین کے یہاں کوئی حدیث صحیح سند سے ثابت ہو اور میری بات کے مخالف ہو تو میں اپنی بات سے زندگی میں اور موت کے بعد رجوع کر رہا ہوں" نیز فرمایا۔ "جو کچھ بھی میں نے کہا ہے اگر نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے صحیح طور پر میرے قول کے خلاف ثابت ہو تو حدیث نبی اولیٰ اور بہتر ہے۔ میری تقلید مت کرو۔"

۴۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ "تم لوگ میری تقلید کرو نہ مالک کی نہ شافعی نہ اوزاعی کی نہ ثوری کی، بلکہ تم بھی اس جگہ سے لو جہاں سے انھوں نے لیا ہے۔ (صفۃ صلوٰۃ النبی ص ۲۳ - ۳۴)

ائمہ کرام کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ انھوں نے کہا ہے۔ "جب حدیث صحیح طور پر ثابت ہو تو وہی میرا مذہب ہے"، اس کے علاوہ ان لوگوں سے بہت سے اقوال منقول ہیں۔ اس کا ایک بہتر انتخاب میں نے اپنی کتاب صفۃ صلاۃ النبی کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے۔

یہاں جتنا ذکر کیا ہے اتنا ہی کافی ہے۔

علم صرف اللہ اور رسول کا قول ہے

جب علماء کے یہاں تقلید کی یہ حالت ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اہل علم دلائل کے ذریعہ حق کو پہچاننے کی قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے لئے فقہ پر کلام کرنا صرف انھیں چیزوں کی بنیاد پر جائز ہے جو کتاب وسنت سے ثابت ہیں۔ کیونکہ علم دراصل انھیں دونوں میں ہے، اقوال رجال میں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعی رح "الرسالۃ" ص ۴۱ رقم ۱۳۱۔ ۱۳۲) میں فرماتے ہیں۔ "اہل علم کے لئے ضروری ہے کہ انھوں نے جس طرح پر جانا ہے اسی طرح پر کہیں۔ کچھ ایسے لوگوں نے علم پر کلام کیا ہے جو اگر خاموش رہتے تو جن بعض چیزوں پر انھوں نے کلام کیا ہے ان پر خاموش رہنا ان کے لئے انشاء اللہ زیادہ بہتر اور سلامتی کے زیادہ قریب ہوتا۔

آپ دوسری جگہ فرماتے ہیں (ص ۳۹ / ۱۲۰) "کسی بھی شخص کے لئے کسی حلال یا حرام چیز کے متعلق کچھ کہنا صرف اور صرف علم ہی کی بنیاد پر جائز ہے اور علم کی بنیاد یا تو کتاب کی اطلاع ہے یا سنت کی یا اجماع یا قیاس کی"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں (ص ۵۰۸ / ۱۴۶۷ - ۱۴۶۸) "اگر کسی نے بلا کسی حتمی اطلاع اور قیاس کے کوئی بات کہی تو وہ اس شخص کی بہ نسبت گناہ سے کافی قریب ہوگا جس نے کوئی بات کہی اور وہ عالم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے لئے بھی بلا ماسبق علم کو بنیاد بنائے کچھ کہنا جائز نہیں کیا ہے اور اب علم کتاب وسنت اور اجماع وآثار اور وہ چیزیں ہیں جنھیں ان چیزوں

پر قیاس کر کے جانا جائے۔"

مسلمانوں میں سے عوام تو درکنار خواص پر جو سب سے بڑی مصیبت نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ آج اور آج سے پہلے کئی صدیوں سے اکثر لوگ اس سے تہہ بتہ جہالت میں تھے کہ تقلید بری چیز ہے، وہ علم نہیں ہے، علم صرف اللہ کا اور رسول کا قول ہے، جس کے بارے میں معلومات کتاب وسنت کے نصوص، صحابہ کے آثار اور ائمہ کے اقوال سے حاصل ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان میں سے کسی کلی شخص کے حاشیۂ خیال میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ جس علم کی تعریف کتاب وسنت میں کی گئی ہے وہ انھیں کے اندر وارد عقائد واحکام کا علم ہے۔ اور کتاب وسنت میں جن علماء کی تعریف کی گئی ہے۔ وہ کتاب وسنت کے جاننے والے ہیں۔ ائمہ کے اقوال اور ان کے اجتہادات کو جاننے والے نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اسے انھیں اقوال واجتہادات میں حیران پائیں گے وہ ان میں سے کتاب وسنت کے موافق اور مخالف کو نہیں جان پاتا۔ اسی طرح جب وہ علامات قیامت کی حدیثیں پڑھتا ہے تو ان ائمہ میں سے کسی ایک کے باغ میں چکر لگاتا رہتا ہے مثلاً "یرفع فیھا العلم ویظھر فیھا الجھل" (متفق علیہ) قرب قیامت میں علم اٹھ جائے گا اور جہالت عام ہو جائے گی۔

تو وہ سمجھتا ہے کہ مقلد کا بھی علم اس میں داخل ہے جو در اصل جہالت ہے کیونکہ مقلد کے پاس علم ہوتا ہی نہیں ہے جیسا کہ ائمہ سے نقل ہو چکا ہے۔ اسی طرح جب وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا قول "ان اللہ لا یقبض العلم انتزاعا ینتزعہ من الناس ولکن یقبض العلم بقبض العلماء" (متفق علیہ) اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں سے چھین کر نہیں اٹھائے گا بلکہ اس طرح اٹھائے گا کہ علماء کو اٹھا لے گا۔

سنتا ہے تو اس کو مطلقاً تنبہ نہیں ہوتا کہ یہ لوگ صرف کتاب اللہ اور سنت

رسول اللہ کے جاننے والے ہیں بلکہ ہم نے کتنوں کو بارہا سنا ہے کہ وہ اس حدیث کو کسی شیخ تقلید کے انتقال کی مناسبت سے ذکر کرتے ہیں۔ اس طرح وہ باقی حدیث حتی اذا لم یترک عالما اتخذ الناس رؤوسا جهالا فسئلوا فافتوا بغیر علم ولفظ البخاری: برأیهم، فضلوا واضلوا ،، یہاں تک کہ جب کوئی عالم نہیں بچے گا تو لوگ کچھ جاہلوں کو اگوا بنالیں گے پھر ان سے پوچھیں گے تو وہ بلا علم کے فتویٰ دیں گے (بخاری کے الفاظ ہیں اپنی رائے سے فتویٰ دیں گے) اس طرح وہ گمراہ ہوں گے اور گمراہ کریں گے ۔ کے سمجھنے میں بھی غلطی کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس سے مراد وہ عوام ہیں جو تقلیدی فقہ کو نہیں سمجھتے اور جنھیں مذاہب کی معرفت حاصل نہیں ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس صفت کے اندر وہ مقلدین داخل ہوتے ہیں جنھوں نے ائمہ کے اجتہادات کی معرفت حاصل کرکے، اور بغیر کسی بصیرت کے ان اجتہادات میں ان کی تقلید کرکے علم پر قناعت کرلیا ہے جیسا کہ اس سے پہلے علامہ ابن عبدالبر اندلسی کے کلام میں اس چیز کی طرف اشارہ گذرچکا ہے۔ ہماری بات کی تائید علماء کے استدلال سے بھی ہوتی ہے۔ جیسے انھوں نے اسی حدیث سے اس چیز کے اوپر کیا ہے کہ مجتہد سے زمانہ خالی ہوسکتا ہے۔ اس پوری تفصیل کے ساتھ جو فتح الباری (۱۳ / ۲۴۴) میں مذکور ہے لوگوں نے اسی سے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس حدیث میں علماء سے مراد مجتہدین ہیں اور رؤس جہال سے مقلدین۔

اس تہ بتہ جہالت کا مخفی سبب دراصل حقیقت علم سے ان کی جہالت ہے اور اس عالم کو نہ جان پاتا ہے جس کی طرف آیتیں اور حدیثیں لوٹتی ہیں۔ جب کبھی بھی ان میں اس کا ذکر ہوتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون (الزمر ۹)	کیا وہ جو جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے برابر ہوسکتے ہیں؟

ارشاد باری ہے :-

یرفع اللہ الذین اٰمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات " (المجادلہ - ۱۱)	اللہ تعالےٰ تم میں سے مومنوں کو اور ان کو جو علم دئے گئے ہیں باعتبار درجات بلند کرتا ہے ۔

اللہ کے رسول کا فرمان ہے :-

فضل العالم علی العابد کفضلی علےٰ ادناکم " (الترمذی)[1]	عابد کے اوپر عالم کی فضیلت ایسے ہی ہے جیسے تم میں سے معمولی آدمی پر میری فضیلت ۔

آپ فرماتے ہیں :-

اذا مات ابن اٰدم انقطع عملہ الا من ثلاث ۔ صدقۃ جاریۃ او علم ینتفع بہ او ولد صالح یدعو لہ (مسلم)	جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کا عمل تین چیزوں کے علاوہ ہر چیز سے کٹ جاتا ہے (وہ تینوں یہ ہیں) صدقہ جاریہ، یا ایسا علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے یا ایسی صالح اولاد جو اس کے لئے دعا کرے ۔

اللہ کے رسول فرماتے ہیں :-

لیس منا من لم یجل کبیرنا ویرحم صغیرنا ویعرف لعالمنا حقہ (حاکم)[2]	وہ ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے بڑے کی تعظیم نہ کرے، ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے اور ہمارے عالم کے حق کو نہ پہچانے ۔

ان کے علاوہ علم اور علماء کی فضیلت کی بہت سی آیتیں اور حدیثیں ہیں حافظ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب " جامع بیان العلم " کے اندر اس حقیقت کو بیان

---

[1] اس کی سند صحیح ہے جیسا کہ ہم نے اسے تخریج مشکوٰۃ ۔ ۲۱۲ کے اندر بیان کر دیا ہے ۔

[2] اس کی سند حسن ہے جیسا کہ تخریج الترغیب ۱/۱۰۴ میں بیان کیا گیا ہے ۔

کرنے کے لئے ایک خاص باب باندھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں (۲ر۲۳) "علم کے اصول اوران کی حقیقت کی معرفت کا باب اور اس کا باب کہ کس چیز پر فقہ اور علم کا نام مطلقاً بولا جاتا ہے"، علامہ فلانی نے بھی اپنی کتاب (ایقاظ ھمم اولی الابصار ص ۲۳ - ۲۶) میں انھیں کی پیروی کی ہے۔ اس کے بعد دونوں اصحاب نے بعض وہ حدیثیں اور آیتیں ذکر کی ہیں جن کے لئے باب باندھا ہے۔ علامہ فلانی نے اس کو اپنے اس قول پر ختم کیا ہے "میں کہتا ہوں کہ یہ احادیث و آثار اس چیز کی تصریح کرتی ہیں کہ علم کا اطلاق، کتاب اللہ سنت رسول اللہ اور اجماع یا ان چیزوں پر ہوتا ہے جو نص کی عدم موجودگی میں انھیں اصولوں پر قیاس کی گئی ہوں یہ ان لوگوں کے نزدیک جو قیاس کو جائز سمجھتے ہیں ان چیزوں پر علم کا اطلاق نہیں ہوتا جسے اہل تقلید اور ارباب عصبیت کہہ گئے ہیں کہ علم انھیں کتابوں میں محصولہ ہے جو قیاس و رائے کی مذہبی کتابوں کی شکل میں مدون ہیں، گو ان میں سے کچھ چیزیں احادیث نبوی کی نصوص کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں۔"

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ تقلید بری چیز ہے کیونکہ وہ علم نہیں، جہالت ہے علم حقیقی تو صرف کتاب و سنت اور انھیں دونوں کے سمجھنے کا علم ہے۔

دلیل جاننے سے عاجز شخص کیلئے تقلید کا جواز

کوئی کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ ہر شخص اس طرح کا عالم تو نہیں ہو سکتا ؟ (جس کی نشان دہی آپ نے کی ہے) تو ہم کہیں گے کہ ہاں بات ایسے ہی ہے لیکن اس سلسلے میں نزاع کون کرے گا۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے۔ فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون (النحل۔ ۴۳)

اگر تم لوگ علم نہیں رکھتے تو علم والوں سے پوچھ لو۔

نیز فرماتا ہے۔ فاسئل به خبيرا (الفرقان۔ ۵۹) اس کے بارے میں با خبر آدمی سے پوچھ لو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کی بابت فرماتے ہیں جو بغیر علم کے فتویٰ دیتے ہیں "الا سألوا حین جھلوا فانما شفاء العی السوال"

ان لوگوں نے جب نہیں جانا تو پوچھا کیوں نہیں؟ عاجزی کی شفا سوال میں تھی۔ ان دلائل کے باوجود، بحث، استطاعت رکھنے والوں اور نہ رکھنے والوں کی تحدید کے سلسلے میں تھی ہی نہیں بلکہ سیاق کلام بتا رہا ہے کہ یہ ان خواص کے بارے میں ہے جن کے متعلق اہل علم ہونے کا گمان ہے اور یہ خیال ہے کہ تمام مسائل کی یا کم از کم بعض مسائل کی، دلیل کے ساتھ معرفت ان کے بس میں ہے حالانکہ فی الحقیقت وہ اقوال مذہب کے عالم ہیں، کتاب و سنت سے نابلد ہیں۔ پھر تو اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا خصوصاً اس وقت جبکہ اس فصل کے شروع میں میں نے یہ ذکر کر دیا ہے کہ مذکورہ اصولی نص سے ہمیں دو اہم چیزوں کا فائدہ حاصل ہوا ہے۔

پہلی چیز:- یہ کہ تقلید نفع بخش علم نہیں ہے۔ اس کی اتنی وضاحت ہو چکی کہ انشاء اللہ کافی ہو گی۔

دوسری چیز:- یہ کہ یہ عامی اور جاہل کا کام ہے۔ اس طرح وہ عالم جو دلائل کی معرفت پر قدرت رکھتا ہو اس حکم سے خارج ہو جاتا ہے یہ تو ایسا شخص ہے جس کا کام تقلید نہیں، اجتہاد ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جس کی وضاحت دوسری چیز کی تشریح سے ہو گی۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ ابن عبدالبر نے اس عبارت کے بعد لکھا ہے جو ابھی ان سے مختصراً نقل ہوئی ہے۔

"یہ تمام چیزیں غیر عامیوں کے لئے ہیں، عوام کے لئے تو کسی بھی مسئلہ کے درپیش ہونے پر اپنے علماء کی تقلید ضروری ہے کیونکہ وہ محل حجت کو سمجھتے ہی نہیں اور بات کو نہ سمجھنے کے ناطے اس کے علم تک ان کی پہونچ ہی نہیں ہوتی ہے کیونکہ علم کے بہت سے درجات ہیں، ان میں سے اوپر والے کو نیچے والے کے حاصل کئے بغیر نہیں پایا جا سکتا۔ یہی چیز ہے جو عوام کے اور دلیل طلب کرنے کے درمیان

حائل ہے۔ واللہ اعلم۔

علماء کا اس سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عوام پر علماء کی تقلید ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قول "فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون ۰ النحل ۴۳ اگر تم نہیں جانتے ہو تو علم والوں سے پوچھ لو۔ سے یہی لوگ مراد ہیں۔ اس بات پر تمام لوگوں کا اجماع ہے کہ نابینا کو جب قبلہ کے بارے میں دشواری ہو تو اسے معلوم کرنے کے لئے کسی ایسے شخص کی تقلید ضروری ہے جس پر اعتماد ہو۔ اسی طرح وہ شخص بھی ہوگا جو اپنا دین اختیار کرنے کے سلسلے میں علم اور بصیرت نہیں رکھتا اس کیلئے عالم دین کی تقلید ضروری ہے۔ اسی طرح علماء کا اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ عوام کے لئے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔ اس کی وجہ ان چیزوں سے ناواقفیت ہے جن سے کسی چیز کا حلال کرنا اور کسی چیز کا حرام کرنا جائز ہوتا ہے اور جن سے علم کے متعلق کچھ کہنا جائز ہوتا ہے"

لیکن میرا خیال ہے کہ عامی آدمی کے بارے میں مطلق بات کہنا اور یہ کہنا کہ اس کے لئے تقلید ضروری ہے اس میں کچھ بات ضرور ہے۔ کیونکہ جب آپ کہتے ہیں کہ تقلید یہ ہے کہ غیر کی بات پر بغیر دلیل کے عمل کیا جائے تو بہت سے اوقات میں تو کچھ ذہین عوام کے لئے دلیل کو جان لینا آسان ہوتا ہے کیونکہ جو نص اس کے پاس پہونچی ہوتی ہے اس میں دلیل بالکل واضح ہوتی ہے۔ کون کہتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس جیسے فرمان "التیمم ضربۃ واحدۃ للوجہ والکفین" چہرے اور دونوں ہتھیلیوں کے تیمم کے لئے ہاتھ کو زمین پر ایک مرتبہ مارنا ہے" میں اس کے لئے واضح دلیل نہیں ہے بلکہ جو ذہانت میں اور کم درجہ کے ہیں ان کے لئے واضح نہیں ہے؟ اسی وجہ سے یہ کہنا بہتر ہے کہ جو شخص دلیل کی معرفت سے عاجز ہو اس کے لئے تقلید واجب ہے اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ کی تکلیف نہیں دیتا۔ اس کی تائید علامہ ابن کلام کی اس بات سے ہوتی ہے

جو اسی عنوان کے آخر میں آرہی ہے۔ چنانچہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عالم خود کبھی کبھی بعض مسائل میں تقلید کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جب اس کو ان مسائل میں اللہ اور رسول سے کوئی نص نہیں مل پاتی اور وہ اپنے سے زیادہ جانکار کے قول کے سوا اور کچھ نہیں پاتا ہے تو اس کی تقلید پر مجبور ہو جاتا ہے جیسا کہ امام شافعی رح نے بعض مسائل میں کیا ہے اسی وجہ سے ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں (۲ / ۲۴۴)

یہ اہل علم کا کام ہے اور یہ ضروری ہے کیونکہ تقلید صرف مجبور شخص کے لئے جائز ہے اور اگر کوئی شخص قدرت کے باوجود کتاب وسنت اقوال صحابہ اور دلیل کے ذریعہ حق کی معرفت سے، تقلید کی طرف منہ موڑ لیتا ہے تو وہ اس شخص کی طرح ہے جو مذبوح پر قدرت رکھنے کے باوجود مردار کی طرف مڑتا ہے کیونکہ اصل یہ ہے کہ غیر کے قول کو بلا دلیل نہ قبول کیا جائے لیکن مقلدین نے وقت ضرورت کی چیز کو اصل سرمایہ بنا لیا۔

اہل مذاہب کی اجتہاد سے جنگ اور ہر شخص پر تقلید کا ایجاب

یہ بات تو واضح ہو چکی، اب اس چیز پر بحث کرنا باقی ہے جس کا ہم نے اس سے پہلے وعدہ کیا تھا۔ یعنی ائمہ کے اقوال کی اتباع کرنے والوں کے حالات پر نظر ڈالنا اور اس پر نظر ڈالنا کہ ائمہ کے اقوال کی اتباع ان کے لئے کہاں تک صحیح ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ ایک زمانے سے جمہور مشائخ مقلدین کا موقف نہایت عجیب وغریب رہا ہے کیونکہ وہ جس وقت یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ احکام کے سمجھنے میں کتاب وسنت کی طرف مراجعت کرنے کے اہل نہیں ہیں اور یہ کہ ان کے لئے ائمہ کی تقلید ضروری ہے آپ انھیں ٹھیک اسی وقت دیکھیں گے کہ وہ جہالت کی طرف منسوب کئے جانے کو گوارا نہیں کرتے ہیں حالانکہ ان کے علماء کے اقوال کا تقاضا یہی ہے۔ بلکہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ وہ بہت سے اصولوں میں اپنے ائمہ کی تقلید سے خارج ہو گئے ہیں اور انھوں نے

اپنی طرف سے قواعد بنائے ہیں جبکہ انھیں تقلید کا دعوے دار ہوتے ہوئے ایسا کرنا مناسب نہیں تھا۔ خصوصًا ایسے وقت جبکہ یہ قواعد، نصوص کتاب وسنت کے خلاف ہیں۔ دراصل انھوں نے یہ قواعد اس لئے وضع کئے ہیں تاکہ وہ فروع میں ائمہ کی تقلید کو اپنے اوپر لازم کرسکیں اور اس سے پہلے ذکر کئے گئے ان کے حکموں کی خلاف ورزی کرسکیں ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ مجتہد مطلق نہیں پایا جاتا ہے[1] اور ان کے یہاں مشہور ہے کہ اجتہاد کا دروازہ چوتھی صدی ہجری کے بعد بند ہو گیا۔ ابن عابدین نے اپنے حاشیہ (۱/۵۵) میں اسی طرح کی بات لکھی ہے۔ اسی بنیاد پر ان لوگوں نے مسلمانوں کو کتاب وسنت کے سمجھنے سے روک دیا اور ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید ان پر ضروری قرار دے دی جیسا کہ صاحب "الجوہرہ" نے کہا ہے ان میں سے ایک بڑے عالم کی تقلید واجب ہے۔ لوگوں نے اسی طرح واضح لفظوں میں بیان کیا ہے۔ ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ علم حدیث اور علم فقہ میں پختگی آچکی اور وہ سوکھ چکے[2] انھوں نے ابوالحسن کرخی کے اس قول "ہر وہ آیت جو اس طریقے کے خلاف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا تو مؤول ہے یا منسوخ اور ہر وہ حدیث جو ایسی ہو وہ یا تو مؤول ہے یا منسوخ[3] سے مزید تائید و تقویت حاصل کی یہی وجہ ہے کہ آپ جب بھی کوئی آیت یا حدیث پیش کریں وہ اس کے رد کرنے کو فورًا اپنے لئے جائز کرلیں گے، اس کے بغیر کہ وہ اس کی دلالت کے بارے میں غور و فکر کریں اور یہ دیکھیں کہ وہ دونوں واقعتہً مخالف مذہب ہیں؟ وہ آپ کو یہ کہہ کر جواب دیں گے تم زیادہ جانتے ہو یا مذہب؟

ائمہ کی وصیتوں کے خلاف اس طرح کے نئے نئے قواعد بنا کر ان لوگوں نے اپنے	اپنے ائمہ کیلئے تعصب کرنے میں مقلدوں کا انھیں کی مخالفت کرنا اور ان کی تقلید کو فرض کرنا

[1] [2] [3] (الدر المختار ۱/۵۴ حاشیہ)

اور تمام طالب علموں کے دلوں میں تقلید کو راسخ کر دیا ہے اور اسی چیز کے ذریعہ انھوں نے ان لوگوں کو کتاب وسنت کے سمجھنے سے روک رکھا ہے چنانچہ ان کے عرف میں فقہ، علماء کے ان اقوال کے سمجھنے کا نام ہو گیا ہے جو ان کی کتابوں میں آئے ہوئے ہیں۔ پھر وہ اتنے ہی کچھ پر قانع نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے مذہبی تعصب کی طرف بھی دعوت دی جیسا کہ بعض لوگوں کا قول ہے "اگر ہم سے ہمارے مذہب اور ہمارے مخالف کے مذہب کے بارے میں پوچھا جائے تو ہم لازماً کہیں گے کہ ہمارا مذہب درست ہے جس میں غلطی کا احتمال ہے لیکن ہمارے مخالف کا مذہب غلط ہے جس میں درستگی کا احتمال ہے اور اگر ہمارے اعتقاد اور ہمارے مخالف کے اعتقاد کے بارے میں ہم سے پوچھا جائے تو ہم لازماً کہیں گے کہ حق وہ ہے جس پر ہم ہیں اور باطل وہ ہے جس پر ہمارا مخالف ہے" [۱]

یہ اور ان جیسے اقوال جنھیں ہم نے ذکر نہیں کیا ہے، ائمہ متبوعین میں سے کسی نے بھی نہیں کہا ہے وہ تو اللہ کو خوب جاننے والے اور اس سے بہت زیادہ ڈرنے والے تھے وہ کب اس طرح پر منہ کھولتے؟ کیونکہ یہ دو وجہوں سے ظاہر البطلان ہے۔

اوّل :- یہ کہ یہ کتاب وسنت کے اکثر نصوص کے مخالف ہے جن میں اس بات کا حکم ہے کہ انسان علم کے بغیر کچھ نہ کہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ ولا تقف ما لیس لک بہ علم (الاسریٰ - ۳۶) جس چیز کے بارے میں تمھیں علم نہیں ہے اس پر تم مت ٹھہرو۔

یہ بات تو آپ جان ہی چکے ہیں کہ حقیقی علم وہ ہے جو قرآن وسنت میں آیا ہے پھر بھلا قرآن وسنت میں کوئی ایسی چیز کہاں ہے جو ان لوگوں کی ذکر کردہ چیز پر دلالت کرتی ہو۔

---

[۱] تاریخ التشریع الاسلامی للعلامہ الخضری ص ۳۳۲

دوم :۔ یہ کہ یہ لوگ تقلید کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، اور ان کی کتابوں کی یہ مشہور و معروف بات ہے کہ مقلد کی حجت اس کے امام کا قول ہے۔ پھر بھلا بتائیے کہ تقلید کا ثبوت ان کے ائمہ کے کلام سے کہاں ملتا ہے؟ ائمہ کی ذات اس سے دور ہے

مقلدین میں اختلاف کی کثرت اور اہل الحدیث میں اسکی قلت

جیسے یہ بات معلوم ہو گئی ان سے طول طویل صدیوں تک، طوائف مقلدین کے قابل مذمت تفرق و تشتت پر باقی رہنے کا سبب معلوم ہو گیا۔ حد یہ ہو گئی تھی کہ ان میں سے اکثر نے مخالف مذہب کے پیچھے نماز کے باطل یا مکروہ ہونے کا فتویٰ بھی دے دیا تھا اتنے ہی پر بس نہیں بلکہ بعضوں نے تو حنفی مرد کو شافعیہ عورت سے شادی کرنے سے روک دیا۔ کچھ دوسروں نے اجازت دی لیکن اس کے عکس (یعنی شافعی مرد اور حنفیہ عورت کی شادی) کی اجازت یہ علت بیان کرتے ہوئے نہیں دی کہ "عورت کو اہل کتاب کے درجے میں اتار دیا گیا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ کہہ کر خطاب ہی نہیں کیا ہے۔

"ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءھم البینات (آل عمران - ۱۰۵)

ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو واضح دلائل آ جانے کے بعد الگ الگ ہو گئے اور اختلاف کر بیٹھے۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

فتقطعوا امرھم بینھم زبرا کل حزب بما لدیھم فرحون (المومنون - ۵۳)

پس انھوں نے باہم اپنے امر کو مختلف کتابوں کے اندر الگ الگ کر لیا۔ اب ہر ایک فریق کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی پر خوش ہے۔

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ فرماتے ہیں (ا / ۴ ۳۱) "زبر" کتابوں کو کہتے ہیں یعنی ہر فرقے نے کچھ کتابیں تصنیف کر رکھی ہیں جن کو انھوں نے تھام لیا ہے انھیں پر عمل

کر رکھا ہے اور انھیں کی طرف لوگوں کو دعوت بھی دیتے ہیں لیکن ہر ایک نے دوسرے کی کتابیں چھوڑ رکھی ہیں جیسا کہ یہ ہر ایک کی طرف سے برابر سرا بر پیش آ رہا ہے۔" میں کہتا ہوں۔ شاید یہ کتابیں وہی ہیں جن کی طرف عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے عمرو بن قیس سکونی کے واسطے سے آئی ہوئی روایت میں اشارہ کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

"میں معاویہ کے پاس جانے والے ایک وفد میں اپنے والد کے ساتھ نکلا تو ایک آدمی کو لوگوں سے یہ بیان کرتے ہوئے سنا،، کہ قیامت کی علامتوں میں سے یہ ہے کہ بروں کو اونچے اٹھایا جائے اور نیکوں کو نیچے گرایا جائے [1] فعل و عمل کو بند کر دیا جائے اور قول کو ظاہر کیا جائے اور قوم کے اندر "مثناۃ،، (کتابیں) پڑھی جائیں اور کوئی ان میں ایسا نہ ہو جو انھیں بدلے یا ان پر نکیر کرے، پوچھا گیا:۔ "مثناۃ" کیا چیز ہے؟ کہا:۔ کتاب اللہ کے علاوہ جو اور چیزیں لکھ دی گئی ہیں [2]

ایسا لگتا ہے کہ اسی بنیاد پر امام احمد رحمہ اللہ کتاب و سنت کی خالص اتباع کے حریص ہونے کے ناطے ایسی کتابیں رکھنی ناپسند کرتے تھے جو تفریع اور رائے پر مشتمل ہوتی تھیں [3] کیونکہ انھیں ڈر تھا کہ لوگ ان کتابوں کو کتاب و سنت پر ترجیح دے لیں گے۔ جس طرح کہ مقلدین نے مکمل طور پر کیا ہے کہ وہ اختلاف کے وقت اپنے مذہب کو کتاب و سنت پر ترجیح دیتے اور مذہب کو کتاب و سنت کا معیار ٹھہراتے ہیں، جیسا کہ کرخی سے منقول ہو چکا ہے۔ حالانکہ کتاب و سنت

---

[1] یعنی لوگ بروں کے درجے کو بلند کرتے اور نیکوں کے درجے کو پست کرتے ہیں جیسا کہ آج یہ چیز مشاہدہ میں آ رہی ہے [2] اسکی تخریج حاکم نے کی ہے (۴/۵۵۴-۵۵۵) اور صحیح الاسناد کہا ہے، علامہ ذہبی نے اسکی موافقت کی ہے۔ روایت تو موقوف ہے لیکن پھر بھی اسے مرفوع ہونے کا حکم حاصل ہے کیونکہ یہ ایسے غیبی امور سے متعلق ہے جو صرف عقل سے نہیں کہی جا سکتی خصوصاً جبکہ بعض رواۃ نے مرفوعاً ذکر کیا ہے اور اس روایت کو بھی صحیح قرار دیا ہے [3] ابن الجوزی مناقب احمد ص ۱۹۲

کا معیار ٹھہراتے ہیں جیسا کہ کرخی سے منقول ہو چکا ہے حالانکہ کتاب وسنت کی اتباع واجب تھی جیسا کہ قرآن وسنت کی گزشتہ دلیلیں اس کا تقاضا کرتی ہیں اور انھیں کے اماموں کے اقوال سے ان پر اس چیز کا وجوب ثابت ہو چکا ہے نیز یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس کے پاس بھی کتاب وسنت ہو اس کے ساتھ تمام دوسرے مذاہب منظم کر دینا چاہیئے۔ لیکن سخت افسوس کی بات ہے کہ لوگ آپس میں اختلاف اور نزاع ہی کرتے رہے ہیں۔ اسی وجہ سے علامہ ابن القیم (۲ / ۲۳۲) اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے اس قول "وانہ من یعش منکم فسیری اختلا فا کثیرا، فعلیکم بسنتی ،، جو تم میں سے زندہ رہے گا وہ بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا۔ اس لئے تمھیں میری سنت کو لازم پکڑنا چاہیئے۔

کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں "یہ اختلاف کرنے والوں کی مذمت اور ان کے راستے پر چلنے سے تحذیر ہے۔ اختلافات کی کثرت اور اس کے اس قدر وسیع پیمانے پر ہونے کا سبب تقلید اور ایسے مقلدین ہیں جنھوں نے دین کے ٹکڑے کر دیئے اور اہل اسلام کو گروہوں کے اندر بانٹ دیا۔ ہر فرقہ اپنے متبوع کی حمایت کرتا اس کی طرف بلاتا اور اس کی مخالفت کرنے والوں کی مذمت کرتا ہے۔ یہ لوگ ان لوگوں کے قول پر عمل کرنے کو جائز خیال ہی نہیں کرتے جیسے وہ ان سے الگ کوئی اور امت ہیں۔ وہ ان کی تردید میں کافی زحمت اور مشقت اٹھاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں "ان کی کتابیں ہماری کتابیں، ان کے ائمہ ہمارے ائمہ اور ان کا مذہب ہمارا مذہب" حالانکہ سب کا نبی ایک قرآن ایک اور رب ایک ہے۔

اس لئے تمام لوگوں پر لازم ہے کہ سب کے سب ایک کلمہ کے تابع ہو جائیں جو ان سب کے درمیان برابر ہے کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کی اطاعت نہ کریں، کسی کے بھی اقوال کو رسول کے اقوال کی طرح نصوص کی حیثیت نہ دیں۔ اور کوئی بھی دوسرے کو اللہ کو چھوڑ کر رب نہ بنائے۔ اب اگر وہ لوگ اس

بات پر متفق ہو جائیں اور ہر اس شخص کے تابع ہو جائیں جو اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلا رہا ہو اور اپنا مقدمہ سنت اور آثار صحابہ کے سامنے پیش کریں تو گو اختلاف زمین سے معدوم نہ ہو پھر بھی کم ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے کم اختلاف اہل الحدیث کے یہاں ہوتا ہے۔ ان سے کم اختلاف اور ان سے زیادہ اتفاق والا کوئی گروہ نہیں ہے کیونکہ ان کی بنیاد اسی اصول پر ہے۔ جب بھی کوئی گروہ حدیث سے دور ہو گا اس کا باہمی اختلاف بہت زیادہ اور بہت شدید ہو گا۔ کیونکہ جو شخص حق بات کو رد کر دے گا اس پر معاملہ مشتبہ اور ملتبس ہو جائے گا اور اس پر وجہ صواب اس طرح مخفی ہو جائے گی کہ وہ یہ نہیں جان پائے گا کہ کہاں جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

بل کذبوا بالحق لما جاءھم فھم فی امر مریج (ق - ۵)

جب حق بات ان کے پاس آئی تو انھوں نے جھٹلا دیا اسلئے وہ ایک مشکوک چیز میں پڑے ہیں۔

علامہ ابن القیم نیز فرماتے ہیں (۲ / ۲۴۴) ہم اس بات کا دعویٰ نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی پوری مخلوقات کے اوپر یہ چیز فرض کر دی ہے کہ وہ دین کے ہر چھوٹے بڑے مسئلے میں سے حق بات کو دلیل سے جانیں۔ ہم نکیر انھیں چیزوں پر کرتے ہیں جن پر ائمہ نے اور ان سے پہلے کے گذرے ہوئے لوگوں میں سے صحابہ و تابعین نے کی ہے اور ان چیزوں پر کرتے ہیں جو خیر القرون کے گذرنے کے بعد چوتھی صدی ہجری جس کی مذمت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانی ہوئی ہے۔ میں اسلام کے اندر اس طرح پیدا ہو گئیں کہ ایک آدمی کو متعین کر لیا گیا، اس کے فتاویٰ کو شارع کے نصوص کے درجے میں رکھ دیا گیا۔ بلکہ اس کے فتاویٰ کو شارع کی تنصیص پر مقدم کر دیا گیا، اس کے قول کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی امت کے تمام علماء کے اقوال پر فوقیت دے دی گئی اور احکام کو کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور اقوال صحابہ سے حاصل کرنے کے بجائے صرف اسی کی تقلید کو کافی سمجھ لیا گیا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ مقلد صرف وہی باتیں کہتا ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں ہے حالانکہ یہ ایسی شہادت پر مشتمل ہے

جیسے شاہد نہیں جانتا اور اللہ کے بارے میں بغیر علم کے ایک بات کہتا ہے اس کے علاوہ اس میں ان لوگوں کے متعلق یہ خبر دینا ہے کہ وہ لوگ کتاب وسنت میں درستگی کو نہیں پا سکے جنھوں نے اس کے امام کے خلاف رائے قائم کی ہے کہ وہ اس امام سے زیادہ علم رکھنے والے رہے ہوں۔ اور مقلد کہتا ہے کہ میرے ہی امام درستگی پر ہیں یا کہتا ہے کہ دونوں کی باتیں کتاب وسنت سے درست ہیں۔ حالانکہ دونوں کے اقوال باہم متعارض ہیں اس طرح مقلد کتاب وسنت کے دلائل کو متعارض اور متناقض ٹھہراتا ہے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول بیک وقت ایک شی اور اس کی ضد کا حکم صادر کرتے ہیں ایسے شخص کا دین آراء رجال کے تابع ہے اس کے لئے نفس الامر میں کوئی متعین حکم نہیں ہے وہ یا تو اس طریق کو اپنا مسلک قرار دے یا اپنے امام کے خلاف کہنے والے کی تغلیط کرے۔ اسے دونوں میں سے کوئی ایک ہی چیز کرنی ضروری ہے۔ یہ اس مقلد کے لئے تقلید کی برکت ہے۔

جب یہ بات معلوم ہو گئی تو ہم کہتے ہیں اور ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر یہ چیز واجب کی ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق تقویٰ اختیار کریں اور اصل تقویٰ اس چیز کی معرفت ہے جس سے تقویٰ اختیار کیا جائے اور پھر اس کے اوپر عمل کیا جائے۔ اسی وجہ سے ہر بندے پر واجب ہے کہ وہ اس چیز کی معرفت حاصل کرنے میں اپنی پوری کوشش صرف کرے جس سے اسے تقویٰ اختیار کرنا ہے یعنی اس کی معرفت حاصل کرے جس کے کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور جس کے کرنے سے روکا ہے۔ اس کے بعد اللہ کی اور اللہ کے رسول کی اطاعت لازم پکڑے اور جو چیز اس پر مخفی رہ جائے اس میں وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اپنے جیسے اور لوگوں ہی کی طرح ہے کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے علاوہ ہر شخص پر آپ کی لائی ہوئی بعض چیزیں مخفی رہ گئی ہیں۔ اہل علم ہونے کے ناطے وہ اس کلیہ سے خارج نہیں ہو سکے۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے کسی بھی شخص کو حق کی معرفت اور اس کی اتباع

کے سلسلے میں اس چیز کا مکلف نہیں بنایا ہے جس کی اسے طاقت نہیں ہے۔

تقلید کی تباہ کاریاں اور مسلمانوں پر اسکے برے اثرات

معزز بھائیو! تقلید کی تباہی اور امت کے اوپر اس کے برے اثرات، اس تھوڑے سے وقت میں ہمارے بیان سے باہر ہیں البتہ کچھ مخصوص کتابیں ہیں جن میں اس سلسلے کی تفصیلات ہیں جو شخص مزید معلومات حاصل کرنی چاہتا ہو اسے انھیں کتابوں کی طرف مراجعت کرنی چاہیئے۔ ان کتابوں میں یہ بیان کرنا مقصود رہا ہے کہ تقلید ہی واحد سبب ہے یا دکم از کم) وہ بہت سے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب ہے جس نے مسلمانوں کو کتاب وسنت کی اتباع سے پھیر دیا اور رجال مقلدین کو چھوڑ کر انھیں دونوں چیزوں سے تعصب پیدا کر دیا ہے۔ میں نے جیسا کہ سنا ہے مقلدین کے تمام گروہوں نے تقلید کو ایسا واجبی امر اور قابل اتباع دین ٹھہرا دیا ہے جس سے خروج چوتھی صدی ہجری کے بعد کسی بھی شخص کے لئے جائز نہیں اور اگر کوئی خروج کرتا ہے تو اسے مختلف القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے اوپر چاروں طرف سے اندھا دھند یلغار کر دی جاتی ہے اور جو چیزیں اس کے اندر نہیں ہیں ان کے ذریعہ اتہام لگائے جانے سے وہ محفوظ نہیں رہتا۔ یہ چیز ہر وہ شخص جانتا ہے جس نے اس سلسلے میں لکھی گئی فریقین کی کچھ کتابیں دیکھی ہیں۔

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے "اعلام الموقعین" میں تہتر (۷۳) صحیح اور صریح حدیثوں کو بطور مثال پیش کیا ہے جنھیں مقلدین نے رد کر دیا ہے آپ نے ان حدیثوں پر تفصیلی بحث کی ہے جس میں مقلدین سے سنجیدہ علمی مناقشہ کیا ہے ابتداء میں عقائد کے سلسلے کی رد کردہ حدیثوں کی مثالیں ہیں مثلاً مخلوقات پر اللہ تعالیٰ کا علو اور عرش پر اس کا استوار۔

اس کی تاکید مزید کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیخ فلانی رحمہ اللہ کی کتاب "ایقاظ الھمم" ص ۹۹ میں ہے کہ علامہ محقق ابن دقیق العید رحمہ اللہ نے ان مسائل

کو ایک ضخیم جلد کے اندر جمع کر دیا ہے جن میں ائمہ اربعہ کا انفرادی یا اجتماعی مذہب صحیح حدیث کے خلاف ہے اس کی ابتدا میں آپ فرماتے ہیں "ان مسائل کو ائمہ مجتہدین کی طرف منسوب کرنا حرام ہے۔ ضروری ہے کہ فقہاء و مقلدین ان مسائل کے متعلق جانکاری حاصل کریں تاکہ وہ ائمہ کرام کی طرف ان کی نسبت کرکے ان پر بہتان نہ لگائیں

مہذب مسلمان نوجوان کا آج کا فریضہ

بھائیو! خاتمہ کلام یہ ہے کہ میں اپنی ان باتوں سے اس بات پر آمادہ نہیں کرنا چاہتا کہ آپ سب مجتہد ائمہ اور محقق فقہاء بن جائیں۔ گو یہ میرے اور آپ دونوں کے لئے خوشی کی چیز ہے۔ کیونکہ یہ چیز عادۃً اس وجہ سے غیر ممکن ہے کہ اختصاصات مختلف ہوتے ہیں اور متخصصین کے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون میں اختلاف ہوتا ہے۔ دراصل میں صرف دو چیزیں کہنی چاہتا ہوں"

اوّل :۔ یہ کہ اس چیز سے باخبر رہئے جو آج بہت سے مہذب مسلمان نوجوانوں پر مخفی ہے۔ دوسروں کو تو چھوڑئے بات یہ ہے کہ انھوں نے بعض اسلامیات پر لکھنے والے لوگوں مثلاً سید قطب رحمۃ اللہ اور علامہ مودودی حفظہ اللہ وغیرہ کی کتابوں اور ان کی مساعی کے طفیل جس وقت یہ جانا ہے کہ تشریع کا حق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اس میں کوئی انسان اس کا شریک ہے نہ کوئی اور شکل۔ اسی کو انھوں نے "حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے"، کے ذریعہ بیان کیا ہے اور یہ چیز تو اس کتاب کی ابتدا میں دی گئی کتاب و سنت کی نصوص میں صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ٹھیک اسی وقت ان نوجوانوں میں اکثر کو اس کے بعد خیال نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ کے مبدأ حاکمیت ہونے میں جس مشارکت کی نفی کی گئی ہے اس کی بابت اس میں کچھ فرق نہیں کہ اللہ کو چھوڑ کر جس انسان کی پیروی کی گئی ہے وہ مسلمان ہو جس نے اللہ کے کسی حکم کے اندر غلطی کی ہو یا کافر ہو جس نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شارع بنا لیا ہو یا وہ عالم ہو یا جاہل۔ اس

میں سے ہر ایک اللہ کے مبدأ حاکمیت ہونے کے منافی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ نوجوان اس پر ایمان لاچکا ہے۔ یہی وہ چیز تھی جس پر میں آپ کو متنبہ کرنا چاہتا تھا اور اب میں آپ کو اسی کی نصیحت کرتا ہوں کیونکہ نصیحت مومنوں کو فائدہ پہونچاتی ہے۔ میں نے نوجوانوں کو پوری جرأت اور قابل تعریف اسلامی غیرت کے ساتھ خطبہ دیتے سنا ہے جس میں وہ ثابت کرتے ہیں کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اس کے لئے وہ غیر اسلامی حاکم نظاموں کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ یہ بڑی اچھی چیز ہے گو ہم اس وقت تبدیلی لانے کی استطاعت نہیں رکھتے لیکن ٹھیک اسی اثناء میں ہم میں سے بہت سے لوگوں کے دلوں میں ایک ایسی چیز پائی جاتی ہے جو مبدأ مذکور کی نفی کرتی ہے اس کا بدلنا آسان ہے لیکن ہم مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں نہ انھیں اس کی نصیحت کرتے ہیں۔ یہ چیز ہے تقلید کو دین بنالینا اور کتاب وسنت کی نصوص کو تقلید کی وجہ سے رد کردینا۔ آپ اگر کہیں اس جرأت مند خطیب کو کسی آیت یا حدیث کی خلاف ورزی کرنے پر ٹوک دے تو وہ فوراً مذہب سے استدلال کرے گا، اس کے بجائے، سخت افسوس کے ساتھ کہ وہ اس بات پر متنبہ ہوتا کہ اس کا یہ عمل اس عظیم مبدا کو لغو کر دیتا ہے جس کی دعوت اس نے لوگوں کو دی ہے۔

چنانچہ اللہ عزوجل فرماتا ہے :۔

انما کان قول المومنین اذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا واطعنا واولئک ھم المفلحون ۞ (النور - ۵۱)	مومنوں کو جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف دعوت دی جائے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو ان کی بات یہی ہونی چاہیئے کہ وہ کہیں ہم نے سن لیا اور مان لیا یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

اس جرأت مند خطیب نے جب تنبیہ اور دلیل کو سن لیا تو اس پر لازم تھا

کہ وہ اسے مان لینے میں جلدی کرتا کیونکہ علم یہی ہے۔ تقلید کے دامن میں پناہ نہ لیتا کیونکہ یہی جہالت ہے۔

ثانی :- یہ کہ آپ میں سے ہر ایک اپنے دل کے اندر ایک ایسا واجبی درجہ پیدا کرے جس کا ہر مسلمان کے لئے اس کے مقدور بھر پایا جانا ممکن اور آسان ہے ہاں یہ درجہ تحقیق و اجتہاد کے اس درجہ سے کم ہے جس کے رجال صرف خواص ہیں یہ درجہ ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا، اور اس اتباع کو صرف آپ ہی کے لئے مخصوص رکھنے کا آپ میں سے ہر ایک کو اسے اپنے مقدور بھر کرنا چاہیئے۔ آپ حضرات جس طرح اپنی عبادت کو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص رکھتے ہیں اسی طرح اپنی اتباع کو صرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص کرلیں۔ یوں آپ کا معبود ایک ہوگا اور آپ کا متبوع ایک ہوگا۔ اس طرح پر کرکے آپ لا الٰہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی شہادت کا عملی ثبوت پیش کردیں گے۔

معزز بھائیو! آپ سب اپنے آپ پر لازم کرلیں کہ آپ ہر اس حدیث پر ایمان رکھیں گے جو آپ کے نزدیک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوگی، وہ عقیدہ سے متعلق ہوگی خواہ احکام سے، اور وہ آپ کے اس امام کا قول ہوگا جس کے مذہب پر آپ اپنے معاشرہ کے رواج کے مطابق پروان چڑھے یا انکے علاوہ ائمہ مسلمین میں سے کسی اور کا ہوگا۔ آپ ایسے قاعدہ کو بنیاد نہیں بنائیں گے جسے بعض ایسے لوگوں نے جو مجتہد بھی نہیں تھے، قیاسات اور اجتہادات سے وضع کیا۔ اگر ایسا ہوا تو یہ چیز اتباع سنت کے راستے میں روک بن جائے گی۔ آپ کسی بھی انسان کی، خواہ وہ کیسا ہی بڑا اور بزرگ کیوں نہ ہو، تقلید نہ کریں ورنہ اس طرح قول رسول کے پالینے کے بعد اس پر اپنے امام کے قول کو آپ ترجیح دے رہے ہوں گے :

خوب اچھی طرح جان لیجئے کہ صرف اور صرف اسی طرح پر اس مبدأ حاکمیت کو علماً اور عملاً ثابت کر سکتے ہیں جس کا قول ہے ۔کہ " لا الٰہ الا اللہ منہج حیات ہے" اور "حاکمیت صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے ہے"، اس کے بغیر اس "منفرد قرآنی نسل" کو پانا محال ہے جو، مسلم معاشرہ، اس کی خصوصیات، اور آگے چل کر گم شدہ مسلم حکومت کو جنم دینے کی استطاعت رکھنے میں واحد و یکتا ہے۔ اس سے اس سچی حکمت کی بھی تصدیق ہو گی جسے ایک بہت بڑے داعی اسلام رحمہ اللہ نے پیش کیا ہے کہ " اسلامی حکومت کو اپنے دلوں کے اندر قائم کرو وہ زمین پر خود قائم ہو جائے گی"، امید ہے کہ ایسا جلد ہی ہو گا۔

یا ایھا الذین آمنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم واعلموا ان اللہ یحول بین المرء وقلبہ وانہ الیہ تحشرون ٥ (الانفال - ۲۴)	اے مومنو! جب اللہ اور رسول تم کو اس چیز کی طرف بلائیں جو تمھیں زندگی بخشتی ہے تو تم ان کی باتیں سن لو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ انسان کے اور اس کے دل کے درمیان گردش میں ہے اور یہ بھی جان لو کہ تم سب اسی کے پاس اکٹھے کئے جاؤ گے ÷

تیسرا رسالہ تمام ہوا۔
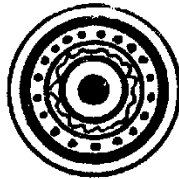
حدیث کی
تشریعی حیثیت واہمیت کی توضیح
اور
دعوت عمل بالکتاب والسنۃ کی تائید
سے متعلق
شیخ الحدیث علامہ محمد اسمٰعیل سلفی رحمۃ اللہ تعالیٰ
کے ۵ فکر انگیز
مقالات

۱
پہلا مقالہ
حدیث کی
تشریعی اہمیت

حدیث کی تشریعی اہمیت

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الخلق اجمعین۔ محمد خاتم النبیین وعلی اصحابہ وآلہ والذین اتبعوھم باحسان من فقہاء المحدثین ومن اخذ اخذھم الی یوم الدین اما بعد:۔ فھذہ وریقات تشتمل علی محاضرۃ القیتھا فی الحفلۃ السنویۃ لجمعیۃ اھل الحدیث بفیصل آباد ننشرھا بعد تھذیبھا وتنقیحھا عسی اللہ ان ینفع بہ طلاب العلم والحق الذی بعث اللہ بہ محمدا صلی اللہ علیہ وسلم ویھدی بہ من یشاء الی صراط مستقیم:

ادلۂ شرعیہ کے تذکرہ میں قرآنِ عزیز کے بعد ائمہ سنت علی العموم علوم نبوت کے متعلق چار لفظ ذکر فرماتے ہیں۔

(۱) خبر (۲) اثر (۳) حدیث (۴) سنت

عاملین بالحدیث جو کتاب اللہ کے بعد حدیث کی حجیت پر یقین رکھتے اور اسے حجتِ شرعی سمجھتے ہیں وہ دین کی کتابوں میں مختلف نسبتوں سے مشہور ہیں

• اہل سنت • اہل حدیث • اہل الاثر

خبر کسی واقعہ کی اطلاع اور اس کی حکایت کو کہا جاتا ہے **الخُبر** اور خُبار نرم زمین اور غبار کو بھی کہا جاتا ہے الخبر الارض الرخوۃ السھلۃ ثلث ربع پر زمین کی کاشت کے معاملہ کو مخابرہ کہتے ہیں۔

زبان کے لحاظ سے تو واقعہ کی ہر اطلاع اور تذکرہ کو "خبر" کہا جاتا ہے مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات پر جب یہ لفظ بولا جائے تو حدیث

کے مترادف ہوگا یعنی اخبار الرسول کے ہم معنی ہوگا۔

اثر کسی چیز کے بقیہ اور نشان کو کہتے ہیں۔ فانظر الیٰ اثار رحمۃ اللہ (القرآن) نقل کو اثر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ان الذی فیہ تماریتما بایّن السامع والاثری

(جس بات میں تم بحث کر رہے ہو وہ سننے والے اور ناقل کی نگاہ میں برابر ہے)

صحابہ اور تابعین سے جو مسائل منقول ہیں انھیں آثار کہا جاتا ہے۔

ایتونی بکتاب من قبل ھذا او اثارۃ من علم (اس سے پہلے کی کوئی کتاب لاؤ یا کوئی علمی نقل"

آنحضرت ؐ کے ارشادات پر بھی اثر کا لفظ بولا جاتا ہے اور عموماً اس کا استعمال اضافت سے ہوتا ہے۔ جب آثار الرسول کہا جائے تو یہ حدیث اور سنت کے مترادف ہوگا اور مطلقاً بولا جائے تو آثارِ صحابہ مراد ہوں گے یا اس کا لغوی مفہوم۔

حدیث حدیث کا لفظ لغت میں قدیم کی ضد ہے۔ اس کا مصدر حدث ہے جس کا اطلاق نئے عوارض پر ہوتا ہے رجل حدث کے معنی جوان آدمی ہے۔ انسان کے منہ میں دانتوں کی بندش کے اندر قدرت نے ایک ایسی مشین نصب کر دی ہے جو غیر شعوری طور پر بلا تامل نئے سے نئے الفاظ بناتی چلی جاتی ہے۔ منہ کے خول میں ہوائی حرکت اور حلق کی آخری حد تک ہوا کے تموّج سے لاکھوں الفاظ منٹوں میں بن جاتے ہیں جن میں ایک سے ایک نیا اور جدا ہوتا ہے۔ دانتوں اور ہونٹوں کی رکاوٹ الفاظ کے بننے اور مخارج کی صحت میں مدد دیتی ہے۔ ذٰلک تقدیر العزیز العلیم

انسان کے اور بھی بیسیوں اعضاء ہیں لیکن الفاظ اور نطق کی مشینری صرف منہ میں نصب کی گئی ہے۔ معلوم نہیں دنیا کا سب سے پہلا انسان جب اس نے

افہام وتفہیم کے لئے اس مشینری سے پہلے پہل کام لیا ہوگا تو وہ کتنا خوش ہوا ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر اس نے کیتے سجدے کئے ہوں گے۔

فتبارك الله احسن الخالقين

اس گفتگو کو عربی زبان میں حدیث کہتے ہیں۔ اس کی جمع صحیح مذہب کے مطابق احادیث ہے۔ دنیا کے عجائبات اور خلافِ امید واقعات کی حکایات اور قصوں کو بھی احادیث فرمایا گیا ہے۔ فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ

ہم نے حوادث کو کہانیوں کی صورت دے دی۔ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنْ رَبِّهِمْ مُحْدَثٍ

راغب فرماتے ہیں۔ الحديث وجود الشيئ بعد ان لم يكن احتے احداث لك منه ذكرا تاويل الاحاديث لا يكادون يفقهون حديثا سب اسی قسم کے محاورات ہیں۔

آنحضرتؐ کے ارشادات کو اور قرآن عزیز کو بھی حدیث کا نام دیا گیا۔ إِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا۔

"جب آنحضرتؐ نے اپنی بعض بیویوں سے آہستہ بات کی"، مَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا "اللہ تعالیٰ سے زیادہ کس کی حدیث سچی ہے"

سنّت سین اور نون مشدد میں قوت، پختگی اور متوارث عادات کا مفہوم ہوتا ہے۔ سن، سنان، مسنون، سنۃ ان تمام الفاظ کا ایک ہی ماخذ ہے۔ سن دانت کو کہتے ہیں۔ سنان نیزے کے پھل کو کہا جاتا ہے۔ مسنون خشک کیچڑ پر بولا جاتا ہے۔ سنۃ لغت میں اس راستہ کو کہا جاتا ہے جس پر متواتر چلنے کی وجہ سے وہ صاف اور واضح ہوگیا ہو جسے طریق معبد سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ راسخ عادات اور مستمر اعمال پر بھی سنت کا اطلاق متعارف ہے۔ اسی محاورہ کے مطابق طریقہ اور سیرت بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ زبان

کے لحاظ سے اچھی اور بری عادات دونوں پر سنت کا لفظ بولا جاتا ہے۔ حدیث مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ اَجْرُهَا وَ اَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا وَمَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَلَهُ اَجْرُهَا وَ اَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا ۔ میں سنت کا لفظ اسی لغوی لحاظ سے فرمایا ورنہ سنتِ نبوی کی صفت سیئہ کیسے ہو سکتی ہے۔ فَاِنَّ السُّنَّةَ خَيْرٌ كُلُّهَا بعض احادیث میں بعض اعمال کے متعلق بعض صحابہؓ نے نِعْمَتِ الْبِدْعَةُ هٰذِهٖ کے الفاظ ارشاد فرمائے ہیں جس سے مراد بدعت لغوی ہے ورنہ مصطلح بدعت کے متعلق جب آنحضرت کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة فرمائیں تو ضلالت کو ضلالت حسنہ کون کہہ سکتا ہے؟

شارع کی زبان میں آنحضرتؐ کے قول و فعل خاموشی اجتہاد نبوی سب سنت میں داخل ہیں۔ معتزلہ نے انبیاء علیہم السلام کے متعلق اجتہاد و استنباط کا انکار کیا ہے لیکن ائمہ سنت انبیاء کے لئے اجتہاد کو جائز سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی اصلاح نہ فرمائی جائے تو یہ بھی سنت میں شامل ہے۔

اصولِ فقہ کے متون میں بعض علماء نے فرمایا سنت کا لفظ صرف آنحضرتؐ کے اعمال پر بولا ہے اور حدیث کا لفظ اقوال پر لیکن ادلہ شرعیہ کے تذکرہ میں وہ حدیث اور سنت کو مترادف اور ہم معنیٰ سمجھتے ہیں۔ سنت کا لفظ جب اضافت سے استعمال ہو تو سنت نبوی سے مراد احادیث نبوی ہی لی جاتی ہیں۔

سنت شرعی اصطلاح کے مطابق شرعی اور دینی احکام کے لئے ماخذ ہے یہ بھی ضروری نہیں کہ سنت بصراحت قرآن عزیز میں موجود ہو۔ شوکانی فرماتے ہیں :-

اعلم انه قد اتفق من يعتد به من اهل العلم على ان السنة المطهرة مستقلة بتشريع الاحكام وانها كالقرآن فى تحليل الحلال وتحريم الحرام (ارشاد الفحول ص۳۱)

"سنت احکام کے اثبات اور تشریع میں مستقل اصل ہے اور حلال و حرام کے احکام بالاستقلال سنت میں موجود ہیں"

سوچئے کہ اگر ایک حکم قرآن اور سنت میں بصراحت موجود ہو اور آپ اسے مان لیں تو آپ نے سنت پر کیا احسان کیا؟ وہ تو قرآن ہے! اس کا انکار کیسے ممکن تھا۔ ہاں یہ درست ہے کہ اگر کوئی حدیث یا سنت قرآن کے صراحۃً خلاف ہو تو وہاں قرآن ہی کی صراحت پر عمل ہوگا۔ گو یہ فی الواقع ناممکن ہے کہ پیغمبر علیہ السلام قرآن کی مخالفت کریں۔

موضوع بحث ہمارے پیشِ نظر موضوع میں سنت اور حدیث مترادف ہیں اور شرعاً یہ دونوں حجت ہیں بلکہ جن احادیث کو آنحضرتؐ کے اقوال سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ بھی دراصل افعال ہی ہیں کیونکہ قول زبان کا فعل ہے اسی طرح تقریر اور اجتہاد یہ بھی دراصل فعل ہی ہیں اور سنت ان سب کو شامل ہے اور تکمیلِ دین کے لئے ان سب پر یقین اور ایمان لانا ضروری ہے ورنہ قرآن اور متواتر سنن اپنی کثرت کے باوجود زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی نہیں ہو سکتے۔

مسلم الثبوت میں بھی سنت کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔ ما صدر من الرسول غیر القراٰن من قول و فعل و تقریر (شرح مسلم الثبوت بحر العلوم ۲/ ۳۸۶)

ائمہ سنت کے نزدیک جو سنت حجت شرعیہ شمار کی گئی ہے اور جسے احکام کا ماخذ سمجھا گیا وہ ضروری ہے کہ قرآن کے علاوہ ہو۔ اس کی تصریحات قرآن عزیز کی تصریحات سے مختلف ہوں گی لیکن مخالف نہیں ہوں گی۔

سنّت کی حیثیت قرآن عزیز کے الفاظ جس تواتر اور قطعیت سے ہم تک پہنچے ہیں سنت کو وہ مقام حاصل نہیں ہوا۔ سنت کا گو بہت بڑا ذخیرہ متواتر ہے لیکن تمام مروی متون کو قطعیت اور تواتر کا یہ شرف حاصل نہیں ہوا۔ عبادات اور اعمال کا کثیر سرمایہ متواتر ہے، نماز، اس کے فرائض، سنن

اذکار تنوع کے باوجود بحیثیت مجموعی متواتر ہیں مگر معاملات، مغازی اور سیرت کا بہت سا ذخیرہ اخبار آحاد ہیں۔ علم الاسناد کے مباحث اور رجال میں جرح و تعدیل کی وجہ سے آحاد کے ذخیرہ میں وہ قطعیت نہیں رہتی۔ عبادات کے بھی بعض گوشے آحاد ہی کے مرہون منت ہیں لیکن ان آحاد کا مقام بھی اخباری روایات سے کہیں زیادہ ارفع ہے۔ محدثین کی تنقید اور نقل، اخبار اور تاریخ سے مختلف اور بہت زیادہ موثق ہے بلکہ علماء نے صحیح اخبار آحاد کے قبول اور ان پر عمل کے وجوب پر اتفاق فرمایا۔ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے گو وہ متواتر کے برابر نہیں ہوتا لیکن بذاتِ خود وہ قابلِ استناد ہے۔ تعارض کے وقت ہوسکتا ہے کہیں آحاد کو نظر انداز کیا جائے ورنہ عام حالات میں تمام فقہاء اور محدثین نے آحاد کو قبول فرمایا ہے۔ ان سے مسائل استنباط فرما کر آحاد کی ظنیّت کو شکوک و اوہام کے مترادف نہیں گردانا جیسا کہ اکثر منکرینِ حدیث سمجھتے یا کہتے ہیں۔ ائمہ اسلام نے رائے اور قیاس پر اخبار آحاد کو ہمیشہ ترجیح دی ہے۔ اسی لئے اہل علم نے اجتماعی طور پر علم الحدیث کو تاریخ اور اخباری روایات سے بالکل الگ سمجھا ہے۔ ائمہ حدیث اور ائمہ تاریخ کا تعلق عام اور خاص کا سا ہے۔ یعنی ہر محدث اخباری ہوتا ہے لیکن ہر اخباری محدث نہیں ہوتا۔

بعض اہل علم دونوں فنون کے جامع ہیں۔ حافظ ابن جریر، حافظ ابن کثیر امام بخاری، ذہبی وغیرہ محدث بھی ہیں اور مؤرخ بھی لیکن مؤرخین میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل ہیں اس لئے وہ محدث نہیں ہوسکتے۔

میرا مقصد یہ ہے کہ چونکہ حدیث کے پورے ذخیرہ کا ثبوت اس طرح متواتر نہیں جس طرح قرآن عزیز کا متواتر ہے۔ اسی لئے ائمہ سنت نے احادیث کو ادلۂ شرعیہ میں ثانوی حیثیت دی ہے لیکن ثبوتِ مسائل کے لحاظ سے بعض وقت نصوصِ حدیث قرآن سے بھی مقدم ہوتے ہیں۔ مسئلہ حدیث سے ثابت ہوتا ہے اور امت اس پر عمل

تک عمل کرتی رہتی ہے مگر قرآن میں اس کی تائید مدتوں بعد ہوتی ہے مثلاً۔

۱۔ نماز آنحضرتؐ پر معراج کی رات فرض ہوئی۔ اس کی تفصیلات یعنی اذکار تعداد رکعات اسی وقت بذریعہ سنت واضح فرمائے گئے۔ قرآن عزیز نے اس کے بعد اجمالاً ان کی تائید فرمائی اور یہ سلسلہ عرصہ تک چلتا رہا۔
(البرھان زرکشی۔ اتقان)

۲۔ نماز کے لئے طہارت شرط تھی۔ معراج کی صبح حضرت جبریلؑ نے آنحضرتؐ کو طہارت کا طریق سکھایا۔ پھر صحابہؓ بالالتزام وضو کرتے اور نماز ادا فرماتے رہے لیکن سورۂ مائدہ واقعہ معراج سے تقریباً آٹھ سال بعد ۶ھ میں نازل ہوئی جس میں وضو اور اس کے فرائض بیان فرمائے گئے۔ معلوم ہے کہ معراج کا سفر صحیح روایت کے مطابق ۱۲ھ نبوی میں ہوا یعنی ہجرت سے قریباً دو سال پہلے۔

۳۔ نماز جمعہ مدینہ منوّرہ میں آنحضرتؐ کی تشریف آوری اور ہجرت سے پہلے ہی صحابہؓ نے شروع کر دی تھی۔ اسعد بن زرارہؓ آنحضرتؐ کی آمد سے پہلے مدینہ منورہ میں جمعہ پڑھاتے تھے۔ سورۂ جمعہ جس سے فرضیت جمعہ پر استدلال کیا جاتا ہے۔ صحیح روایات کے موافق سفر ہجرت میں مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے نازل ہوئی۔ جمعہ پہلے شروع ہو چکا تھا۔ سورۂ جمعہ میں اس کی تائید ہوئی۔ سورۂ جمعہ کو مشہور روایت کے مطابق اس لئے مدنی مان لیا جائے کہ وہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی تو مسئلہ اور بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن میں جمعہ کی فرضیت کا حکم اس وقت آیا جبکہ جمعہ مدینہ میں شروع ہو چکا تھا۔

۴۔ موسیٰ علیہ السلام کو مدین سے واپسی پر نبوت عطا فرمائی گئی لیکن اسوقت تورات نہیں دی گئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون، ہامان اور ان کا بر قبطے سے مقابلہ سنت کی بنا پر کیا یہ سلسلہ وحی غیر متلو ہی کی بنا پر چلتا رہا۔ قرآن عزیز

ظاہر ہے کہ تورات فرعون کی ہلاکت کے بعد تیہ کے جنگل کی اقامت کے ایام میں عنایت فرمائی گئی۔ فرعون کی تباہی اور بربادی کا پہلا منظر سنت کی مخالفت ہی کی وجہ سے ہوا۔ چنانچہ سورۂ قصص میں فرعونی عساکر کی تباہی کے بعد فرمایا :-

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِ مَا أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ الْأُولَى بَصَائِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ○

(۲۸ / ۴۳)

پہلے لوگوں کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے موسیٰ کو کتاب دی جسمیں لوگوں کیلئے بصیرت ہدایت اور رحمت تھی تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں "

سنّت قرآن میں

اب قرآن عزیز میں سنت کی ضرورت کو ملاحظہ فرمائیں بعض انبیاء کا انحصار مدت العمر سنت ہی پر رہا۔ سورۂ نساء میں ہے،

۱۔ إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَوْحَيْنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَى وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا (۴ / ۱۶۳)

"ہم نے آپ کی طرف وحی کی جیسے حضرت نوحؑ اور ان کے بعد آنے والے نبیوں کی طرف کی اور ہم نے حضرت ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، ان کی اولاد اور حضرت عیسیٰؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ اور سلیمانؑ کی طرف وحی کی اور ہم نے حضرت داؤدؑ کو زبور مرحمت فرمائی "

آنحضرتؐ کی وحی کو حضرت نوح کے بعد آنے والے تمام انبیاء سے تشبیہ دی گئی ہے ان میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت مسیحؑ اور حضرت داؤد کے سوا باقی انبیاء کے متعلق کسی کتاب کا ذکر نہیں۔ ان کی وحی از قسم سنت ہی تھی۔ آنحضرتؐ کی وحی کو جب متلو اور غیر متلو دونوں قسم کی وحی سے تشبیہ دی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ پر دونوں

قسم کی وحی نازل فرمائی گئی ہے۔ قرآن عزیز کے الفاظ نازل فرمائے اور سنت کا مفہوم بتایا گیا:۔

سنت کے متعلق کتاب اللہ اور عقل سلیم کی ان تصریحات کی بنا پر ہی علامہ موسیٰ جار اللہ نے فرمایا ہے۔ فالسنن فی الشرائع والقوانین اصل الاصول وھی فی شرع الاسلام اصل اوّل بین الاصول الاربعة والکتاب الکریم یؤید الاصل الاوّل ویثبتہ (کتاب السنة ص۴)

"شریعت اور قانون کے لحاظ سے سنت اصول اربعہ سے پہلا اصل ہے۔ کتاب اللہ اس کی مؤید اور مثبت ہوتی ہے"

۲۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۴۔ ۱۵۲)

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کا مقام الگ الگ ہو۔ ان کا خیال ہے کہ بعض کے انکار اور بعض کی اطاعت سے کوئی درمیانی سی راہ پیدا ہو جائے یہ لوگ قطعی طور پر دین حق کے منکر ہیں اور ایسے منکروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کیا گیا ہے اور جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر یقین رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی کی اطاعت میں فرق نہیں کرتے ان کو اس دیانت کا ضرور اجر ملے گا اور اللہ تعالیٰ مغفرت اور رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت میں اسباب کفر کا تذکرہ فرماتے ہوئے بھی اللہ اور اس کے رسول کو

الگ الگ اور مستقل حیثیت دی گئی ہے یعنی خدا کا انکار بھی کفر ہے اور رسول کا انکار بھی کفر کا سبب ہے۔ اس طرح ایمان کی صورت میں خدا اور انبیاء کی حیثیت کو مستقل مقام دیا گیا ہے۔ یعنی ایمان کا موجب ہونے میں بھی رسول کی مستقل حیثیت ہے۔ غرض رسول پر ایمان لانا بھی اتنا ہی ضروری ہے جیسے اللہ پر ایمان لانا اور رسول کا انکار بھی اسی طرح کفر ہے جس طرح خدا کا انکار۔

یہ بھی معلوم ہے کہ رسول اور خدا ذات کے لحاظ سے ایک نہیں ہیں۔ ایک خالق ہے دوسرا مخلوق، ایک آمر ہے دوسرا مامور، ایک مختار مطلق ہے دوسرا محتاج، ایک بے نیاز ہے دوسرا حاجت مند۔ آنحضرتؐ نے پوری زندگی میں اپنی بے نیازی اور مختارِ مطلق ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں فرمایا اور حقیقت بھی یہی ہے جس کے سر پر موت اور حدوث کی تلوار لٹک رہی ہو وہ خدائی اور بے نیازی اور مختارِ مطلق ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس لحاظ سے دنیا کے عقلمندوں میں نہ کوئی خدا اور انبیاء کی وحدت کا قائل ہے، نہ اس تفریق کو کفر کہنا قرین دانشمندی ہے۔

بنابریں جس تفریق کو یہاں قطعی کفر کہا گیا ہے وہ تفریق فی الاطاعت ہے۔ منافقین کی سیرت کا تذکرہ اسی انداز میں فرمایا گیا۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا (۴ - ۶۱)

"وہ جب انھیں خدا اور رسول کی اطاعت کے لئے دعوت دی جاتی ہے تو منافق تمھارے نام سے بدکتے ہیں"

یعنی چونکہ انھیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمودات جوامع الکلم ہیں۔ اس لئے ان میں تاویل کی گنجائش مل جائے گی لیکن آنحضرتؐ کی توضیحات و شروح آوارگی کی تمام راہوں کو روک دیتی ہیں۔

اسی وجہ سے اہل نفاق کا خیال تھا کہ خدا اور رسول میں بلحاظ اطاعت تفریق قائم

رہے۔ رسول کے ارشادات کو جب حجت اور اطاعت کے مقام سے گرا دیا جائیگا تو سنت کی تفصیلات سے نجات میسر آجائے گی اور زندگی کی آوارگیوں کے لئے گنجائش نکل آئے گی مگر قرآن فرماتا ہے یہ قطعی کفر کی راہ ہے۔ سنت کا مقام، اطاعت میں قطعًا مستقل ہے جس طرح قرآن کی تصریحات واجب الاطاعت ہیں اسی طرح قرآنِ عزیز کے علاوہ جو تصریحات پیغمبر اسلام سے منقول ہوں گی اگر قرآنی نصوص میں بصراحت موجود نہ ہوں تو بھی ان کی اطاعت بہ نصِ قرآن فرض ہے اور انکار کفر۔

آیت ۴ ر ۱۵۲ میں اسی وحدت فی الاطاعت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور اہل ایمان کا تعارف اسی طرح کرایا گیا ہے۔ لَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ "یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور رسولوں کی اطاعت میں تفریق نہیں کرتے بلکہ دونوں کی اطاعت کو ضروری اور دونوں کے ارشادات کو حجت سمجھتے ہیں"

کیونکہ یہ درحقیقت دو نہیں ان کا منبع ایک ہی ہے۔ وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۴ ر ۸۰) "رسول کی اطاعت فی الحقیقت اللہ کی اطاعت ہے ان دونوں اطاعتوں میں فرق نہیں ہے"۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۴ ر ۶۴) "ہر رسول کی اطاعت اللہ کی اجازت سے ہے (ارشاد اللہ تعالیٰ کا ہے زبان آنحضرتؐ کی)

۳۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۔ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (۴ ر ۵۹)

"اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور ارباب حکم واقتدار کی۔ لیکن اگر ان سے کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کے سپرد کرو۔ اگر تم اللہ اور آخرت پر یقین رکھتے ہو یہ

طریق انجام کار بہتر ہے"

اس مقام میں قرآنِ عزیز میں تین اطاعتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ پہلی دو اطاعتیں مستقل ہیں جن میں تصادم اور تنازع کا امکان ہی نہیں۔ اس لئے وہاں اس خطرے کا اظہار ہی نہیں فرمایا گیا۔ تیسری اطاعت غیر مستقل اور عارضی قسم کی ہے۔ امراء اور ارباب اقتدار ممکن ہے کوئی ایسی حرکت کر گزریں جو اللہ کی مرضی اور آنحضرتؐ کے ارشادات کے منافی ہو۔ اس صورت میں ان کی اطاعت ختم ہو جائے گی۔ ارباب اقتدار کے مصالح کچھ ہی کیوں نہ ہوں ان کو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ نزاع کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اس لئے انکی اطاعت عارضی ہے مستقل نہیں۔ اولی الامر سے مراد خلافتِ الٰہیہ ہو یا امارتِ شرعیہ یا مرکز ملت ان کی اطاعت عارضی ہو گی اور غیر مستقل۔ اس کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں رہیں اور ان سے نزاع نہ کریں۔

آیت کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ سربراہ اور قائد کا جو بھی نام رکھا جائے اس کی اطاعت اور وفاداری واجب ہے بشرطیکہ وہ خدا اور اس کے رسول کا وفادار ہو۔

لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق (الحدیث) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۴۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا (۳۳-۲۱)

"جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے آنحضرتؐ کی اقتدا ہی بہترین طریق کار ہے"

اُسوہ بالکسر والضم اس حالت کا نام ہے جس میں انسان کسی کی اقتدا کرے یہ اقتدا اچھائی میں ہو یا برائی میں اسی لئے آنحضرت کی اقتدا کو حسن سے مقید

فرمایا گیا ہے۔ اس آیت میں مؤکد طور پر فرمایا گیا ہے کہ آنحضرتؐ کے ارشادات اور افعال میں ان کی اقتدا اور اطاعت بہترین طریق کار ہے اور یہ اقتدا اور اتباع ہی اللہ تعالیٰ پر ایمان اور آخرت پر یقین کی دلیل ہے۔ اگر آنحضرتؐ کی اتباع کا جذبہ کسی دل میں نہیں ہے تو نہ اسے اللہ تعالیٰ سے کوئی امید رکھنا چاہیئے نہ قیامت ہی پر اس کا ایمان تصور کیا جا سکتا ہے محمدٌ فرقٌ بین الناس (الحدیث)
"کفر اور اسلام میں فرق آنحضرتؐ کی شخصیت ہے"

یہ آیت سورۂ احزاب میں ہے اس سے پہلے متبنیٰ کی بیوی سے نکاح کے متعلق آنحضرتؐ کا فیصلہ ہے پھر امہات المومنین کو ہدایات اور ان کے حقوق پھر جنگ میں آنحضرتؐ کے احکام کی اقتدا۔ یہ تمام چیزیں اسوہ میں شامل ہیں۔ اس آیت نے دینی اور دنیوی تمام امور میں آنحضرتؐ کو اسوہ قرار دیا ہے اور اسے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے لئے اساس قرار دیا ہے۔

قرآنِ عزیز میں آنحضرتؐ کی سیرت بڑے حکیمانہ انداز سے بیان ہوئی۔ اگر ان تمام مقامات کو ایک طالب علم کی طرح بغور پڑھا جائے تو سنت کی حجیت اور آنحضرتؐ کے اتباع کی فرضیت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا بلکہ یہ ایک مستقل باب ہے جس کے لئے کسی دوسری صحبت کا انتظار کرنا چاہیئے کہ قرآن میں سیرت کا تذکرہ کس طرح آیا ہے [1]

قرآنِ عزیز نے اس موضوع کو مختلف عنوانات اور مختلف طرق سے بیان فرمایا ہے۔ قرآن کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی نگاہ میں یہ مسئلہ ایمان کے لئے ایک اساس اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ پیغمبر کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو قرآن اور اسلام دونوں مسکین اور یتیم ہو کر رہ جائیں گے۔

---

[1] شیخ موسیٰ جار اللہ رح نے کتاب السنہ میں اسکے متعلق مختصر اور لطیف بحث فرمائی ہے۔

میں نے فیصل آباد کے اجلاس میں اس موضوع پر اختصار سے عرض کیا تھا اہمیت کے لحاظ سے یہاں کسی قدر تفصیل سے عرض کرنا مناسب سمجھا گیا لیکن یہ تفصیل بھی انتہائی اختصار پر مشتمل ہے مزید کسی قدر تفصیل رسالہ "مقام حدیث" میں ملے گی جو پہلے شائع ہو چکا ہے۔

حدیث کا کھلا انکار، چودھویں صدی میں

مولوی عبداللہ چکڑالوی پہلے شخص ہیں جنھوں نے علوم سنت کی کھلی مخالفت کی۔ انھیں رسولوں کی اطاعت کا ذکر کھٹکتا رہا۔ انھوں نے رسول کے معنی قرآن کر کے اس اطاعت سے مخلصی چاہی لیکن قرآن اس اطاعت سے بھرا پڑا ہے سورۂ شعراء میں تقریباً دس جگہ یہ فقرہ دہرایا گیا ہے۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنَ "اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔"

گویا یہ اطاعت اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے ہم پایہ چیز ہے۔

آل عمران میں فرمایا:۔ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ "اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔"

قرآنِ عزیز میں مختلف مقامات پر قریب قریب چالیس جگہ رسول کی اطاعت کا ذکر مختلف انداز سے آیا ہے ایک موٹی سمجھ کا آدمی سوچتا ہے کہ ہر جگہ اس کی تعبیر رسول ہی سے فرمائی گئی ہے کہیں بھی اصلی لفظ سے تعبیر نہیں کیا گیا حالانکہ کسی جگہ اپنے موقع پر قرآن، فرقان اور کتاب کا ذکر آیا ہے۔ پھر اس تعبیر سے ہر ہر جگہ گریز کی کوئی معقول وجہ ہونی چاہیئے۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کے لفظ سے اس داعی کو تعبیر کیا گیا ہے جو اس دعوت کو لے کر آیا اور ہر زمانے میں اپنی دعوت اور اپنی اس حیثیت کو مستقل طور پر پیش کیا ہے اس لئے مولوی عبداللہ اور ان کے اتباع اور ہم مشرب حضرات کی ان توجیہات میں کوئی معقولیت معلوم نہیں ہوتی اور الرسول کی شخصیت کو نظر انداز کرنے کے بعد سارا

کارخانہ اور دیانت کا یہ معمل پورے کا پورا غارت ہوجاتا ہے۔

قرآن اور اس کا تواتر ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ قرآن کے ہم تک پہنچنے میں تواتر پایا جاتا ہے۔ اس میں سند کے مباحث کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مگر یہ تواتر آنحضرتؐ سے شروع ہوگا۔ آنحضرتؐ اپنے مقام پر اکیلے ہیں۔ سنت اور اس سے عقیدت رکھنے والے لوگ رسولؐ، اس کی بشریت اور اس کے لوازم کی بحث آپ سے نہیں چھیڑیں گے لیکن اگر کوئی غیر مسلم آنحضرتؐ کی ذات سے متعلق بحث چھیڑ دے تو تواتر سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا کیونکہ اس تواتر میں رسول صلے اللہ علیہ وسلم تو اکیلے ہی ہوں گے۔

مسیحی اور یہودی حضرت مسیح کی صلیب کو تواتر اور بہت بڑے اتفاق سے مانتے ہیں لیکن اس تواتر کی انتہا اس جلاد پر ہوتی ہے جس نے آندھی اور گرد و غبار کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مسیح کو صلیب پر چڑھایا۔ نہ اس وقت وہاں یہودی موجود تھے نہ مسیح علیہ السلام کے حواری نہ حکومت کا کوئی نمائندہ۔ قرآن عزیز نے اس تواتر کے علی الرغم مسیح کے متعلق صلیب کا انکار فرمایا اور اسی طرح حضرت مسیح کے قتل کا انکار فرمایا ہے۔ قادیانی حضرات اور اس ذہن کے لوگوں کو چھوڑ کر پوری دنیائے اسلام نے اس مشکوک تواتر کی پرواہ نہیں فرمائی اس لئے کہ اس کی ابتدا میں تواتر نہیں۔

منکرین حدیث کے طریق فکر کے مطابق اگر پیغمبر کی عصمت پیغمبر کا اجتہاد اور پیغمبر کی تعبیر محلِ نظر ہو تو نبوت اور اس کے عوامل سے اعتماد اٹھ جائے گا اس کے بعد تواتر سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا۔ تواتر کے لئے تو ضروری ہے کہ اس سلسلے کی کوئی کڑی بھی تواتر کے موجبات سے خالی نہ ہو اسی صورت میں وہ موجب یقین ہو سکتا ہے۔

اگر قرآن کی حجیت اور اس کے تواتر کو قائم رکھنے کے لئے آپ حضرات ازراہ عنایت آنحضرتؐ اور تمام انبیاء کو اپنی مناظرانہ نکتہ نوازیوں سے معاف فرما دیں اور آپ کے ظنون و اوہام کے تیز اور تند حملوں سے اگر مقامِ نبوت محفوظ ہو جائے تو سنت کو بھی

ان شاء اللہ کوئی خطرہ نہیں۔ آپ کو معلوم ہے سنت اسی پیغمبر کے اعمال شرعیہ کا نام ہے جس نے آپ کے لئے قرآن کو محفوظ فرمایا۔

اور اگر ان کی ان موشگافیوں اور مظنون خطرات سے مقام نبوت نہ بچ سکا تو نہ قرآن کے لئے کوئی پناہ گاہ باقی رہے گی نہ اسلام اور ایمان کے لئے کوئی ماخذ اور نہ آپ کی آزادیوں کے لئے کوئی رکاوٹ۔

منکرین سنت کے شبہات منکرین سنت کی کوئی جامع تحریر جس میں سنت اور آنحضرتؐ کے مقام کے خلاف سنجیدگی اور جامعیت سے لکھا گیا ہو میری نظر سے نہیں گزری۔ بعض احادیث پر کچھ شبہات وارد کئے گئے ہیں جن کا زیادہ سے زیادہ یہ اثر ہونا چاہیئے کہ ان چند احادیث کا انکار کردیا جائے جن کے معنی کے متعلق تسکین نہ ہوسکی۔ چند احادیث یا چند شبہات کی بناء پر پورے ذخیرے کا انکار کردینا قطعاً دانش مندی نہیں۔ اگر کسی شوریدہ سر کو قرآنِ عزیز کی بعض آیات سمجھ میں نہ آئیں کوئی سمجھ دار آدمی پسند نہیں کرے گا کہ پورے قرآن کا انکار کردیا جائے۔

ان حضرات کی شاندار تحریرات سے چند شبہات اخذ ہوسکے ہیں انھیں کے متعلق یہاں کچھ گذارش کرنا پیشِ نظر ہے۔

قابل اعتراض روایات اور بعض اہم شبہات کے متعلق میں اپنی گذارشات مولانا مودودی صاحب کے "نظریۂ حدیث کا تنقیدی جائزہ"[1] میں عرض کرچکا ہوں حضرت ابراہیمؑ کی تعریضات اور حضرت موسیٰؑ کا تھپڑ مارنا، ان پر بقدر ضرورت عرض کرچکا ہوں۔ یہاں صرف اصولاً کچھ عرض کرنا مقصود ہے۔

---

[1] یہ کتاب اسی عنوان کے ساتھ زیر نظر مجموعہ میں شامل ہے۔

حدیث کے متعلق ظنّی ہونے کا شبہ

فنِ حدیث کے متعلق اوہام وسوادس نے جب سے تحریک کی صورت اختیار کی ہے اور بعض اربابِ فکر نے ان وساوس کو کاروبار کے انداز سے پیش کرنا شروع کیا اس وقت عوام کی نگاہ میں یہ اوہام دلائل کی صورت اختیار کر گئے ہیں اور انکار حدیث ایک مشغلہ سا بن گیا ہے۔ غیر علمی زبانوں پر متعارف اصطلاحات غیر اصطلاحی معانی استعمال ہو کر بعض سادہ لوح حضرات کے لئے لغزش کا موجب ہو رہی ہے۔ ان ہی اصطلاحات سے ایک اصطلاح "ظن" کی بھی ہے۔ حدیث کے متعلق یہ شبہ بھی پیدا کیا گیا ہے کہ یہ ظنّی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس سے متعلقہ گرد و غبار کو صاف کیا جائے جو تحریک انکارِ حدیث نے فضا میں اٹھا رکھا ہے۔

ظن کی علمی تحقیق

ظن کے شرعی، عربی اور لغوی مفہوم پر غور کرنے سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس مغالطہ کا پس منظر کیا ہے؟

ظن کا لفظ عربی اور اردو دونوں زبانوں میں مستعمل ہے لیکن اردو میں اس کا استعمال شک، وہم کے مفہوم میں ہوتا ہے عموماً مشکوک، موہوم، مظنون وغیرہ الفاظ بصورت مترادف استعمال کئے جاتے ہیں اور یہی استعمال ہمارے منکرینِ سنّت حضرات کے لئے لغزش کا موجب ہوا ہے۔

ورنہ عربی زبان میں یہ لفظ بلا قرینہ اس معنیٰ میں استعمال نہیں ہوا۔ راغب فرماتے ہیں:-

الظن اسم لما يحصل عن امارة ومتى قويت ادت الى العلم ومتى ضعفت جدًا لم يتجاوز حد التوهم (مفردات (جدید) ص۳۱۹)

"جو علم آثار و قرائن سے حاصل ہو اُسے ظن کہتے ہیں، اگر آثار و قرائن مضبوط ہوں تو یہ لفظ علم و یقین کے مترادف ہوگا اور جب یہ قرائن بہت ہی کمزور ہوں تو بھی وہم سے کم تر نہیں ہوگا۔"

محمد بن مکرم بن منظور فرماتے ہیں :-

الظن شك و يقين الا انه ليس بيقين عيان انما هو تد براه

(لسان العرب ج ۲ صـ ۲۷۲)

"ظن، یقین اور شک دونوں معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے لیکن یہ یقین استدلالی ہوتا ہے عینی نہیں ہوتا"

تہذیب الصحاح ج ۳ میں ہے :-

الظن يقين و شك و انشد ابو عبيدة

ظنى بهم كعلمى وهم يتنوفة يتنازعون جوائز الامثال

اقرب الموارد، قاموس منجد وغیرہ کتب لغت میں بھی اس قسم کی تصریحات موجود ہیں۔ ان تصریحات کی روشنی میں ظن کا عرفی مفہوم تو واضح ہو جاتا ہے یعنی یہ لفظ علم و یقین میں بھی استعمال ہوتا ہے اور شک و تخمین کے مفہوم میں بھی بولا جاتا ہے۔ انحصار قرائن پر ہے۔ جیسے قرائن ہوں گے ویسے ہی معانی میں استعمال ہوگا۔

علمائے عربیت کی رائے اس کے متعلق اور بھی صاف ہے۔ علامہ ابو البقاء یعیش بن علی بن یعیش (۶۴۳ھ) مفصل زمخشری کی شرح میں فرماتے ہیں :-

الظن ان يتعارض دليلان و يترجح احدهما على الاخر و قد يقوى المرجح فيستعمل بمعنى العلم و اليقين نحو قوله تعالى

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ (ابن یعیش صـ ۷ ج ۷)

"دو متعارض دلیلوں کا نام ظن ہے اور جب راجح قوی ہو تو اسے علم و یقین سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسے یظنون انھم ملاقوا ربھم سے ظاہر ہوتا ہے"

پھر اسی کتاب کی ساتویں جلد میں مسئلہ اور بھی صاف فرما دیا ہے قول اور رویت بھی کبھی ظن ہی کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔

کے حصہ میں آیا ہے۔ ان حضرات کا خیال ہے کہ ائمہ حدیث میں چونکہ کافی تعداد اہلِ فارس کی ہے۔ فارسی حکومت چونکہ پہلی صدی ہی میں ختم ہو چکی تھی یزدجرد کی موت کے بعد فارسی اقتدار ہمیشہ کے لئے دم توڑ گیا۔ منکرینِ حدیث کا خیال ہے کہ ائمہ حدیث نے فارسی حکومت کے بقیۃ السیف کے ساتھ مل کر اسلام کی تخریب کے لئے سازش کی اور احادیث کے یہ طویل و عریض دفاتر، رجال کا یہ علمی اور تاریخی ذخیرہ، اصول حدیث کے عقلی اور لغوی قواعد یہ سب اس شکست کا نتیجہ ہیں جو فارسی حکومت کے افراد اور علماء کی سازش سے وجود میں آئی اور اسی سے اسلام میں تخریب کی راہ پیدا ہوئی چند سال سے اس تہمت کو بے حد ہوا دی جا رہی ہے۔ فتح فارس کی وجہ سے آج کا بے خبر ذہن اسے قبول بھی کر رہا ہے۔

میں اس پر ذرا تفصیل سے تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس پوری داستان کو محض افسانہ اور افترا سمجھتا ہوں۔ میری دانست میں یہ محض وہم ہے اس کے لئے کوئی دلیل نہیں بلکہ جو حضرات اس سازش کا پراپیگنڈہ کر رہے ہیں وہ خود کسی کی سازش کا شکار ہیں۔

سازش کے اسباب

آج کے جمہوری دور میں حکومت پورے ملک کی ہوتی ہے۔ انتخاب کے مروجہ طریقوں میں یہ اساسی طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ ارباب حکومت پورے ملک کی نمائندگی کرتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ عوام کے سامنے جواب دہ ہیں اور عوام کے ووٹ نے انھیں اقتدار بخشا ہے اس لئے یہ عوام کی حکومت ہے۔ ایسی حکومت اگر برباد ہو جائے تو یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ اقتدار پورے ملک سے نکل کر اجنبی ہاتھوں میں چلا گیا۔ اس لئے ان حالات میں سازش کا امکان ہو سکتا ہے۔

آج سے تقریباً ایک صدی پہلے حکومت نہ انتخابی تھی نہ جمہوری نمائندگی کی سند ان کو حاصل تھی۔ نہ وہ حکومتیں عوام کے سامنے جواب دہ ہوتی تھیں بلکہ اس وقت کی

حکومتیں شخصی ہوتی تھیں یا زیادہ سے زیادہ کوئی قوم حاکم ہو جاتی باقی لوگ محکوم ہوتے تھے۔ اقتدار میں عوام کی جواب دہی قطعاً ملحوظ نہیں رکھی جاتی تھی نہ ہی حکومت کسی آئین کی پابند ہوتی تھی۔ بادشاہ کی رائے اور بادشاہ کا قلم پورا آئین ہوتا تھا یا وہ لوگ جو بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملا کر حکومت کے منظور نظر ہو جائیں۔

ایسی حکومتوں کے ساتھ ہمدردی ذاتی ضرورتوں کی وجہ سے ہوتی تھی یا بادشاہ کے ذاتی اخلاق اور کیریکٹر کی وجہ سے اگر کوئی انقلاب ہو جائے تو انقلاب سے ملک متاثر تو ہوتا تھا لیکن اس کی وجہ بادشاہ یا اس کے خاندان کے ساتھ ہمدردی نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ تاثر آنے جانے والی حکومتوں کے ذاتی مقاصد کی وجہ سے ہوتا۔

فارس کی حکومت شخصی حکومت تھی۔ یزدجرد کی موت پر اس کا خاتمہ ہو گیا یزدجرد کا خاندان یقیناً اس انقلاب میں پامال ہوا ہوگا لیکن تاریخ اس وقت کسی ایسی سازش کا پتہ نہیں دیتی جو اس خاندان کے ساتھ ہمدردی کے طور پر کی گئی ہو۔

نوشیرواں کے بعد ویسے بھی فارس کی حکومت رو با نحطاط تھی۔ ان کے کردار میں عدل و انصاف کی بجائے استبداد روز بروز بڑھ رہا تھا۔ عوام کو حکومت کے ساتھ کوئی دلچسپی اور محبت نہیں تھی۔ پھر سازش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مذہباً فارسی حکومت آتش پرست تھی۔ اسلام نے توحید کے عقیدہ کی سادگی سے یہودیت اور عیسائیت تک کو متاثر کیا۔ بت پرستی اس کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ آتش پرستی کی وہاں کیا مجال تھی۔ اسلام کی تعلیمات اس مسئلہ میں نہایت مدلل اور واضح تھیں ان میں کوئی چیز ڈھکی چھپی نہ تھی۔ اسلام کا موقف عقیدۂ توحید کے معاملہ میں کھلی کتاب تھی۔ وہ دوسروں کے شبہات اور اعتراضات بڑی کشادہ دلی سے سنتا تھا مخالفین کے شبہات کی تردید اور اصلاح میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا تھا نہ ہی اپنے نظریہ کو کسی پر جبراً ٹھونستا تھا۔ پھر اس کے خلاف کیوں سازش کی جائے؟ کون کرے؟ اور کس طرح کرے؟ فارس کی حکومت کا چراغ خلیفہ ثانی کی حکومت میں گل ہوا۔ یزدجرد کو خود

اس کی رعایا نے قتل کیا اور اس کے خاتمہ میں مسلم عساکر کی مدد کی۔ پھر سازش کی ضرورت کیسے ہوئی ؟

حضرت عمرؓ کی شہادت میں بعض مشتبہ بیانات ملتے ہیں لیکن قاتل کو جس طرح سزا دی گئی اس میں کوئی سازش تصور نہیں کی گئی بلکہ ابو لولوء کا ذاتی انتقام تصور کیا گیا۔

اگر کسی سازش کا خطرہ ہوتا تو عجمی حضرات پر مدینہ منورہ کے دروازے بند کر دئے جاتے۔ بعض غیر معتدل اشخاص سے خطرہ کے باوجود مدینہ منورہ کے داخلہ پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔ شخصی رنجشوں سے بعض وقت قتل تک نوبت پہنچ جاتی ہے یہی چیز حضرت عمرؓ کی شہادت میں کارفرما تھی۔ اور اگر اسے سازش تسلیم بھی کر لیا جائے تو وہ عام اور قومی نہ تھی بلکہ ایک فارسی خاندان تک محدود تھی۔

فتح کے بعد فارس کی فتح کے بعد ہزاروں فارسی اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے جزیہ دیتے رہے۔ انھیں کسی نے کبھی کچھ نہیں کہا۔ ان کے معبد (آتش کدہ) مدتوں قائم رہے، جو لوگ ان سے اسلام کی طرف راغب ہوئے۔ انھیں اسلام نے پوری ہمدردی کے ساتھ اپنی آغوش میں عزت کی جگہ دی۔

جہاں مذہب یوں آزاد ہو اور سیاست اس طرح بے اثر۔ ملک کے عوام مسلمانوں کی فتوحات پر خوشیاں مناتے ہوں جب وہ جنگی مصالح کی بنا پر کسی مقام سے پیچھے ہٹنا پسند کریں تو اس علاقہ میں صفِ ماتم بچھ جائے۔

تعجب ہوتا ہے کہ ادارہ طلوع اسلام اور جناب اسلم جیراج پوری نے سازش کے جراثیم کو کونسی عینک سے دیکھ لیا —— !

تاریخ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی عدل گستری اور انصاف پسندی کی وجہ سے فارس کے لوگ بالکل مطمئن ہو گئے۔ اس لئے انھوں نے سیاسیات کا میدان چھوڑ کر فاتحین کی علم دوستی کے اثرات سے فارس کے ذہین لوگ فوراً علم کی طرف متوجہ

ہوگئے۔ اس راہ میں انھوں نے آخرت کی سربلندیوں کے علاوہ علمی دنیا میں بہت بڑا نام پیدا کیا اور حکومت کے خلاف سازش کا ان کی زبان پر کبھی نام تک نہیں آیا۔

یہ سازش کا پورا کیس مولانا جیراج پوری کے کاشانہ اور ادارہ طلوع اسلام کے دفتر میں تیار ہوا۔ واقعات کی روشنی میں اسے ثابت کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے البتہ عباسی حکومت میں جب قلمدانِ وزارت برامکہ کے ہاتھ میں چلا گیا تو یونانی علوم کے تراجم سے اسلام کے سادہ عقائد کے خلاف ایک محاذ قائم ہوا لیکن اس وقت حدیث کے دفاتر منضبط ہو چکے تھے۔ خلیفہ ہارون ایسا آدمی حدیث کے متعلق مطمئن تھا۔ رہے یونانی علوم تو ان کا رد ائمہ سنت نے پوری جرأت سے کیا یہاں تک کہ وہ بے اثر ہو گئے اور ائمہ سنت کے حملوں کی تاب نہ لاسکے۔

سازش کا مضحکہ خیز پہلو

سازش کی یہ عجیب قسم ہے کہ سازشیوں نے فاتحین کا مذہب قبول کیا۔ پھر ان کے علوم کی اس قدر [illegible] کی کہ فاتحین اپنے علوم کی حفاظت سے بے فکر اور کلی طور پر مطمئن ہو گئے پھر فاتحین نے ان [illegible] علوم اور علماء کی سرپرستی کی۔ ابن خلدون فرماتے ہیں۔

وعهدوا ذلك الى من قام به من العجم والمولدين ومازالوا يرون لهم حق القيام به فانه دينهم وعلومهم ولا يحتقرون حملتها كل الاحتقار (مقدمہ ابن خلدون ص۵)

وہ عرب بادشاہ [illegible] علوم کو ان لوگوں کے سپرد کر دیا جو ان کی پوری طرح حفاظت کر سکیں اور یہ لوگ سب عجمی اور موالی تھے اور یہ بادشاہ ان علماء کے حقوق کا پورا احترام کرتے تھے اور ان کی خدمات کی قدر کرتے تھے اور قطعی طور پر ان کو حقیر نہیں سمجھتے تھے کیونکہ وہ ان کے علوم اور دین کے محافظ تھے۔"

معلوم ہے کہ اموی خلفاء کے وقت شاہی درباروں میں عجمیوں کو وہ اقتدار حاصل نہ تھا جو عباسی درباروں میں برامکہ کو حاصل ہوا لیکن ان کا دامن دین کی خدمات

سے بالکل خالی تھا۔ قرآن و سنت اور دینی علوم تو بڑی بات ہے برامکہ سے تو عربی زبان کی بھی کوئی خدمت نہ ہو سکی۔

ہارون الرشید نے امام مالکؒ اور ان کے درس کی سرپرستی کرنے کی کوشش کی۔ لیکن امام نے اسے بے اعتنائی سے مسترد کر دیا۔ روپیہ دینے کی کوشش کی تو پورے استغنار سے واپس فرما دیا۔

سازش کا آخر یہی مقصد ہو سکتا تھا کہ شاہی دربار تک رسائی ہو، مال و دولت اور حکومت میں حصہ ملے۔ اب دربار خود درِ دولت پر حاضر ہوتا ہے۔ اپنی ساری سر بلندیاں چھوڑ کر پورے انکسار، انتہائی احترام سے خزانوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ تھیلیاں باادب پیش ہوتی ہیں اور "سازشی" ہیں کہ نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔

بادشاہ عرض کرتے ہیں کہ بغداد تشریف لے چلئے آنکھیں فرشِ راہ ہوں گی فارسی سازش کے سرغنہ یا فنِ حدیث کے سالارِ قافلہ فرماتے ہیں۔ والمدینۃ خیر لھم لو کانوا یعلمون۔

مطلب یہ کہ اس بڑے دربار سے علیحدگی میرے لئے ناممکن ہے۔

پھر سازشیوں کا یہ پورا گروہ مختلف عجمی ممالک سے ہزاروں میل سفر طے کر کے مدینہ منورہ پہنچ کر امام کی خدمت میں تحصیلِ علم کے لئے پیش ہوتا ہے اور کوئی نہیں سوچتا کہ ان کا شیخ عرب ہے اور یہ عجمی النسل لوگوں کی پوری سازش کا راز فاش نہ کر دے۔

عرب استاد کے عجمی شاگرد مدتوں استفادہ کرتے ہیں اور انھیں علوم کا درس دیا جاتا ہے۔ ساتھی ساتھی پر جرح کرتا ہے۔ ایک دوسرے کی کمزوریوں کے کھلے بندوں تذکرے ہوتے ہیں۔ عرب محدث، عجمی علماء پر تنقید کرتے ہیں، عجمی، اہلِ عرب کے نقائص کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن اس سازش کا سراغ جس کے اختراع کا سہرا "مؤرخ اسلام" کے دفتر کے سر ہے نہ کسی عرب کو لگا۔ نہ کسی عجمی کو، نہ استاد نے اسے محسوس کیا نہ شاگرد نے نہ ساتھی نے ـــــ!

پھر تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ فارس کی فتح پہلی صدی کے اوائل میں ہوئی اور سازش کا منصوبہ تیسری صدی میں بنایا گیا۔ تقریباً پورے دو سو سال بے وقوف اہل فارس آرام کی نیند سوتے رہے یعنی جب شکست کا درد اور کوفت تازہ تھی۔ اس وقت تو فارسیوں کو کوئی احساس نہ ہوا لیکن تین سو سال کے بعد درد کی بے قراریاں انگڑائیاں لینے لگیں اور فارسی سازشیوں نے بخاری مسلم اور کتب صحاح کی صورت اختیار کرلی۔ فیا للعقول واسا یابھا۔

پھر اتنی بڑی سازش جس نے پوری اسلامی اور تعلیمی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اسے کوئی نہ جان سکا۔ دنیا مسلم اور غیر مسلم مؤرخوں کی آنکھیں بے کار ہوگئیں قلم ٹوٹ گئے اور زبانیں گنگ، ان کی ضخیم کتابیں اس عظیم الشان سازش کے تذکرہ سے یکسر خالی ہیں۔ یہ راز سب سے پہلے یورپ کے ملحد مکتشفین پر کھلا اور اس کے بعد دفتر طلوع اسلام کے دریوزہ گروں نے کچھ ہڈیاں مستعار لے لیں۔ فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ ۝

عجمی سازش اور دینی علوم

فن حدیث کے طالب علم جانتے ہیں کہ فن حدیث کو آغاز ہی میں تین مراحل سے گزرنا پڑا۔

جمع وتدوین اور ترتیب حدیث۔ جمع اور حفظ کا سلسلہ تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مقدسہ میں آپؐ کے سامنے ہی شروع ہوگیا تھا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے علماء حدیث اور اس کی طلب میں سرگرداں ہونے والوں کے حق میں دعائیں فرمائیں

رحم اللہ امراء سمع کلامی فوعاھا ثم اداھا کما سمعھا۔

(مشکوٰۃ کتاب الاعتصام)

اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جس نے میری بات سن کر اسے یاد رکھا، پھر جس طرح سنا اسی طرح پہنچا دیا۔

صحابہ باہم حدیث کا مذاکرہ اور درس کرتے تھے۔ ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں:۔

تذاکروا الحدیث فان الحدیث یھیج الحدیث (دارمی ص۷۴)

"حدیث کا باہم مذاکرہ کرو۔ باتوں سے باتیں یاد آجاتی ہیں"

ابن عباس فرماتے ہیں:۔

"حدیث کا باہم تذکرہ کرو تاکہ یہ بھول نہ جائے یہ قرآن کی طرح مجموعہ نہیں اگر اس کا مذاکرہ نہ کیا گیا تو یہ بھول جائے گی اور یہ مذاکرہ ہر روز ہونا چاہیئے"، (دارمی ص۷۴)

ابن ابی لیلےٰ رح فرماتے ہیں:۔

تذاکروا فان احیاء الحدیث مذاکرتہ (دارمی ص۷۴)

"حدیث کا دور کرو، حدیث کی زندگی دور و مذاکرہ سے ہے"

علقمہ رض فرماتے ہیں:۔

تذاکروا الحدیث فان ذکرہ حیاتہ"

حدیث کے درس اور ذکر ہی میں اس کی زندگی ہے"

صحابہ رض نماز عشا کے بعد درس اور مذاکرہ کے لئے بیٹھتے، یہاں تک کہ صبح کی اذان ہوجاتی۔ دارمی اور دوسری کتب حدیث میں اس قسم کے آثار کثرت سے موجود ہیں۔ صحابہ رض اور تابعین رح کے پاس احادیث کے لکھے ہوئے تذکرے اور مجموعے بھی موجود تھے۔ عبداللہ بن عمرو رض، عبداللہ بن عمر رض اور ابوہریرہ رض کے صحیفات کا ذکر کتب حدیث میں اکثر ملتا ہے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں درس اور مذاکرہ ہوتا۔ صحابہ رض اپنے اسباق قلمبند فرماتے تھے۔ ابوقبیل فرماتے ہیں:۔

سمعت عبد اللہ بن عمرو قال بینما نحن حول رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نکتب فسئل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ای المدینتین تفتح اولا قسطنطنیۃ او رومیۃ فقال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لا بل مدینۃ ھرقل (دارمی ص۶۸)

"ہم آنحضرتؐ کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر لکھ رہے تھے۔ ایک آدمی نے سوال کیا کہ روما پہلے فتح ہوگا یا قسطنطنیہ؟ آنحضرتؐ نے فرمایا ہرقل کا شہر پہلے فتح ہوگا یعنی قسطنطنیہ۔"

اس اثر سے آنحضرتؐ کا درس حدیث اور آپ کی موجودگی میں اسکی کتابت کا تذکرہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ رضؓ اپنے اسباقِ حدیث یادداشت اور تذکرہ کے طور پر لکھا کرتے تھے۔

جھوٹی حدیث اور وعید

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اس وعید کے بعد کہ جو آدمی دانستہ جھوٹی حدیث بیان کرے اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ حدیث کی کتابت کے سوا چارہ ہی نہیں؟ معلوم ہے کہ یہ حدیث قرآن کی طرح متواتر ہے۔ اس حدیث کی موجودگی میں کتابت حدیث اور اس کے جواز اور عدم جواز کی بحث بالکل بے معنی ہے۔ اس کا قطعی مفہوم یہ ہے کہ حدیث ایک مستند دستاویز ہے۔ شرعًا وہ حجت ہے، اس میں کسی جھوٹ اور آمیزش کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

اس حقیقت کے ہوتے ہوئے ضروری ہے کہ اس ذخیرہ کی حفاظت کے لئے ہر سامان کیا جائے، حفظ وضبط ہو یا کتابت اور تحریر بلکہ دونوں، کیونکہ انفرادًا دونوں میں غلطی اور سہو کے امکانات ہیں۔

اور اس کے لئے موزوں تر وقت آنحضرتؐ کی زندگی اور صحابہ کے جم غفیر کی موجودگی ہے ورنہ اس سامانِ حفاظت کی ضرورت ہی کیا تھی۔

سابقہ آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی طبعی رفتار کے ساتھ یہ سلسلہ مختلف علاقوں میں جہاں اہل علم صحابہ رضؓ موجود تھے۔ [illegible] صحابہؓ نے ضخیم کتابیں [illegible] جمع فرمائیں جن کی طرف وہ بوقت ضرورت مراجعت فرماتے اور احادیث [illegible] تاکہ آنحضرتؐ کی طرف کوئی غلط چیز منسوب نہ ہو جائے [illegible] کی تفصیل [illegible] اپنے اپنے مقام پر موجود ہے۔

دوسری صدی پہلی صدی کے اواخر میں اموی سلطنت کا چراغ گل ہوگیا اور اموی حکومت کا پھریرا ہمیشہ کے لئے سرنگوں ہوگیا۔ چند سال ائمہ حدیث کی نقل و حرکت پر سیاسی خلفشار کی وجہ سے پابندی رہی اور علم کے یہ خزانے اپنے اپنے علاقوں تک محدود رہے، کوفہ، بصرہ، بغداد، خراسان، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ نجد، یمن اور مصر وغیرہ مختلف علاقوں کے علماء، اپنے علاقوں میں درس حدیث دیتے رہے۔ ان علاقوں میں جو جو صحابہؓ اقامت پذیر تھے ان کے علوم اور دروس کی اشاعت اس علاقہ ہی میں ہوتی رہی اور حفظ و کتابتِ حدیث کا سلسلہ ان علاقوں میں اپنی اپنی بساط کے مطابق بدستور جاری رہا۔ اموی، ہاشمی اور عباسی قسمت آزما پوری قوت سے نبرد آزما تھے اور اکھاڑ پچھاڑ کی تند و تیز ہوائیں پورے زور سے چل رہی تھیں اور یہ سازشی پورے سکون سے اپنے مدارس میں حدیث کے حفظ و جمع میں مشغول تھے۔ اگر کسی سرپھرے بادشاہ کو کسی عالم پر بدگمانی ہوئی تو اسے اس نے جیل میں ڈال دیا جب ظلم نے اپنا نصاب پورا کرلیا۔ قید کی مدت ختم ہوگئی تو جیل سے نکل کر اپنے مدرسے میں آگئے اور علم و دین کی خدمت میں مشغول ہوگئے۔ کوئی عملی قدم ان متحارب فریقوں کے موافق یا خلاف نہیں اٹھایا۔ بدگمانیاں محض اظہار خیال یا رجحانِ طبع کی وجہ سے ہوئیں حالانکہ سازشیں ایسے ہی اوقات کی منتظر ہوتی ہیں۔ دشمن پر حملہ کرنے کا بہترین وقت وہی ہوتا ہے جب دشمن دوسری طرف مشغول ہو۔ حضرت امام ابوحنیفہ رح کے متعلق سیاسی دلچسپی کے بعض واقعات تاریخ کی زبان پر آتے ہیں لیکن ان میں فارس کا یہ عظیم الشان سازشی ہاشمی اور عربی حکومت کا حامی تھا۔ آپ اس دور کی تاریخ پڑھ جائیے۔ آپ کو اہل علم پر حکومت کی جیرہ دستیوں کے واقعات تو خال خال ملیں گے لیکن ان علماء نے حکومت کے خلاف کوئی محاذ قائم کیا ہو۔ اس سے تاریخ ساکت ہے۔ سازش کی پوری مسل طلوع اسلام کے دفتر اور علامہ جیراج پوری کے دولت کدہ میں بنی اور وہیں دھری کی دھری رہ گئی اور شاید اس ساری تہمت تراشی

کا پورا بوجھ یہی حضرات اپنے کندھوں پر اٹھا کر خدا کے سامنے حاضر ہوں گے۔ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ۔

دَورِ تدوین تیسری صدی میں جب عباسی حکومت کے قدم جم گئے امویوں کے ساتھ ہاشمی بھی خلافت کی بساط سے غائب ہو گئے۔ چند روز خلفشار کے بعد جب ملک میں امن قائم ہوا تو ائمہ حدیث پا برکاب ہو گئے۔ انھوں نے زمین کی طنابیں کھینچ لیں۔ علم میں وطنی اور علاقائی تقسیم کو عملاً ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سفر کے موجود اور ممکن وسائل کے ساتھ خراسان سے اقصائے مغرب تک ان علم کے بادشاہوں نے پرسکون حملے شروع کر دیئے اور علم کی منصفانہ تقسیم کے لئے میدان ہموار ہو گئے محدثین کی علمی سخاوت نے مشرق و مغرب کے قلابے ملا دیئے۔

اس وقت جمع اور حفظ کا کام ختم ہو چکا تھا اور غیر مرتب تذکرے اہل علم کے مکاتب میں موجود تھے۔ طلبہ مسودات اور مبیضات کی تصحیح اور اصلاح کے بعد ان کی تدوین کی طرف متوجہ ہوئے۔ بعض کتابیں دوسری صدی میں مدون ہوئیں لیکن مہم کے طور پر تدوین کا کام تیسری میں شروع ہوا۔ ائمہ حدیث نے فن کی تدوین مختلف طریقوں سے فرمائی۔ بعض نے مرفوع احادیث اور آثار صحابہ دونوں کو جمع کیا۔ بعض سے صرف مرفوع احادیث کی تدوین ہوئی۔ بعض نے مرفوع احادیث کے ساتھ فقہا کے مذاہب کا ذکر فرمایا۔ کسی نے اسانید اور رجال کا مفصل ذکر کیا۔ کسی نے یہ تذکرے بقدر ضرورت بیان فرمائے۔ تفصیل کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بعض نے ہر صحابی کی مسند کو یکجا جمع کیا۔ ہر ایک کی مسانید کو قرینے سے یکجا کر دیا۔ بعض نے معجم کی صورت میں یہ ذخیرہ جمع فرمایا۔ کسی نے متن حدیث کا پہلا حرف بطور عنوان ذکر کیا۔ کسی نے رواۃ کے نام سے معجم مرتب فرمائی۔ کسی نے حدیث کے تمام ابواب اور مسائل کا ذکر کیا جس میں سیرت آداب مغازی اشراط ساعت وغیرہ سب آ گئے جیسے بخاری اور ترمذی وغیرہ اور بعض نے صرف سنن پر کفایت فرمائی۔ اس میں عبادات، معاملات وغیرہ کی تفصیل آ گئی

کسی نے صرف صحیح احادیث جمع کیں۔ بعض نے صحیح وضعیف کا ملاجلا ذخیرہ پیش فرمایا بعض حضرات نے استدراک فرمایا۔ بعض نے صرف ایک مسلک کے ادلہ جمع کر دیئے غرض اس فن میں انتہائی خوشنما تنوع کے بکھرے ہوئے پھول جمع ہو گئے۔

ائمہ حدیث میں اکثر فقیہ تھے، مسائل کے استنباط پر انھیں پوری قدرت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں اجتہاد کی تمام شرائط جمع فرما دی تھیں۔ انھوں نے بہترین تبویب کے ساتھ اپنی تصانیف کو علم کی منڈی میں لاکر رکھ دیا۔

دور ترتیب اس تدوین کے ساتھ ترتیب کا مرحلہ بھی لازمی تھا۔ وہ آج تک علماء کی طبع آزمائی کے لئے ایک بہترین میدان ہے، اخلاق، اموال مغازی، معاشیات، طب، ادعیہ اربعینیات، خمسینیات اجزا، وغیرہ کی صورت میں مجموعے مرتب ہوتے رہے پھر شروح حل لغات قواعد، تسوید رجال تمیز بین المختلطات، سند اجازت وجادہ، غرض مختلف انداز سے امت نے اس فن کی خدمت کی۔ اس کے علوم کو مرتب فرمایا اور اسے پوری زندگی کا مشغلہ قرار دیا۔ یہ عجیب سازش تھی جو مقصد زندگی قرار پا گئی، راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ دنیا کے مشاغل سب طاق نسیاں کی زینت ہو گئے۔ نہ اچھے کھانے کی خواہش نہ بہتر مکان کی تلاش نہ بادشاہوں کے درباروں سے رابطہ۔

عرصہ ہوا امرت سر کے رسالہ بیان القرآن میں ان بیچاروں پر یہ بھی الزام لگایا گیا کہ محدثین نے درباروں کا مقاطعہ کرکے ملک کی خدمت کے بہترین مواقع ضائع کر دیئے۔

دراصل عیب چینی الزام تراشی سب سے سہل مشغلہ ہے۔ خصوصًا ان لوگوں پر جو صدیوں سے اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور اعتراض بھی وہ لوگ کریں جن کی اپنی زندگیاں، خدا شناسی، خدا ترسی سے تقریبًا ناآشنا ہیں۔ اعمال صالح، اتباع سنت اور ورع وتقویٰ سے یکسر خالی۔ یہاں کی سب سے بڑی دینی خدمت اور منتہائے علم

کتابوں کی فروخت اور جھوٹ سچ کہہ کر اداروں کو چلانا اور حضرات امراء کو خوش کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ ائمہ حدیث زندہ ہوتے تو ان معترضین کو عمر خیام کی زبان سے عرض کرتے۔

صاحب فتویٰ زتو پر کار تریم | باایں مستی از تو ہشیار تریم
تو خونِ کساں بخوری ما خونِ رزاں | انصاف بدہ کدام خونخوار تریم

ائمہ حدیث معصوم نہیں، جمع و تدوین و ترتیب میں غلطی ہوسکتی ہے۔ وہ خود آپس میں تنقید و استدراک فرماتے ہوئے بڑے سے بڑے آدمی کی لغزش کو معاف نہیں فرماتے لیکن کسی سازش اور دیانت فروشی کا ادنیٰ احتمال بھی اس بارگاہ میں ممکن نہیں۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِمْ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا (احزاب)

مشت بعد از جنگ

یہ سازش کی تہمت کا حربہ بڑی دیر کے بعد منکرینِ حدیث کے ذہن میں آیا۔ یہ مشت بعد از جنگ ہے۔ اس کا استعمال اپنے ہی قرابت داروں پر ہونا چاہیئے۔ جمع و تدوین کا سلسلہ تقریباً تیسری صدی کے آخر تک ختم ہوگیا۔ اب پورے ہزار سال بعد ان کے ہوش و حواس نے انگڑائی لی کہ محدثین تو سازش کر گئے اور فن حدیث سازشیوں کی نذر ہوگیا۔ اب سوچیئے کہ اتنی دیر کے بعد ایسے فوجداری مقدمات کی تفتیش ممکن ہے یا کوئی دانشمند اس موضوع پر سوچنے کی بھی کوشش کرسکتا ہے؟ اور پھر یہ تفتیش کسی نتیجہ پر بھی پہنچ سکتی ہے؟ مثلاً قرآن عزیز نے آج سے کئی ہزار سال پیشتر کا ایک کیس ذکر فرمایا ہے۔ ملکہ مصر نے محبت کی سرشاریوں میں اپنے غلام کو بلا کر محل کے تمام دروازے بند کر دیئے اور غلام سے کھلے طور پر کہا کہ جنسی محبت کی آخری حدوں تک کامیاب رسائی کے لئے میرا دل بے قرار ہے اور اس سے انکار اور گریز کے متعلق کوئی عذر نہیں سنا جاسکتا۔ پاکباز غلام نے ملکہ کا ہاتھ جھٹک دیا اور بڑی جرأت سے کہا کہ

دروازوں کی بندش کا کوئی سوال نہیں۔ میرے رب کی دوربیں نگاہ اس محل کے گوشہ گوشہ پر محیط اور ذرے ذرے میں ساری ہے اس کے ساتھ ہی اپنے آقا کی ناشکری یا نمک حرامی میرے لئے کیسے ممکن ہے۔ غلام دروازے کی طرف بھاگ نکلا ملکہ اس کے تعاقب میں دوڑی۔ اس دوڑ میں غلام کی قمیض پچھلی طرف سے پھٹ گئی۔ جب مکان کے صحن میں پہنچے تو ملکہ کے خاوند اور غلام کے آقا وہاں بذاتِ خود موجود تھے ملکہ نے غلام پر الزام لگایا کہ چھیڑ کی ابتدا ر غلام نے کی ہے اسے جیل کی ہوا چکھانا چاہیئے عزیز مصر حقیقتِ حال دریافت ہی کر رہے تھے کہ فیصلہ کی ایک صورت سامنے آ گئی۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ مسئلہ چنداں مشکل نہیں۔ اگر ابتدا ر شرارت غلام کی ہے تو اس کا رُخ ملکہ کی طرف ہونا ضروری ہے غلام کے کپڑے اگر سامنے کی طرف سے پھٹے ہیں تو ملکہ کی بات درست ہے سزا غلام کو ملنی چاہیئے۔ اگر غلام کے کپڑے پشت کی طرف سے پھٹے ہیں تو معاملہ ظاہر ہے کہ بھاگتے ہوئے غلام کا تعاقب ملکہ نے کیا ہے اس لئے غلام سچا ہے ملکہ کی اس غلط جرأت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ غلام میں کوئی غلطی نہیں۔

جب معاملہ کی تحقیق کی گئی تو غلام سچا نکلا کیونکہ غلام کی قمیض پشت کی طرف سے پھٹی ہوئی تھی۔ یہ جھگڑا آج سے کئی سو سال قبل پیدا ہوا اور اس وقت کی سوسائٹی کے عدالتی معیار کے مطابق معاملہ طے ہو گیا اور حضرت یوسفؑ باعزت بری ہو گئے۔

اب آج کا عدالتی نظام آج کے عیارانہ اذہان اور فنِ وکالت کی موشگافیوں کی مدد سے اسے سوچتا ہے تو وہ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ ملکہ کو خواہ مخواہ بدنام کیا گیا۔ عورت ذات اور پھر ملکہ اور آج سے کئی سو سال پہلے کا ذہن کیسے عقل باور کر سکتی ہے۔ ملکہ اپنے ادنیٰ غلام کے گریبان میں ہاتھ ڈال دے اور اس کے پیچھے بھاگنا شروع کر دے۔ عقل اسے قبول نہیں کر سکتی۔ غلام ہزار خوبصورت

سہی ۔ کیا ملکہ اپنے مقام کو نہیں سمجھتی تھی ۔ وہ اس کے پیچھے کیسے بھاگ کھڑی ہوئی یہ پوری داستان اصولِ درایت کے خلاف ہے ۔ بیشک قرآن نے اس روایت کی توثیق فرما دی ہے لیکن درایت کو کیسے نظر انداز کیا جائے ۔

ممکن ہے غلام کی قمیص اس حادثے سے پہلے ہی اتفاقاً پھٹ گئی ہو ۔ بچّوں کی بھاگ دوڑ میں غلام کا کرتا پہلے ہی کہیں شگاف آلود ہو گیا ہو ۔ شاہد کی ہمدردیاں غلام کے ساتھ ہوں یا اتفاقاً معاملہ ہی اس نہج پر آ گیا ہو ۔ اس وقت عدالت نے چونکہ اس احتمال اور امکان پر غور نہیں کیا ۔ اس لئے یوسف کی برأت مشکوک اور امرأۃ العزیز کا جرم یا مصر کی عدالت کا فیصلہ نظر ثانی کے لئے پھر قانونی عدالت میں آنا چاہیئے ۔ اس کے علاوہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک طاقتور نوجوان پوری قوت سے بھاگ رہا ہو تو ایک عورت اس تیزی سے دوڑے کہ نوجوان کا دامن چاک کر دے ۔ ممکن نہیں ہے کہ عورت اس تیزی سے دوڑ سکے ۔ عورت کے بدن کی ساخت اور جسم کے مختلف اجزاء کی ہیئت کذائی کا تقاضا ہے کہ وہ جوانمرد کو نہ پکڑ سکتی ہے نہ اس کے پیچھے اس طرح دوڑ سکتی ہے ۔ مصر کی عدالت کا فیصلہ محض جذباتی ہے اس کی اپیل ہونی چاہیئے ممکن ہے ملکہ کا الزام غلام پر درست ہو اور درایت کی رو سے ملکہ مصر بری نکلے ۔

اس قسم کی اور بھی کئی تنقیحات امکان اور احتمال کی مشین کے ذریعے سے فن کار اور ماہر وکیل پیدا کر سکتے ہیں اور درایت کے عاشق درایت کی ریتی سے واقعات کا برادہ کر کے دے سکتے ہیں ۔

اس ساری وکالت پروری کا جواب ایک سادہ دل اور دیانتدار انسان تو یہی دے گا کہ جس ماحول میں جرم ہوا اس ماحول کی عدالت نے مناسب تحقیق کے بعد جو فیصلہ کیا وہی درست ہے ۔

میں نے حضرت یوسفؑ کے شاہد کی از روئے حدیث پوزیشن کو عمداً نظر انداز

کیا ہے اس لئے کہ ہمارے فریق مخالف اسے مانتے ہی نہیں اور یہاں تو وہ بظاہر قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن نے تو شاہد اسی کو کہا ہے جس میں شہادت کی فقہی شروط پائی جائیں اور ان حضرات کی بارگاہ میں معجزہ اور کرامت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں!

قرآن عزیز میں اور بھی ایسے واقعات ہیں جن پر بحث کی گنجائش ہے اور آج کا قانونی مزاج اس پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اس دور کے قانون پیشہ اور جج یقیناً محسوس کریں گے کہ ان پر مرافعہ اور نظر ثانی کی کافی گنجائش ہے۔ امکان اور درایت کے ہتھیاروں سے قرآن پر بھی حملہ کیا جا سکتا ہے جو اہلِ قرآن کا اصل مقصد ہے۔

حضرت داؤد کے پاس بھیڑوں کا کیس پیش ہوا تو حضرت نے ڈگری ایک بھیڑ والے کے حق میں دی اور ننوے بھیڑوں والے کے خلاف فیصلہ صادر فرمایا اور مدعا علیہ کا بیان تک نہیں سنا۔ استغاثہ کی کہانی سن کر مستغیث کو ڈگری دے دی۔ ممکن ہے ایک بکری کا مالک ایک کی صحیح نگہداشت ہی نہ کر سکتا ہو۔ مدعا علیہ کا خیال ہو گا کہ وہ ریوڑ میں آکر زیادہ اور بہتر طور پر پرورش پا سکے گی۔ حضرت داؤد کا اس کے خلاف بغاوت اور ظلم کا فیصلہ آج کے عدالتی ماحول میں یقیناً مرافعہ کا مستحق ہے اور درایۃً محلِ نظر۔

سورۂ نون میں باغ والوں کا قصہ مذکور ہے جو بے چارے سوالیوں کی بھیڑ اور اپنے باغ کی حفاظت اور فائدہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا شکار ہوتے حالانکہ ان کا کوئی جرم نہیں۔ باغ ان کو باپ کی وراثت میں ملا۔ مسکین کو دینا نہ دینا شرعاً مالک کی مرضی ہے۔ پھر اس میں مستحق اور غیر مستحق کی بحث بھی آ جاتی ہے لیکن ناراضگی میں ان بے چاروں کا باغ برباد کر دیا گیا اور وارننگ تک نہیں دی گئی بے شک یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لیکن جب عقل و شعور کی توجیں انسانی حقوق اور

عدل وانصاف کی حمایت کے لئے میدان میں آجائیں تو وہاں حقائق کو کھل کر سامنے آنا چاہیئے۔ اللہ اور رسول کے نام سے ایسے موقع پر اپیل نہیں کی جا سکتی۔ عقل وشعور کے مفتی کو بہرحال اپنا فتویٰ صادر کرنے کا حق ہے۔ اس کا اثر خدا پر پڑے یا اسکے رسول پر۔ آخر انسانی حقوق اور عدل وانصاف کے تقاضے بھی تو انھیں کے بنائے ہوئے اور بتائے ہوئے ہیں۔ پھر وہ کیوں اس کی پابندی نہ کریں اور عقل و درایت کی تنقید سے وہ کیوں بچیں۔ اصول سب کے لئے اصول ہے۔

عقل اور احتمالات کے گھوڑے اگر اسی طرح سرپٹ دوڑانا شروع کر دیں جس طرح سنت اور حدیث کے خلاف ان کی لگامیں ڈھیلی کر دی گئی ہیں تو ان کی یورش سے نہ خدا بچے گا نہ رسول، نہ کوئی حقیقت محفوظ رہے گی نہ کوئی اصول۔

خود بے چارے ابلیس کا کیس اسی نوعیت کا تھا۔ معمولی سی عقل و درایت کی گرفت سے ہمیشہ کے لئے مطرود اور جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ اپیل کے لئے بھی اسے کوئی موقع نہیں دیا گیا۔

سازش کہاں کہاں ؟

اب سازش کے ان مریضوں سے گذارش ہے کہ آپ کا کیس خراب ہو چکا۔ آپ کو آج سے چند صدیاں پہلے ہونا چاہیئے تھا۔ پھر ضروری تھا کہ کسی پولیس کے ہمرنگ محکمہ میں ملازمت کرتے اور ایسے انداز کے آفیسر آپ کو مل جاتے تو ممکن تھا کہ آپ کا کیس کمزور بھی ہوتا تو فیصلہ آپ کے حق میں ہو جاتا۔ یورپین مکتشفین کی شہادتیں آپ کے حق میں ہوتیں۔ آپ کو سازش اس وقت سوجھی جب اس کا وقت گذر چکا۔ فن کی تکمیل اور رجال کی موت پر صدیاں گذر چکیں۔ آپ نے تیرہ صدیوں کے بعد صرف حدیث کے متعلق سازش کا احساس کیا۔ مگر سازش ساری علمی دنیا میں اپنا جال بچھا چکی ہے۔ قرآن مجید کا تواتر لفظی جس پر آپ حضرات اترا رہے ہیں وہ بھی عجمی اثرات سے محفوظ نہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ قرآن کے معنیٰ اور مفہوم تو متواتر نہیں۔ الفاظ متواتر ہیں۔

اختلافِ قرأت کے باوجود قرآن متواتر ہے۔ یہ قرأت اور فن تجوید ہم تک قرار سبعہ کی معرفت پہنچا اور ان کی اکثریت عجمی ہے۔ دیکھا آپ نے کہ جس تواتر پر آپ کو ناز ہے اس کی کلید عجمیوں کے ہاتھ میں ہے۔

قرار سبعہ

(۱) عبداللہ بن کثیر مکی ۱۲۰ھ
(۲) نافع بن عبدالرحمان مدنی ۱۶۹ھ
(۳) عبداللہ بن یزید بن تمیم ابن عامر ۱۱۸ھ
(۴) ابوعمرو بن علاء المقری البصری ۱۵۴ھ
(۵) عاصم بن ابی النجود الکوفی ۱۲۷ھ
(۶) حمزہ بن حبیب بن عمارہ ۱۵۸ھ
(۷) ابوالحسن علی بن الکسائی ۱۲۹ھ

ان سات حضرات میں سے صرف دو عرب ہیں۔ ابن عامر اور ابوعمرو۔

ولیس فی ھؤلاء السبعۃ من العرب الا ابن عامر و ابو عمرو۔
(الجواھر المضیئہ ج ۲ ص ۴۲۳)

عربی زبان کی امامت بھی عجمیوں کے سپرد ہوگئی۔ ابن خلدون فرماتے ہیں۔

فکان صاحب صناعۃ النحو سیبویہ والفارسی بعدہ والزجاج من بعدھما کلھم عجم فی انسابھم (مقدمہ ص ۵۰۰)

سیبویہ ابوعلی فارسی اور ان کے بعد زجاج یہ نسباً عجمی ہیں" اور سنئے:۔

وکان علماء اصول الفقہ کلھم عجما (مقدمہ ابن خلدون ص ۵۰۰)

"علماء اصول فقہ سب عجمی تھے" اور سنئے:۔

وکذا حملۃ علم الکلام وکذا اکثر المفسرین ولم یقم بحفظ العلم وتدوینہ الا الاعاجم (حوالہ مذکور)

"متکلمین عجمی ہیں، مفسرین کی اکثریت عجمی ہے"

غرض دینی علوم کی حفاظت کی ذمہ داری تمام تر عجمی علماء پر آ گئی اور آپ خرگوش کی نیند سوتے رہے۔

دیکھئے! آپ صرف حدیث میں عجمی سازش سمجھ رہے ہیں۔ آپ کی پوری علمی جائداد پر عجمی قبضہ ہے۔ افسوس ہے آپ کو اس سازش کا اس وقت علم ہوا جب آپ پورے طور پر لٹ چکے تھے اور عجمیوں نے صدیوں سے سارے علوم کے در و بست پر قبضہ کر لیا۔ لیکن آپ کو یورپ کے مکتشفین نے صرف حدیث کے متعلق بتایا۔ آپ نے لاعلمی کی وجہ سے اسے بہت بڑا اکتشاف سمجھا۔ حالانکہ یہ صرف لاعلمی کی ستم ظریفیاں ہیں اور بس!

علم اور جہالت میں فرق ابن خلدون یورپ کے مؤرخین میں مسلمہ امام ہیں۔ تاریخ کی جدید تدوین ان کی رہین منت ہے۔ یہ خود اندلس کے رہنے والے اور عجمی ہیں لیکن وہ عالم ہیں۔ علوم کی تدوین اور ان کے تدریجی ارتقاء کی پوری تاریخ ان کی نظر میں ہے۔ وہ اس حقیقت کی علمی تحقیق فرماتے ہیں کہ دینی علوم پر عجمیوں نے کیسے قبضہ کیا اور کیوں؟

ومن الغريب الواقع ان حملة العلم فى الملة الاسلامية اكثرهم العجم ولا من العلوم الشرعية ولا من العلوم العقلية الا القليل النادر وان كان منهم العربى فى نسبته فهو عجمى فى لغته ومرباه ومشيخته مع ان الملة عربية وصاحب شريعتها عربى (مقدمہ ص ۴۹۹)

"یہ عجیب واقعہ ہے کہ علماء اسلام اکثر عجمی ہیں۔ شرعی اور عقلی علوم میں عرب قلیل اور نادر رہیں۔ اگر ان میں کوئی نسبت کے لحاظ سے عربی ہے تو لغت تربیت اور شیوخ کے لحاظ سے عجمی ہے حالانکہ ملت عربی ہے اور نبی بھی عربی"۔

اس کے بعد ابن خلدون اس کی وجہ بتلاتے ہیں :-

"اس کا سبب یہ ہے کہ اسلام میں ابتداءً سادگی تھی ۔ اس میں علم اور صنعت نہ تھی ۔ بدوی سادگی کا یہی تقاضا تھا ۔ دین کے اوامر اور نواہی نقلاً حافظوں میں موجود تھے ۔ وہ ان کے ماخذ کو کتاب وسنت سے جانتے تھے ۔ انھیں تعلیم وتالیف اور تدوین کی ضرورت نہ تھی ۔ یہ طبعی اور قدرتی روش صحابہ اور تابعین کے زمانہ تک قائم رہی ۔ اس قسم کے اہل علم کو وہ اپنے عرف میں قراء کہتے تھے اسی طرح قرآن وسنت کے حافظوں کو بھی وہ قاری ہی کے نام سے تعبیر کرتے تھے ۔ اس لئے کہ وہ قرآن عزیز اور سنن نبویہ ماثورہ سے مسائل کو سمجھتے تھے اور معلوم ہے کہ حدیث قرآن کی تفسیر ہی تو ہے ۔ جب حفظ ونقل کا زمانہ دور ہوتا گیا تو عباسی دور اور ہارون الرشید کی حکومت میں قرآن مجید کے لئے تفاسیر اور احادیث کو قید تحریر میں لانے کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ اس کے ساتھ ہی اسانید رجال اور علوم جرح وتعدیل کی ضرورت ابھر آئی تاکہ احادیث کے ضعف اور صحت پر بحث کی جا سکے پھر احکام کے استنباط واستخراج اور زبان کو بگاڑ سے بچانے کے قواعد بنائے گئے ۔

یعنی صرف ونحو ، معانی ، بیان وغیرہ علوم عربیہ کی بنیاد رکھی گئی ۔ اس طرح ان تمام علوم نے فن اور حرفت کی صورت اختیار کرلی ۔ عرب حکومت کی مشغولیت اور موروثی سادگی کی وجہ سے پیشہ وری اور صنعت وحرفت سے نفرت کرتے تھے ۔ عجمی اہل علم چونکہ شہرت کے عادی تھے ۔ ان کے ہاں صنعت وحرفت ایک اعزاز تھا ۔ اسی لئے طبعی رجحانات کی وجہ سے تمام علوم کی سرپرستی عجمیوں کے سپرد ہوگئی اور اپنی مخلصانہ محنت اور جانفشانی کے بل بوتے پر وہ اسی اعزاز کے اہل قرار پائے (مقدمہ ابن خلدون ص۵۰۰)

نہ اس میں کوئی سازش تھی نہ دھوکہ۔ بلکہ قدرتی تقسیم کار تھی جو خود بخود ہو گئی خدا کی قدرت ہے کہ پوری بارہ صدیوں میں اکابر اور فحول اہل علم اہل عجم خولیا سے محفوظ رہے۔ تیرہویں صدی کے اواخر میں یہ تکلیف سکرٹریٹ کے چند پنشنر کلرکوں کو ہوئی جس کا اثر عوام پر بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ سب کو صحت عطا فرمائے اور عقل و دیانت سے سوچنے کی توفیق دے۔

سازش کے اثرات

عقلمند آدمی کے لئے ضروری ہے کہ اپنا معاملہ ہر پہلو سے سوچے اور خطرے کے ہر گوشہ کو کھلی کھلی نظر سے دیکھے فارسی سازش کا کھٹکا ہمیں صرف اس لئے ہوا کہ ہم نے فارس کو فتح کیا۔ فارسی حکومت اس کے بعد صفحۂ ہستی سے ناپید ہو گئی۔ ہم نے آج کے حالات میں دیکھا کہ مغربی حکومتیں باہم سازش کرتی ہیں۔ انتداب کے بہانہ سے چھوٹی حکومتوں کو دبا لیتی ہیں اور فنی امداد کے بہانے کمزور حکومتوں میں سازشوں کے جال بچھا دیتی ہیں۔ کچھ امداد دے کر بعض اوقات لوگوں کے ایمان تک خرید تی ہیں۔ آہستہ آہستہ چھوٹے ملک ان کے سہارے پر جینے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ آپ نے یہ سمجھا کہ خلیفہ ثانی نے جب فارسی شہنشاہیت کو تاراج کیا تو فارسیوں نے عربوں کے خلاف ضرور کوئی سازش کی ہو گی۔ یہ استدلال بظاہر واقعات پر مبنی معلوم ہوتا ہے اس لئے تھوڑی دیر کیلئے ذہن کو اپنی طرف پھیر لیتا ہے اور عام آدمی جس کی نظر اپنی اور عام قومی تاریخ پر نہ ہو، اس سے ٹھوکر کھا سکتا ہے لیکن آپ تھوڑی سی گہرائی میں جائیں تو آپ یقین کریں گے کہ اس استدلال میں بہت کافی خلاء ہے جس نے دلیل کو قطعی بے کار کر دیا ہے،

۱۔ اس وقت کی حکومتوں کو آج کل کی حکومتوں کے مزاج پر قیاس کرنا درست نہیں۔ آج کی حکومتوں کے مزاج میں جمہوریت کے اثرات پائے جاتے ہیں شخصی حکومتیں اور ملوکیتیں بھی اس امتزاج سے خالی تھیں۔ اس لحاظ سے پوری دنیا کا مزاج بدل چکا ہے۔ استبداد کافی حد تک ختم ہو چکا ہے

اس لئے اس وقت کی شخصی بادشاہتوں کو آج کی جمہوری حکومتوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ اس وقت کے مستبد بادشاہ اپنے قریبی اعزہ اور اقارب کو بھی عموماً دشمن بنا لیتے تھے۔ ملوکیت کی پوری تاریخ اس قسم کے حوادثات سے بھری پڑی ہے۔ بھائی نے بھائی کو قتل کرا دیا۔ بیٹے نے باپ کے خون سے ہاتھ رنگ لئے ایسے لوگوں کے لئے عصبیت اور ان کی حمایت میں سازشیں اور بغاوت کون کرے۔

۳۔ یہ درست ہے کہ مروان الحمار کی حکومت کے خلاف بغاوت کیلئے خراسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی اس لئے نہیں کہ اس میں فارسی عنصر زیادہ تھا۔ اس بغاوت کے سرغنہ تو عرب ہی تھے یعنی ہاشمی اور عباسی اہلِ بیت کی حمایت کے بہانہ سے یہ لوگ وہاں سازشیں کر رہے تھے ان میں فارس کے شاہی خاندان کے فارسی ہمدردوں کا تاریخ میں کوئی پتہ نہیں چلتا ہے بغاوت کے لئے یہ مقام اس لئے انتخاب کیا گیا کہ یہ پایۂ تخت یعنی شام سے کافی دور تھا۔ اطلاعات پہنچنے میں دیر ہوتی اور سرکوبی کے انتظامات کی وہاں تک رسائی کافی مشکل ہوتی۔ یہ حادثہ حدیث کے معاملہ میں فارسی سازش کیلئے دلیل نہیں بن سکتا۔

۴۔ پھر آپ نے کبھی اس چیز پر بھی غور فرمایا کہ سرزمین حجاز سے شروع ہو کر اسلامی حکومت اقطارِ عالم تک لاکھوں مربع میل زمین پر پھیلی ہوئی تھی۔ آپ سوچیں! آپ کو صلح سے کوئی ملک ملا۔ خود سرزمین حجاز میں قدم قدم پر لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ مکہ پر فوج کشی کی ضرورت ہوئی۔ نجد لڑائی سے ملا۔ شام، عراق، حبش، یمن کے بعض علاقوں پر لڑنا پڑا۔ سمندر کے ساحلی علاقوں پر جنگیں ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی میں کم وبیش بیاسی جنگیں لڑنا پڑیں

پھر یہ جنگوں کا سلسلہ خلیفہ ثالث کی حکومت کے درمیانی ایام تک جاری رہا۔ پھر خلیفہ ثالث کے آخری دور سے شروع ہو کر حضرت علی کی حکومت کا پورا زمانہ قریب قریب باہمی آویزش کی نذر رہا۔ ۶۱ھ کے بعد جوں ہی ملک میں امن قائم ہوا خلفائے بنی امیہ نے شخصی کمزوریوں کے باوجود جہاد فی سبیل اللہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہندوستان، اندلس، بربر، الجزائر تمام علاقے جنگ ہی سے اسلامی قلمرو میں شامل ہوئے۔ پھر آپ کے قلم اور دماغ نے سازش کا نزلہ صرف فارس پر کیوں گرایا؟ اگر محض ملک گیری اور فتوحات کی بنا پر بناوتیں، سازشیں تصنیف کی جا سکتی ہیں تو حجازی سازش، ہندوستانی سازش، بربری اور اندلسی سازش کیوں نہیں بنائی گئی؟ کیا شام کے یہودی معصوم تھے، عراق اور روم کے مشرک اور عیسائی فارسیوں سے زیادہ پاک باز تھے؟ ان کی حکومتیں مسلمانوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ نہیں اتریں؟ مصر میں اسلامی فتوحات سے قبطی اور مصری قوموں کا وقار پامال نہیں ہوا؟ پھر آپ مصری سازش کے متعلق کیوں نہیں سوچتے؟

اگر عقل کا دیوالہ نہیں دے دیا گیا تو اپنی فتوحات کی پوری تاریخ پر غور فرمائیے چین کے سوا شاید ہی کوئی ملک ہے جہاں مسلمانوں کے خون نے زمین کو لالہ زار نہ کیا ہو۔ مغربی سمندر کے سواحل پر آپ کی فوجیں برسوں لنگر انداز رہیں ان لوگوں پر آپ کو سازش کا شبہ کیوں نہیں۔ آپ الٹا خود ہی ان کی سازش کا شکار ہو گئے؟

غزالی، ابن مکرم، ابن عربی، ابن العربی شاطبی، ابن حزم، یحییٰ بن یحییٰ مسعودی وغیرہم قرطبہ اور اندلس کے علماء کو کیوں سازشی نہیں کہا جاتا۔ اگر خراسان بخارا، قزوین، ترمذ نسا کے علماء پر حدیث کے سلسلہ میں سازشی ہونے کی تہمت اس لئے لگائی گئی ہے کہ ان بزرگوں نے سنت کے پرانے تذکروں، صحابہ اور تابعین کی بیاضوں اور سلف امت کے مسودات سے تدوین حدیث کے لئے راہیں ہموار کیں

تو علمار اندلس نے بھی سنت کی کچھ کم خدمت نہیں کی۔ شروحِ حدیث، فقہ الحدیث اور علوم سنت کی خدمت میں ان بزرگوں نے لاکھوں صفحات لکھ ڈالے۔ ان خدمات کو کیوں سازش نہیں کہا گیا۔ منکرینِ سنت کے پورے خاندان میں کوئی عقلمند نہیں جو ان حقائق پر سنجیدگی سے غور کرے۔ کیا علوم دینی اور فنون نبوت کی ساری داستان میں آپ کو صرف علمار فارس ہی مجرم نظر آئے۔

من کان ھذا القدر مبلغ علمہ   فلیستتر بالصمت والکتمان

فارسی سازش کے متعلق گذارشات میں کسی قدر تفصیل سے عرض کرنا پڑا اس لئے کہ عوام کے ذہن اس تہمت سے متاثر ہیں۔ بعض پڑھے لکھے لوگوں میں بھی اس تہمت کی وجہ سے تذبذب پایا گیا ہے۔ دین کا علم رکھنے والوں اور اپنی علمی تاریخ سے واقف حضرات کے ذہن پر اس کا کوئی اثر نہ تھا، رجال اور ان کی تاریخ سے تھوڑے بہت واقف کو بھی اس پر شک نہیں گذرتا لیکن رنج ضرور ہوتا ہے کیونکہ یہ ان لوگوں پر تہمت ہے جو دینی علوم کے ستون ہیں۔ دینی اور شرعی علوم کے آسمان ان ہی اقطاب پر گردش کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ سازشی ثابت ہو جائیں تو اسلام کی پوری عمارت زمیں بوس ہو جائے گی۔

فرض کیجئے اگر امام ابوحنیفہ رح، امام شافعی رح، امام مالک رح، امام احمد بن حنبل رح امام بخاری رح، امام مسلم بن الحجاج، امام ابو عیسیٰ الترمذی ایسے بزرگ اسلام کے خلاف سازش کرنے لگیں تو فقہ اور حدیث دونوں مشتبہ اور نا قابلِ اعتماد قرار پائیں گے پھر اگر یہ سلسلہ اس طرح بڑھتا چلا جائے تو صرف و نحو، معانی، بیان، اصول کلام، سارے علوم مشکوک ہو جائیں گے۔ تیرہ سو سال کی محنت جو عرب اور عجم سب نے مل کر کی ساری غارت ہو جائے گی بلکہ پوری امت کو کم فہم اور عقل فراموش تسلیم کرنا ہوگا جو ساری عمر اس شر انگیز شرارت کو معلوم نہ کر سکے۔ یہ تو بلاہت کی انتہا ہو گی۔

پھر ان ناقلینِ آثار میں امام شافعی رح مطلبی اور امام مالک رح، امام احمد بن حنبل رح، ابو عبید قاسم بن سلام ایسے خالص عرب بھی شامل ہیں نیز ہر دور میں کتاب وسنت اور دینی علوم کی خدمت عرب اور عجم مل کر اپنی بساط کے مطابق کرتے رہے اور کسی کو محسوس نہ ہوا کہ ہم عجمیوں کی سازش کا شکار ہو چکے ہیں۔ یہ امت پر مضحکہ خیز پھبتی ہو گی۔ خصوصاً جب یہ معلوم ہو کہ صدیوں کے بعد چند بے علم یا محدود العلم کلرکوں نے اس سازش کا سراغ لگا لیا۔ دنیا کے دانش مند اکابر امت کے اس تساہل پر تعجب کریں گے اور ہنسیں گے۔
حالانکہ اس میں لاعلمی اور عجائب پسندی کے سوا کچھ بھی نہیں امید ہے کہ احباب ان مختصر گذارشات پر غور کریں گے۔

تحریک انکار حدیث کی رفتار

مولوی عبد اللہ صاحب سے مولوی محمد رمضان اور مولوی حشمت علی صاحب تک اس تحریک کے سوچنے کا انداز یہ رہا کہ گویا اس ساری تحریک کے پیش نظر ایک مکان کی آبادی تھی جس کا مالک اور منتظم شیخ چٹو ہے۔ مولوی عبد اللہ وغیرہ بحیثیت مولوی وہاں رہتے ہیں۔ کچھ لکھتے ہیں کچھ بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ انکے نزدیک اسلام کے تقاضے صرف اسی قدر ہیں۔ شیخ چٹو ناراض نہ ہوں اور مولوی عبد اللہ کچھ لکھتے پڑھتے رہیں، عوام کو مطمئن رکھا جائے کہ مولویوں نے اسلام میں بڑی خرابی پیدا کر دی ہے۔ اسلام بہت لمبا ہو گیا ہے۔ حدیثوں نے اس میں اور اضافہ کر دیا ہے چنانچہ مولوی عبد اللہ صاحب سے مولوی رمضان صاحب تک یہ مختصر سا کارخانہ چلتا رہا اور ان سب بزرگوں کو آرڈر دیا گیا کہ ازراہ عنایت ہلکی پھلکی سی نماز بنا دیں تاکہ مولویوں کی پرانی نماز سے پیچھا چھوٹ جائے۔ کام ہوتا رہا۔ نماز بنتی رہی۔ منکرین حدیث کے بڑے بڑے فاضل دن رات کام کرتے رہے۔ پچاس سال تک اکابر امت پر پھبتیاں اڑتی رہیں۔ پچاس سال کے بعد معلوم ہوا کوئی متفقہ نماز نہیں بن سکی

نہ رکعات کا تعین ہو سکا۔ نہ وظائف طے ہو سکے نہ اوقات کا فیصلہ ہو سکا۔ پچاس سال کے بعد کاریگر باہم دگر دست و گریباں ہو گئے۔ ہر ایک نے دوسرے کے کام کو غلط اور ناتمام کہا۔

آخر نماز نہ بن سکی۔ مالک تنگ آگیا، اس نے آرڈر واپس لے لیا اور کارخانہ بند کر دیا۔ اور کاریگر ملتان، گوجرانوالہ، ڈیرہ غازیخان منتقل ہو گئے۔

یہاں تک اسلام چند فقہی مسائل کا نام تھا، جن میں سب سے پہلے نماز ہی ان حضرات کی نگاہ میں آئی جو نہ بن سکی یہ حضرات نہ اسلام کو نظام زندگی سمجھتے تھے نہ ہی انھوں نے اس کیلئے کوئی کوشش کی۔

پچاس سال کے بعد کچھ کلرک ریٹائر ہوئے کچھ یورپ زدہ حضرات احادیث کی تشریحات سے تنگ آئے ہوئے تھے جنھیں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور قربانی وغیرہ مسائل کسی طرح پسند نہ تھے، انھوں نے نظریہ تو مولوی عبداللہ صاحب سے مستعار لیا لیکن اپنے سابقہ تجربے سے فائدہ اٹھا کر نماز، روزہ، ارکانِ اسلام کو کچھ غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور فرمایا یہ سب وقتی احکام تھے جو اس وقت امت کو دیئے گئے تھے۔ اب دنیا بہت آگے نکل چکی ہے، وقت کے تقاضے بدل چکے ہیں، یہ نماز، وضو، روزے عبادات پرانا فرسودہ فلسفہ ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں زندگی کی دوڑ میں یورپ سے آگے نکلنا ہے۔ اس لئے اب عورت کو برقع اتار پھینکنا چاہیئے۔ اسے حق ملنا چاہیئے کہ وہ سرمحفل اپنے حسن کی نمائش کرے۔ کلب میں دوستوں سے ملے، مرد کو خواہ مخواہ اس پر بدگمان نہیں ہونا چاہیئے، ہر ایک کو اپنی خواہشات پورا کرنے کا حق ہے۔ یہ پابندیاں اور ستر، شرم وحیا یہ حدیثوں نے دین میں شامل کی ہیں۔ اب قرآن کے الفاظ یا ترجمہ کی ضرورت نہیں۔ اب صرف مفہوم اور مقصد سمجھنا چاہیئے اور قرآن اور اسلام کو نئے تقاضوں اور زندگی کی جدید راہوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ اگر یہ کشادگی اسلام میں پیدا نہ کی جاسکی تو زندگی آگے نکل

جائے گی، اسلام پیچھے رہ جائے گا، اس لئے قرآن کی تشریح وقت کے مطابق ہونی چاہیئے۔ حدیث کی حیثیت غیر مستند تاریخ کی ہے۔ اگر ضرورت محسوس ہو تو کبھی اس طرف بھی ایک نظر ڈال لی جائے لیکن اس کی تفصیلات اور آنحضرتؐ کے قول وفعل اور آپ کی خاموشیاں اگر دین تصور ہوں تو اسلام تنگ ہو جائے گا اور مسلمانوں کے لئے اس دنیا میں رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ انھیں قانون کی اساس نہیں بنانا چاہیئے۔ پیش آمدہ حوادث کے متعلق ہر زمانہ میں اس وقت کے لوگ اپنے حالات کے مطابق قرآن کی تفسیر کریں گے۔ تفسیر میں سلف یا خلف یا آں حضرتؐ کے ارشادات کی پابندی قطعاً نہیں ہوگی بلکہ یہ مجتہد اور مفسر حضرات جمہور کے انتخاب سے مقرر ہوں گے۔ ملاحظہ ہو " فیصلہ جسٹس محمد شفیع "، جہاں تک قرآن مجید کی تعبیر اور اس کے کلیات کو جزئیات پر منطبق کرنے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں جو کچھ عوام کے منتخب نمائندے طے کریں گے اسے بھی قانون کا درجہ حاصل ہوگا۔" (بحوالہ منصب رسالت نمبر صـ ۲۵۶)

اسی قسم کے منتخب نمائندوں سے ایک مرکز ملت تشکیل پائے گا۔ ہر زمانہ کا مرکز ملت احکام اسلامی، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، طلاق، بیوع، اجارہ، میراث، اموال غنیمت، ٹیکس وغیرہ کے متعلق آزادانہ فیصلہ کرے گا۔ وہ پیغمبرؐ اور ان کے صحابہؓ کے فیصلوں سے آزاد ہوگا۔ کسی دوسرے مرکز ملت کے فیصلے بھی اس کے لئے شرعی یا دینی حیثیت نہیں رکھیں گے۔

پہلے اور اب انکار حدیث کے پہلے دور کی حیثیت پہلے ذکر ہو چکی اب ان پڑھے لکھے بابو صاحبان کے نزدیک اسلام ایک چھوٹی سی ریاست ہے جس میں ہر چند ہزار آدمی آباد ہیں۔ بس اس اسٹیٹ کے منتخب نمائندوں کو ان چند ہزار آدمیوں کی ضروریات سے تعلق ہے اور بس یا اسلام ایک دفتر ہے جس میں چند بابو صاحبان کام کرتے ہیں۔ ان کی ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ وہ اس دفتر

کے رفقاء کی ضروریات کا خیال رکھیں۔ اسلام بلحاظ نظام زندگی یا بلحاظ نظام انسانیت نہ پہلے حضرات کی نظر میں تھا نہ یہ بابو حضرات ہی پوری دنیا کی دینی اور معاشی زندگی اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ مولوی عبداللہ اور ان کے ہم قرن رفقاء کی ناکامی اور غلط روی پر تو اتفاق ہے ہم ان کو پہلے ہی غلط سمجھتے تھے، اب یہ ان کے ہم مسلک حضرات بھی انھیں غلط سمجھتے ہیں۔ اس وقت نہ تو وہ تراجمۃ القرآن درست ہے نہ وہ تشریحات صحیح ہیں جو مولوی عبداللہ، مولوی رمضان، مولوی حشمت علی سابق منکرین حدیث کے متبنی محبوب شاہ آف گوجرانوالہ نے کیں نہ وہ نماز درست ہے جس پر ان سابقون اولون کے قریب قریب پچاس سال صرف ہوئے نہ مولوی احمد دین صاحب امرتسری کی بیان القرآن ہی کوئی ایسا علمی ذخیرہ ہے جس سے وقت کی ضروریات کا حل تلاش کیا جا سکے۔ اب ان تمام مشکلات کا حل ان بابو صاحبان کی نظر میں صرف مرکز ملت ہے اور اس کے لئے الیکشن۔

مرکزِ ملت کی مشکلات

ہمارے سامنے مرکز ملت کے مرتبین کی کوئی ایسی مکمل تحریر نہیں جس سے اس کی پوری پوری حقیقت معلوم کی جا سکے نہ ہی ان حلقوں سے جہاں تک ہمارا علم ہے کوئی ایسا دستور اور منشور شائع ہوا ہے جس سے مرکز ملت کا مفصل پروگرام اور طریق عمل معلوم ہو نہ ہی اس کی دستوری حیثیت کا کوئی مرقع ہماری نظر میں ہے جسے نئے منکرین سنت کی ذمہ دار جماعت نے شائع کیا ہو۔ اس لئے ہماری تنقیدی گذارشات اس کی امکانی یا متحمل مشکلات سے متعلق ہوں گی۔

۱۔ مرکز ملت کی تشکیل اگر عوام کے نمائندے کریں اور وہ نمائندے بھی قرآن فہمی میں عوام ہی کی طرح ہوں تو یہ مرکز ملت جہلاء کا مجموعہ ہوگا۔ جیسے کہ ہم کونسلوں، اسمبلیوں اور یونیورسٹیوں کے نمائندوں کو دیکھتے ہیں وہ بے چارے پارٹی کے نقطۂ نظر سے ہاتھ اٹھانے کے سوا کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ یہ مرکز ملت فقہ، تفسیر،

استدلال اور اجتہاد کے لئے قطعی بے سود بلکہ مضر ہوگا۔

۲۔ اگر نمائندوں کے لئے کچھ قیود اور پابندیاں ضروری ہوں تو قطع نظر اس سے کہ وہ عوام کے نمائندے نہیں ہوں گے۔ عوام اپنی لاعلمی کی وجہ سے ان کے علمی مقام کو نہیں سمجھ سکیں گے اس لئے یہ ووٹ بالکل غلط استعمال ہوگا جیسے سیاسی انتخابات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ عوام ووٹ کا صحیح استعمال نہیں کر سکتے۔ ہم نے بارہا دیکھا ایک عالم اور قانون داں کے بالمقابل عوام نے ایسے شخص کو ووٹ دیا جو اپنے دستخط نہ کر سکتا تھا۔

۳۔ غالباً فرمایا جائے گا کہ انتخاب کا حق قرآنی معاشرہ کو دیا جائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ قرآنی معاشرہ کہاں سے آئے گا اور کب تک دنیا اس کا انتظار کرے گی نظر بظاہر اگر موجودہ علماء کی مخالفت کوئی حکومت بزور شمشیر آج ہی ختم کر دے تو بھی دو سال تک قابل اعتماد قرآنی معاشرے کا بروئے کار آنا قریب قریب ناممکن ہے گویا یہ تجویز اپنی زندگی سے پہلے ہی آغوش قبر کی زینت ہوگی۔

۴۔ اس کے ساتھ ہی دنیا کو اب تک انتخاب کا کوئی ایسا طریقہ نہیں مل سکا جس سے بالکل صحیح اور اہل نمائندوں کا انتخاب عمل میں آسکے۔ دنیا کے معاملے میں تو عملی کمزوری قابل برداشت ہو سکتی ہے لیکن دین کے معاملہ میں اسے کیونکر برداشت کیا جائے گا کہ نالائق اور بدقماش بندے مرکز ملت کی مسند پر قابض ہوں اور بفحوائے حدیث پاک افتوا بغیر علم فضلوا و اضلوا۔ جاہل اپنی جہالت سے اپنی اور عوام کی تباہی اور بربادی کا موجب بنیں۔

جب دین میں احتیاط کا یہ عالم ہو کہ احادیث اس لئے ناقابل عمل ہوں کہ وہ اصلاحی طور پر ظنی ہیں اور یہ مجسم اور حقیقی وہم صرف اس لئے قبول کر لئے جائیں کہ

انھیں چند جاہلوں نے چند ووٹوں کی کثرت سے چند کرسیاں سپرد کر دی ہیں۔
انتخاب اور جمہوریت عملاً جس طرح تمام ممالک میں ناکام ہو رہے ہیں ممکن ہے یہ عملی ناکامی نظریاتی ناکامی پر منتج ہو اور دنیا کسی اور نظریہ کی تلاش میں چل نکلے پھر ہمارے یہ جمہوریت پرست حضرات منہ اٹھا کر دنیا کو دیکھنے لگیں۔

۵۔ پھر علیٰ علاتہ اگر اتفاقاً کبھی چند سال کے لئے ایسا معاشرہ میسر آجائے جو واقعی علمی طور پر صحیح اور اہل ہو تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ جو سوچیں وہ درست اور صحیح بھی ہو اور لوگ اس کے کیوں پابند ہوں اور ان کے اجتہاد کو دین اور شریعت کا مرتبہ کیوں دیں اس لئے کہ سابق مجتہدین کے اجتہادات جب شریعت اور دین نہیں بلکہ ان کے اجتہادات پر ہر زمانہ میں تنقید ہوتی رہی تو اس اجتہاد کو کیوں دین اور شریعت کا نام دیا جائے۔

۶۔ ظاہر ہے کہ اس مرکز ملت کے فیصلے دین نہیں ہوں گے اور آنے والے مرکز ملت کو لازماً ان مسائل سے تصادم اور اختلاف کا حق ہوگا تو چند سال کے بعد اگر ان تمام مراکزِ ملت کی روداد عمل جمع کی جائے تو یہ مجموعہ ایک مضحکہ خیز چیز ہوگا اور آنے والے لوگ اس چوں چوں کے مربے کو کھلی حماقت تصور کریں گے۔

۷۔ غالباً اس کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ ہم نے کب اسے شریعت یا دین کہا ہے۔ کب کہا ہے کہ یہ لوگ اسے ضرور قبول کریں تو ادباً گذارش ہے کہ اسمیں جدت کیا ہوئی۔ سابق مجتہدین کی فقہ میں اور اس مرکز ملت کے فیصلوں میں فرق کیا ہوا۔ مجتہدین کے فیصلوں میں علمی عقیدت شامل تھی یہاں وہ بھی ناپید ہوگی صرف حکومت ہوگی جس کی طفیل یہ حضرات مرکز ملت کہلائیں گے۔ اگر یہ مادی قوت نہ ہو تو ان اجتہادات کی اتنی وقعت بھی نہیں جو قہوہ خانوں اور ہوٹلوں میں رونق کا موجب ہوتی ہے۔

۸۔ اس کے جواب میں حرف آخر کے طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ واقعی یہ مادی دباؤ ایک نظام کے لئے ہے جس طرح ایک حکومت اپنے قوانین نافذ کرتی ہے، یا بارگاہ خلافت سے احکام کا نفاذ ہوتا ہے تو اس کے متعلق یہ گذارش ہے کہ ان دونوں میں بین فرق ہے۔ قانونی حکومت جمہوری ہو یا شخصی اس کے احکام کی کوئی شرعی حیثیت نہیں اور دینی حکومت اپنی مادی طاقت سے احکام کا نفاذ کرتی ہے وہ بذاتِ خود احکام کی تخلیق نہیں کر سکتی۔ حتےٰ کہ پیغمبر اپنی اطاعت اور اپنی مستقل حیثیت کے باوجود اطاعتِ الٰہی کی ترجمانی کرتا ہے۔ وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ رسول کی اطاعت در اصل اللہ ہی کی اطاعت ہے اس لحاظ سے یہ مرکز ملت ایک ایسی ذوالوجوہ مخلوق ہے جس کے خمیر میں نہ دین ہے نہ سیاست اس کے باوجود وہ دونوں پر مسلط ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ

۹۔ پھر یہ بھی سوچنے کی چیز ہے کہ اس نئی اصطلاح سے حاصل کیا ہوا؟ اس نظام کی ضرورت کیوں ہو؟ اگر یہ دینی نظام ہے تو اسے خلافت یا امارت کہئے اور اگر یہ فقہی کوشش ہے تو اسے اجتہاد کہئے۔ اسے ملت کی مرکزیت تو کسی طرح بھی میسر نہیں آ سکتی محض اصطلاحات اور الفاظ کی ہیرا پھیری سے ملت میں اختلاف کرنا ایک مجرمانہ کوشش ہے۔ ایسی قیادت کسی اعزاز کی مستحق نہیں جو محض اختلاف بین المسلمین کے سہارے پر زندہ ہے۔

اجتماعی اجتہاد

مرکز ملت کا جو تاثر مختلف اوقات میں دیا گیا ہے اس پر نہ ذہن مطمئن ہوتا ہے نہ ہی کوئی حقیقت ذہن میں اترتی ہے۔ البتہ اجتہاد کی اجتماعیت ذہن کو متاثر کرتی ہے۔ انفرادی حیثیت سے ممکن ہے۔ اجتماعی طریق زیادہ مفید ثابت ہو۔ مختلف علوم کے ماہر اگر ایک جگہ سر جوڑ کر سوچیں تو غالب خیال ہے کہ مختلف مصالح اور اس کے بالمقابل مضرتوں پر زیادہ

سنجیدگی سے غور ہو سکے لیکن اگر اس کے ساتھ انتخاب کی بیچ لگا دی گئی تو اس کی ساری افادیت ختم ہو جائے گی۔ بیچارے مجتہد یا الیکشن لڑیں گے یا اجتہاد کریں گے اور اگر خدانخواستہ انتخابات کا انداز بھی یہی رہا جو انگریزی دور حکومت کی یادگار ہے تو حضرت المجتہد مع اجتہاد و انتخابات میں رہن کی نظر ہو جائیں گے یا پھر باقی مدت قرض ادا کرتے رہیں گے۔ اور رشوت لیتے رہیں گے۔

مختصر یہ کہ محض ایک مفروضہ کی حیثیت سے تو مرکز ملت کا ذکر سامعہ نواز ہو سکتا ہے۔ ورد وظیفہ کی طرح تبرکاً اس کا تذکرہ ہو سکتا ہے لیکن عملی اور افادی لحاظ سے تو یہ بالکل بے کار چیز ہے۔ باعمل ذہن اس کا ذکر بھی پسند نہیں کرے گا۔

سنت جیسے مفید اور مقدس علم سے انکار کے بعد مرکز ملت کا تصور ذہن کی ایک لغزش ہے اور ایک فکری نامرادی، سنت کو ظنی کہنے والے کن اوہام اور مزخرفات میں گرفتار ہوئے۔ یہ حضرات اتنا نہیں سوچ پائے کہ آخر اس مرکز کے فیصلوں کی حیثیت قرآن کی ہے یا متواتر احادیث کی یا پھر آحاد کی۔ ہمیں تو اوہام اور مزخرفات سے بھی اس کا مقام پست معلوم ہوتا ہے۔ عملاً اس کا اثر محض جدلیات ہوں گے جن پر کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔

ایک فاضل جج کی غلط فہمیوں پر مبنی تنقیحات اور ان پر ایک نظر

حدیث کی تحقیق موجودہ دور میں

مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج میاں محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں۔

"میں اس بات کے حق میں نہیں ہوں کہ محدثین کی جمع کردہ احادیث کو اسلامی قانون کے سرچشموں میں سے ایک سرچشمہ تسلیم کر لیا جائے۔ جب تک اس کی

دوبارہ جانچ پڑتال نہ کر لی جائے اور یہ پڑتال بھی کسی تنگ نظری یا تعصب پر مبنی نہیں ہونی چاہیئے بلکہ ان تمام قواعد و شرائط کو بھی از سر نو استعمال کیا جانا چاہیئے جنھیں امام بخاری وغیرہ نے بے شمار جھوٹی، موضوع اور جعلی حدیثوں میں سے صحیح احادیث کو الگ کرنے کے لئے مقرر کیا تھا۔ نیز ان معیارات کو بھی کام میں لانا چاہیئے جو نئے حقائق و تجربات نے ہمارے لئے فراہم کئے (بحوالہ منصب رسالت نمبر ص ۲۷۶ رسالہ ترجمان القرآن لاہور)

احادیث کو نئے انداز پر پرکھا جائے۔ یہ آواز مدت سے زبان و قلم کی نوازش کے بعد سامعہ نواز ہو رہی ہے۔ قریب قریب پچاس سال کا عرصہ ان گرجتے بادلوں پر گذرا ہے اور یہ سنتے سنتے کان پک گئے ہیں کہ :۔

"حدیث کو نئے اصول کی روشنی میں تنقید کی سان پر رکھنا چاہیئے"

یورپ کے مستشرقین کے کارخانوں میں احادیث کی تنقید کے لئے ہتھیار بن رہے ہیں۔ ہم نصف صدی سے ان کے منتظر ہیں لیکن یہ بادل برستے نہیں تاحال ہم نے کوئی نیا ہتھیار نہیں دیکھا۔ ہمیں بتلایا گیا کہ حدیث قرآن کے خلاف نہیں ہونی چاہیئے عرض کیا منظور ہے لیکن قرآن کے مفہوم کی صحت کے لئے بھی معیار لائیے ممکن ہے آپ کو پرکھنے کی تکلیف ہی نہ ہو۔ پھر یہ اصول قدماء ائمہ حدیث کے ہاں کتب حدیث میں موجود ہے یا نہیں۔ مشکل صرف یہ ہے کہ آپ کے ہاں قرآن فہمی کے لئے کوئی اصول اور معیار نہ تھا اس لئے مسئلہ غلط مبحث سے آگے نہ بڑھ سکا۔

پھر فرمایا گیا، حدیث عقل کے خلاف نہ ہو، عرض کیا بالکل درست ہے لیکن ہم نے صدیوں سے عقلاء کو ٹھوکریں کھاتے دیکھا ہے، سارا علم منطق عقلاء کو ٹھوکروں سے بچانے کے لئے بنایا گیا لیکن وہ علم خود ٹھوکروں کا محمل اور کارخانہ قرار پایا اور ٹھوکریں ختم نہ ہوئیں۔ پھر جو معیار ہنوز کسی اور معیار کا محتاج اور منتظر ہے اسے موقع دیجیئے وہ اپنی تکمیل کرے۔ موجودہ پوزیشن میں افراد کی عقل کو چھوڑ دیئے

مجموعی طور پر عقل جو کچھ کر سکتی ہے اس سے ائمہ سنت اور فقہائے حدیث نے کب انکار کیا۔ معلوم نہیں پھر آپ حضرات ناراض کیوں ہیں۔

دراصل ہماری معذرت یا ترجمانی بھی آپ حضرات، منکرین حدیث اور ادارہ طلوع اسلام سے سنتے ہیں اور ان گونگے دانشوروں کا یہ حال ہے کہ وہ آج تک نہیں سمجھا سکے کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟ وہ آج تک جو کر سکے وہ سلب تھا اور تخریب تعمیر اور ایجاب کے طور پر وہ کیا کر پائے۔ آنکھیں اب تک اس کی منتظر ہیں۔

فرمایا گیا حدیث کو متواترات کے خلاف نہیں ہونا چاہئے۔ گذارش کیا گیا منظور ہے لیکن واقعات کی صحت کے لئے آپ کے ریسرچ کی کسوٹی کیا ہے؟ اس کا جواب موت نما خاموشی سے دیا گیا۔

یہ لوگ! یہ گفتگو ان طویل مناظرات اور مجادلات کا ملخص ہے جو مولوی عبداللہ صاحب سے لے کر حضرت مولانا غلام احمد صاحب پرویز تک ان حضرات نے فرمائی جن میں شاید کوئی ذہین آدمی نہیں۔ اصول کی تشکیل تو بڑی بات ہے۔ عام فقہی فروع کا استنباط اور استخراج بھی ان حضرات کے فہم سے بالا ہے یہ اعتراض تو کر سکتے ہیں مگر مصالح پر کلی اور جامع نظر کے بعد جزئیات کا استخراج اور قواعد کلیہ کی تشکیل کی استعداد ان کے خمیر میں نہیں ہے۔

جسٹس محمد شفیع صاحب بڑی اونچی اور مستند جگہ سے بولے تھے خیال تھا کوئی تعمیری اور کام کی چیز فرمائیں گے لیکن وہ غور فرمائیں کہ ان کے معلومات پرویز صاحب کی ترجمانی اور مولوی محمد علی لاہوری کی نقالی سے زیادہ نہیں اور وہ بھی یک طرفہ۔

کاش وہ ائمہ سنت اور ناقدین حدیث سے براہِ راست کچھ سنتے پھر انھیں معلوم ہوتا کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں وہاں بحمد اللہ بہت کچھ موجود ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور جو وہاں نہیں تجربہ آپ کو بتائے گا کہ اس کی ضرورت کسی دوسری راہ

سے پوری کردی گئی ہے۔

وکم من عائب قولاً صحیحاً
وآفتہ من الفہم السقیم

علم حدیث متحرک علم ہے فن حدیث نے بتدریج ترقی کی اسی طرح اس کے اصول میں بھی تدریجی ارتقار پایا جاتا ہے۔ امام ابو حنیفہ رح اور امام مالک رح مراسیل حجت سمجھتے تھے۔ امام شافعی رح نے اسانید کے تتبع سے محسوس کیا کہ اس میں ضعف کا امکان ہے۔ صحابی کے بعد بعض اوقات کئی تابعی آجاتے ہیں اس لئے ضروری نہیں کہ تابعی کے بعد متروک راوی صرف صحابی ہو علماء حدیث نے امام شافعی رح کی اس نکتہ آفرینی کو قبول فرمایا اور مرسل کی حجیت سے انکار کر دیا۔ حالانکہ امام مالک رح حدیث میں اور امام ابو حنیفہ رح فقہ میں سب کے تقریباً استاد تھے۔

امام مالک رح اہل مدینہ کے عمل کو حجت سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اہلِ مدینہ کا عمل سنت سے ماخوذ ہے۔ ائمہ حدیث نے اس اصول سے انکار فرما دیا۔ ملاحظہ ہو "محلی" اور "احکام فی اصول الاحکام" لابن حزم اور "اعلام الموقعین" اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا رسالہ "مذہب اہل المدینہ" بعض ائمہ کا خیال تھا کہ راوی کا فتویٰ اگر اس کی مرفوع روایت کے خلاف ہو تو اس کے فتویٰ کو روایت پر ترجیح دی جائے گی۔ لیکن ائمہ حدیث نے تحقیق کے بعد فیصلہ فرمایا کہ اگر فتویٰ کی تائید کسی مرفوع حدیث سے نہ ہو تو فتویٰ کے لئے اور بھی احتمالات ہو سکتے ہیں۔ اس لئے صحیح یہی ہے کہ ترجیح روایت اور مرفوع صحیح حدیث کو دی جائے۔

صحیح حدیث کی تعریف میں علماء کے مختلف اقوال ہیں جن کا تذکرہ الجزائری نے توجیہ النظر میں اور خطیب نے الکفایہ میں فرمایا ہے لیکن بالآخر صحیح حدیث کی یہ تعریف طے ہوئی جسے عادل اور ضابط راوی روایت کرے اس میں نہ کوئی علت

ہو اور نہ شذوذ ہو اور راوی کا مروی عنہ سے سماع ثابت ہو۔"

غرض مختلف مسائل میں بتدریج فیصلہ ہوا۔ تدریج کا مطلب ہے کہ مسئلہ بحث و نظر کے بعد کسی قطعی مرحلہ پر پہنچ جائے۔ اہل حدیث اور حدیث میں یہی طریق جاری رہا یہاں تک کہ اکثر مسائل میں بحث و نظر کی ضرورت رہی نہ گنجائش۔

آج بھی ہمارے پاس قرآن کا کوئی حکم اور سنت کا ایسا کوئی فیصلہ موجود نہیں کہ تنقید روایات و احادیث پر بحث و نظر کی راہیں بند ہو چکی ہیں۔ بلاشبہ فن متحرک ہے لیکن علماء نے ہر پہلو پر بحث و فکر کے بعد محسوس فرمایا کہ ضرورت کے مطابق فن کی تکمیل ہو چکی۔ آج سے صدیوں پیشتر کے واقعات پر احتمالات اور امکان کے گھوڑے دوڑانا ٹھیک نہیں۔ اس سے بحث برائے بحث کے سوا کچھ حاصل نہیں۔

صرف، نحو، معانی، بیان کا بھی یہی حال ہے کہ قریب قریب یہ فن کافی حد تک مکمل ہیں۔ ان فنون پر بحث سے شارع نے نہیں روکا۔ لیکن واقعات نے بتایا کہ اس کی ضرورت نہیں۔

اصول روایت

علامہ شبلی مرحوم نے سیرت النعمان میں فقہ حنفیہ کی حمایت میں فرمایا کہ اصولِ حدیث میں درایتاً بحث نہیں کی گئی لیکن اس مسئلہ میں مولانا مرحوم کوئی قیمتی معلومات مہیا نہیں فرما سکے اور جو فرمایا اس پر حسن البیان اور سیرۃ البخاری میں مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی رح اور مولانا عبدالسلام مبارک پوری رح نے اور الارشاد میں مولانا محمد ابو یحییٰ شاہ جہاں پوری رح نے قلم اٹھایا اور اس بحث کو انتہا تک پہنچا دیا۔ نتیجۃً اس کے بعد کی تصانیف میں مولانا شبلی نے سیرۃ النعمان کے اندازِ بحث و نظر کو بدل دیا۔ بلکہ آئندہ کے لئے تصنیف میں وہ راستہ اختیار ہی نہیں کیا۔

علمائے سنت کا یہ قطعی خیال نہیں کہ اصولِ حدیث میں اضافہ شرعاً ممنوع ہے

یا ان اصول پر تنقید شرعاً درست نہیں یا ان کا من وعن قبول کرنا شرعاً ضروری ہے بلکہ ان کا خیال یہ ہے کہ حدیث کی چھان پھٹک اور اس کے قواعد اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ مزید بحث بے ضرورت ہے۔

اصولِ حدیث کے قواعد کا تعلق یا لغت سے ہے یا واقعات سے ہے یا پھر ان کا تعلق عقل سے ہے جو بحث و نظر کے بعد مناسب حد تک پہنچ چکے ہیں۔ اب ان حقائق کو محض احتمالات سے نہیں بدلا جاسکتا۔

بعض مثالیں

مثلاً (۱) امام مسلمؒ فرماتے کہ راوی اور مروی عنہ میں ملاقات ممکن ہو تو یہ اتصال کے حکم میں ہوگا۔ وہ یہ ضروری نہیں سمجھتے کہ فی الواقع ان دونوں میں ملاقات ثابت کرنے کی کوشش کی جائے لیکن امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ کم از کم ان دونوں میں ایک دفعہ فی الواقع ملاقات ضروری ہے ورنہ اتصال مشکوک ہوگا۔ امام مسلمؒ نے مقدمہ صحیح مسلم میں اس بحث کو نکھارنے کی کوشش کی ہے لیکن جمہور ائمہ نے امام بخاریؒ کے خیال کو بحث کی تکمیل سمجھا۔ اب مزید یہی کہا جاسکتا ہے کہ ہر روایت کے لئے بار بار ملاقات ضروری ہے آپ غور فرمائیں یہ خیال بدگمانی کے مترادف ہے۔ ایک آدمی کی صداقت جب ایک دو دفعہ ثابت ہو جائے پھر بلاوجہ اسے جھوٹ سے متہم نہیں کیا جاسکتا۔

۲- اہل بدعت کی روایت کے متعلق ائمہ میں اختلاف تھا۔ بعض نے اسکی روایت کو مطلقاً رد کیا۔ بعض نے بلاشرط قبول فرمایا بالآخر یہی رائے قائم ہوئی کہ اگر راوی بدعت کا داعی ہو تو اس کی روایت مقبول نہیں ہوگی اور اگر روایت میں بدعت کی حمایت ہو تو بھی روایت مقبول نہیں ہوگی۔ البتہ نفس مسلک اور عقیدہ کو روایت کے قبول اور رد میں ائمہ حدیث کے نزدیک کوئی دخل نہیں اسی لئے وہ شرط مذکور کے ساتھ شیعہ اور خوارج کی روایت کو اختلاف کے باوجود قبول فرماتے ہیں۔

غرض یہ کہ اصول حدیث میں جمود نہیں بلکہ اس میں ارتقاء کے لئے پوری پوری

استعداد موجود ہے ۔ لیکن جب بحث ونظر ایک خاص نکتہ پر پہنچ جائے تو گفتگو کی گنجائش خود ہی ختم ہو جاتی ہے ۔ بحث ونظر کے بعد اہل فن ایک مقام پر پہنچ جانے کے بعد بحث کی گنجائش یا ضرورت نہیں سمجھتے یہ فن میں جمود نہیں بلکہ تکمیل ہے لیکن ہر فن کی تکمیل کے مراحل کا صحیح فیصلہ ماہرین فن ہی کر سکتے ہیں ، ہائی کورٹ کے جج قانون کا فیصلہ تو کر سکتے ہیں لیکن طب اور انجینئرنگ میں ان کے فیصلہ کو کوئی اہمیت نہیں دی جائے گی ۔

ائمہ حدیث کی رجال پر نظر

(۱) ہیثم بن بشر واسطی زہری کے شاگرد ہیں اور استاد شاگرد دونوں ثقہ ہیں اور دونوں بخاری کے رجال میں سے ہیں ۔ لیکن ہیثم کی روایت زہری سے صحیح نہیں اس لئے صحیح بخاری میں ہیثم عن الزھری کی کوئی روایت نہیں ۔ محدثین کی دقت نظر کا یہ حال ہے کہ وہ ہر ہر شاگرد کی مرویات پر ہر استاد کے لحاظ سے گہری نظر رکھتے ہیں ۔ انھیں معلوم ہے کہ ضبط میں کہاں خلل واقع ہوا اور فلاں شاگرد نے استاد سے اخذ کرنے میں کہاں کوتاہی کی ۔

۲۔ ورقاء بن عمر یشکری ثقہ ہیں لیکن منصور بن المعتمر کی روایات میں وہ پورے ضابط نہیں ہیں ۔ یہ دونوں رجال بھی بخاری کے ہیں لیکن ورقاء کی روایت منصور سے آپ کو صحیح بخاری میں نہیں ملے گی کیونکہ ورقاء منصور کی روایات میں ثقہ نہیں آپ کو نئے تحقیقی ہتھیاروں سے فن پر حملہ کرنے کا حق حاصل ہے لیکن آپ کے انکشافات واقعات میں کیا نیا رنگ بھر یں گے ؟ راوی راوی رہے گا اور مروی عنہ مروی عنہ ہو گا آپ اس میں کیا جدت فرمائیں گے ۔

۳۔ وضاح بن عبداللہ باتفاق ائمہ قابل اعتماد ہیں اور ثقہ لیکن قتادہ کی روایات میں وہ ثقہ نہیں ۔ اس لئے امام بخاریؒ صحیح میں وضاح عن قتادہ کا تذکرہ اپنی شرط کے خلاف سمجھتے ہیں باوجودیکہ دونوں ثقہ ہیں ۔

ایسے واقعات میں آپ کے جدید طریقے کون سے باب کا اضافہ کریں گے اور کون سا تارا توڑ کر لائیں گے؟ ماضی کے واقعات کی نوعیت آپ کی جدید بحث سے نہیں بدلے گی۔

۴۔ ولید بن مسلم دمشقی بالاتفاق ثقہ ہیں۔ لیکن امام مالکؒ سے انکی روایات صحیح نہیں۔ اس لئے اصول ستہ میں ولید کی امام مالکؒ سے کوئی روایت نہیں۔ البتہ امام بخاریؒ نے ولید کی روایت امام اوزاعی وغیرہ سے ذکر کی ہے۔ مالکؒ سے ثقاہت کے باوجود ان کی روایت کو صحیح نہیں سمجھتے۔

۵۔ تدریب الراوی میں حافظ سیوطیؒ فرماتے ہیں ہمام اور ابن جریج دونوں ثقہ ہیں لیکن ہمام کی روایت ابن جریج سے صحیح نہیں (تدریب ص ۴)

محدثین کی دقت نظر

ان گزارشات کا مقصد ایک تو یہ واضح کرنا ہے کہ ائمہ حدیث کی نظر رجالِ حدیث میں کس قدر عمیق ہے شخصی تعلقات اور شیخ و تلمیذ میں باہم تعلق اور استعداد کے متعلق ان کی نگاہ کس قدر غائر ہے۔

دوسرا یہ کہ آپ حضرات سمجھ سکیں کہ کسی فن کے مخفی گوشوں پر ایسی محققانہ نظر کسی سازش کا نتیجہ ہے؟ یا محبت کے گہرے جذبات اور مخلصانہ عقیدت اس کی داعی ہے؟ انکارِ حدیث کے نظریہ سے متاثر ہونے والے مخلصین سے میری درخواست ہے کہ توجیہ النظر للعلامہ طاہر بن صالح الجزائری، قواعد التحدیث لجمال الدین القاسمی۔ تدریب الراوی للسیوطی، علوم الحدیث للحاکم۔ مقدمہ ابن صلاح اور اختصار علوم الحدیث للحافظ ابن کثیر میں علوم الحدیث کا تنوع ملاحظہ فرمائیں پھر اپنے ضمیر اور دیانت سے سوال کریں کہ آیا جو لوگ سازشیں کرتے ہیں۔ انکے کام کا یہی انداز ہوتا ہے۔

رہا ادارہ طلوع اسلام تو اس سے نہ علم و فہم کی امید ہے نہ تقویٰ اور دیانت

کی وہ تو بلا تامل فرمائیں گے کہ :-

امام بخاریؒ کا ان روات سے نقل نہ کرنا فارسی سازش ہے اگر وہ ان کی روایات نقل کر دیتے تو یقیناً فارسی سازش ختم ہو جاتی سے

نظیری را بجفل بردم و گویا غلط کردم
مرا رسوائے عالم ساخت چشم گریہ آلودش

ان حضرات کے لئے تو بہترین مقام یا جیل ہے یا مینٹل ہسپتال ۔ ما لھٰؤلاء القوم لا یکادون یفقھون حدیثا۔

حافظ حازمی کی شروط الائمۃ الخمسہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے جمع اور تدوین حدیث میں کس قدر محنت فرمائی اور کس قدر دقّت نظر سے فقہی ابواب مرتب فرمائے تاکہ ان علوم سے بیش از بیش فائدہ اٹھایا جا سکے ۔ ان حضرات پر سازش کی بدگمانی ایمان اور دیانت سے اعلانِ جنگ ہے ۔

احادیث میں عریانی

جسٹس محمد شفیع صاحب نے حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ کی بعض احادیث جو غسل جنابت اور میاں بیوی کے باہمی تعلقات سے متعلق ہیں ۔ ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے ۔

میں یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ یہ دونوں ازواج جو ہر لحاظ سے کامل تھیں ، انھوں نے اسی عریانی کے ساتھ اپنی پرائیوٹ باتوں کو ظاہر کر دیا ہو گا جو ان کے اور محمد رسول اللہؐ کے درمیان میاں بیوی کی صورت میں ہوئی ہوں گی ۔"

یہ درست ہے کہ بعض احادیث میں بعض بیانات عریاں طور پر مذکور ہوئے ہیں ۔ اس سے پہلے عیسائی اور سماجی حضرات نے ان پر اعتراض کیا ہے اور ان سے سن کر ہمارے بعض شیعہ اور اہل قرآن دوست بھی ان احادیث کو اپنی تنقید کا ہدف بناتے رہے ہیں مگر ان حضرات کے انداز گفتگو سے طبیعت کو نہ تعجب ہوا نہ

پریشانی اس لئے کہ ان حضرات کا اندازِ فکر معلوم ہے لیکن جسٹس محمد شفیع صاحب نے جس کرسی سے بات کی ہے وہاں کی عقل و دانش کے متعلق ملک کے اربابِ فکر کو اعتماد ہے۔ یہاں اتنی سادہ بلکہ مہمل تنقید کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔

گفتگو میں عریانی اخلاقاً معیوب ہے اور میاں بیوی کے مخصوص تعلقات کا بلا وجہ تذکرہ شرعًا ویسے بھی ناجائز ہے لیکن جب ضرورت داعی ہو تو پھر اس عریانی کا تذکرہ صرف جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے۔

محترم جسٹس محمد شفیع صاحب نے کبھی زنا بالجبر اور نامردی کے کیس سنے ہوں گے جہاں ایک طرف زنا بالجبر کی سنگین سزا کا خطرہ ہے تو دوسری طرف پردہ داری کا اخلاقی تقاضا مگر یہاں عریانی کا اخلاقی تقاضا قطعاً تفتیش کی راہ میں حائل نہیں ہوگا۔

اسی طرح جب عورت خاوند کے متعلق شکایات کرے کہ یہ جنسی ضرورت پر قادر نہیں۔ ایک طرف اس تعلق کے ہمیشہ کے لئے انقطاع کا مطالبہ ہے اور دوسری طرف اخلاق کا تقاضا کہ میاں بیوی کے معاملات عریاں نہ ہوں فرمائیے آپ کسے ترجیح دیں گے؟ اگر خاوند استغاثہ کی صحت کا انکار کردے تو شاید اس عریانی کی ڈاکٹری معائنہ تک نوبت پہنچے گی تب یہ شرعًا و اخلاقاً ہر طرح جائز اور درست ہوگا۔

بالکل یہی حال درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کا ہے۔ حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ نے یہ تذکرہ کسی عوامی تقریر میں نہیں فرمایا بلکہ بعض بچے اپنی اماں سے بعض مسائل دریافت کر رہے ہیں اور چونکہ وہ سنت کو شرعی حجت سمجھتے ہیں اس لئے چاہتے ہیں کہ مسئلہ آنحضرت کے قول یا فعل یا تقریر سے حل ہو۔ اب یہاں دو تقاضے ہیں۔

ایک علم اور فہم کا تقاضا ہے۔

دوسرا اخلاق اور پردہ داری کا۔

اگر یہاں ان رسمی اخلاقی اقدار کا احترام کیا جائے تو نہ مسئلہ سمجھ میں آئے گا اور نہ طالب اور سائل کی تسکین ہو گی۔

درس تدریس یا مقدمات کو بھی جانے دیجئے۔ بعض خانگی نزاعوں میں اس قسم کے تذکرے بعض اوقات ضرورت کے وقت اس سے زیادہ عریاں طریق سے سامنے آتے ہیں وہاں اس کے سوا چارہ بھی نہیں ہوتا اور وہ نزاع رفع نہیں ہو سکتی جب تک کھرطی سی عریانی استعمال نہ کی جائے۔

مساجد میں بعض اوقات لوگ طہارت کے مسائل دریافت کرنے آتے ہیں۔ تو مسئلہ سمجھنے کے لئے عورتیں بھی مفتی کے سامنے کسی قدر عریانی کے لئے مجبور ہو جاتی ہیں

ان تصریحات کے بعد ہم یہ گذارش کریں گے کہ ایک ہائی کورٹ کا جج اگر اسی عامیانہ انداز سے سوچنے لگے تو صرف ہائی کورٹ کا وقار ختم ہو جائے گا بلکہ ماتحت عدالتیں آپ کے اس طرح کے محاکمات سے تنگ آجائیں گی۔ ماتحت عدالتیں تفتیش کے بعد بعض فیصلے کریں گی مگر آپ پورے ناز سے فرمائیں گے کہ:۔

میں باور نہیں کر سکتا کہ کسی عورت کا عدالتی بیان اتنا عریاں ہو سکتا ہے۔

قرآن عزیز میں عریانی بعض واجبی ضرورتوں کے پیش نظر قرآن عزیز نے بھی خاصا عریاں انداز بیان اختیار فرمایا ہے۔ مثلاً۔

علماء یہود کی تہمت طرازی اور نصاریٰ کے غلو نے ایسی صورت پیدا کر دی تھی کہ حضرت مسیح کے مقام کو اس طرح نکھارا جائے کہ دونوں فریق اپنے اپنے موقف پر نظر ثانی کریں۔ معاملہ اس قدر چھان پھٹک دیا جائے کہ ہر فریق کو اپنی غلطی کا احساس ہو اور یہ عریانی کے سوا مشکل تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُوحِنَا (۶۶/۱۲) وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُوحِنَا (۲۱/۵۱)

"عمران کی بیٹی مریم نے شرمگاہ کو پاک رکھا اور ہم نے اس میں اپنی طرف سے روح پھونک دی"

سورۂ تحریم میں ضمیر مذکر کا مرجع لفظ فرج ہے اور سورۂ انبیاء میں حضرت مریم صدیقہ۔

اس عریانی کی ضرورت تھی۔ اس عریانی کے بغیر نہ یہود اپنی ہٹ سے باز آتے نہ عیسائی اپنا غلو ترک کرتے۔ مصلحت کا تقاضا تھا کہ بات ذرا عریاں ہو جائے۔ جسٹس شفیع صاحب تو فرمائیں گے، میں باور نہیں کر سکتا کہ خدا تعالیٰ نے ایک پاک باز اور مقدس عورت کے متعلق اس قدر عریاں الفاظ استعمال فرمائے ہوں لیکن ان کے سوا چارہ نہ تھا۔

پھر یہی تذکرہ سورۂ مریم میں ملاحظہ فرمائیے۔

اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَکُ بَغِیًّا ۱۶/۲۰

اسی طرح ۳/۴۷ میں حضرت مریمؑ نے بچے کی پیدائش کے متعلق جو معذرت کا طریق اختیار فرمایا ہے کافی عریاں ہے آپ اسے باور فرمائیں یا نہ فرمائیں۔ حالات کا تقاضا یہی تھا کہ برارت کے لئے عریاں لفظ استعمال ہوں۔ ان عورتوں کا ذکر فرماتے ہوئے جن سے نکاح حرام ہے فرمایا:-

وَرَبَآئِبُکُمُ اللّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ مِّنْ نِّسَآئِکُمُ اللّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَکُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ (۴/۲۳)

ربیبہ کے نکاح کی حرمت کے ذکر میں اس کی والدہ کے متعلق جس شرط کا ذکر فرمایا ہے وہ ازدواجی تعلق کی آخری صورت ہے۔ امید ہے آپ باور فرمائیں گے کہ اس میں کافی عریانی ہے لیکن اس عریانی کے سوا چارہ نہیں۔

نِسَآؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ فَاْتُوْا حَرْثَکُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ (۲/۲۲۳)

"تمھاری عورتیں کھیتی ہیں تم اپنی کھیتی کے پاس جہاں سے چاہو آؤ"

اس میں کچھ عریانی محسوس ہوتی ہے۔

اَلَمْ یَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰى (۳۷/۷۵) وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى (۵۳/۴۶) اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ (۵۶/۵۸)

یمنیٰ ، تمنیٰ اور ماتمنون میں جس حقیقت کا اظہار فرمایا گیا ہے اس میں بڑی عریانی ہے لیکن نعمت تخلیق کے اظہار کے لئے یہ عریانی موزوں ترین راہ ہے ۔ اس لئے شرم و حیا کے کتنے ہی عاشق کیوں نہ ہوں ایسے مواقع پر یہ عریاں انداز باور کرنا ہی پڑے گا ۔

اس قسم کی عریانی قرآن عزیز نے کئی جگہ اختیار فرمائی ہے ۔ زندگی کے مختلف مراحل میں ہر آدمی کو عریانی سے کم و بیش سابقہ ہوتا ہے ۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے ۔ آپ حضرات کی نزاکت گفتگو میں اس انشراح کو پسند نہیں کرتی حالانکہ عملاً ننگا ہونا شرعاً ، اخلاقاً ، عرفاً جرم ہے لیکن بعض مواقع پر عملی عریانی کی کھلی اجازت مرحمت فرمائی ہے ۔ یہ ضرورت کا تقاضا ہے ۔

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۔ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ (۳/۲۳)

اہل ایمان اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر بیویوں اور لونڈیوں کے ساتھ عریانی کی اجازت ہے ۔ آپ باور فرمائیں یا نہ فرمائیں قرآن نے یہاں ضرورتاً بالکل ننگا ہونے کی اجازت فرمائی ہے اور اس عریانی کو انسان فطرتاً پسند کرتا ہے اور ضرورتاً بھی ۔

اصل مصیبت

اصل مصیبت یہ ہے کہ آپ مذہب کو زندگی اور اس کے تمام گوشوں پر محیط نہیں سمجھتے ۔ آپ اسے ہر انسان کا پرائیوٹ معاملہ سمجھتے ہیں اور اس کے عمومی مصالح کو خصوصی اور شخصی اختلاف

کے پیمانوں سے ناپتے ہیں۔ معلوم ہے کہ پوری انسانیت کے پیمانے، شخصی اور افراد کے پیمانوں سے مختلف ہیں۔ اسی طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داریوں کو آپ زیادہ سے زیادہ ایک چیف جسٹس کی ذمہ داریوں کے برابر تصور کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کے لئے ان مصالح کو باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے جو ایک پیغمبر اور پھر خاتم النبیین کے پیش نظر ہوتے ہیں جن کی نبوت پوری دنیا کے لئے اور قیامت تک کے لئے ہے پھر صحابہ کے ذہنی کوائف اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل اور آپ کی سنت کے ساتھ ان کا تعلق تقریباً اتنا ہی سمجھتے ہیں جس قدر خود آپ کی ذہنی کیفیت ہے اور آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آنحضرتؐ اپنے وقت کے ایک اچھے انسان تھے۔ نتیجۃً آنحضرتؐ کو بھی آپ اس معیار پر پرکھتے ہیں جس پر آپ اپنے خیال سے ایک اچھے آدمی کو پرکھ سکتے ہیں لیکن مسلمان آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ہر معاملہ میں واجب الاتباع انسان سمجھتے ہیں۔ اس لئے آپ کے اور صحابہؓ اور عامۃ المسلمین کے معیار میں بڑا فرق ہے منکرین حدیث اور آج کے یورپ زدہ لوگوں کے ذہن اور ایک سچے مسلمان یا صحابہؓ کے ذہن میں یہی فرق ہے۔ آپ اپنی اور اپنے عیال واطفال کی ذمہ داری سے قاصر ہیں۔ جب کہ وہ ساری دنیا کی ذمہ داری پوری کامیابی سے اپنے ذمہ لئے ہوئے ہیں اور اسے انھوں نے صحیح طور پر پورا کیا ہے۔

احادیث کی کثرت ائمہ حدیث اپنے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے اور اپنی کتابوں کے طریقہ انتخاب اور شرائط صحت کو بیان کرتے وقت عموماً لاکھوں احادیث کا ذکر فرماتے ہیں۔ مثلاً

امام بخاریؒ نے صحیح بخاری کا انتخاب سات لاکھ (۷۰۰۰۰۰) احادیث سے فرمایا۔

امام احمدؒ نے مسند کا انتخاب تین لاکھ احادیث سے کیا۔

مسلم کا انتخاب تین لاکھ احادیث سے کیا گیا۔
ابوزرعہؒ کو سات لاکھ احادیث یاد تھیں۔
اس قسم کی تصریحات سے عوام پر دو اثر پڑتے ہیں۔
اوّل یہ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی عمرِ نبوت کے بعد قریب قریب تیئس (۲۳) یا پچیس (۲۵) سال ہے۔ اس مختصر عرصہ میں ممکن نہیں کہ آنحضرتؐ اس قدر گفتگو فرما سکیں۔ اس لئے یہ مقدار قابلِ اعتماد اور صحیح احادیث کی نہیں ہوسکتی۔
دوم:۔ یہ کہ تدوین شدہ کتب میں احادیث کی تعداد بمشکل ہزار دس تک پہنچتی ہے اس لئے اس تعداد کے علاوہ باقی سب موضوعات ہیں بخاری میں مع مکررات تقریباً سات ہزار احادیث ہیں لیکن مکررات کے علاوہ احادیث کی تعداد قریب قریب چار ہزار ہے۔ اسی طرح مسلم نے اپنی صحیح کو کئی لاکھ احادیث سے انتخاب فرمایا۔
اس فن سے بے خبر شخص یہ سمجھتا ہے کہ ان ائمہ نے جو احادیث ترک کی ہیں اور ان کتابوں میں ان کا ذکر نہیں آیا وہ سب غلط ہیں اور موضوع۔ تقریباً اسی قسم کے خیالات کا اظہار جسٹس محمد شفیع صاحب نے اپنے اس فیصلہ میں فرمایا ہے جو انھوں نے حضانت کے متعلق کیا۔ (بحوالہ منصب رسالت نمبر ص۲۶۶)
یہ دونوں شبہات قلت مطالعہ اور لاعلمی پر مبنی ہیں۔ محدثین علی الاطلاق احادیث کی تعداد کا ذکر کرتے ہیں تو اس وقت وہ حدیث کو عام معنی میں لیتے ہیں یعنی مرفوع، موقوف، آثار، تعداد اسانید اور احادیث کے متعدد طرق حتے کہ محدثین کی تفاسیر میں ائمہ سلف سے الفاظ کے مفہوم میں جو مختلف اقوال منقول ہیں ان کو بھی وہ حدیث ہی تعبیر فرماتے ہیں بلکہ صرف ضعاف اور موضوعات پر حدیث کا لفظ تو بولا ہی جاتا ہے۔ اس عام معنیٰ کی رو سے حدیث کی تعداد واقعی لاکھوں تک جا پہنچتی ہے لیکن موضوعات کو الگ کیا جائے اور تکرار اسانید

کو بھی نظر انداز کیا جائے تو احادیث کی صحیح تعداد پچاس ہزار بھی نہیں ہو پاتی۔
سیوطیؒ فرماتے ہیں۔

قال العراقی فی ھذا الکلام نظر لقول البخاری احفظ مائۃ الف حدیث صحیح وما ئتی الف حدیث غیر الصحیح قال ولعل البخاری اراد بالاحادیث المکررۃ الاسانید والموقوفات فربما عد الحدیث المروی باسنادین حدیثین اھ (تدریب الراوی ص۲۹)

یعنی "امام بخاری جب لاکھوں احادیث کا ذکر فرماتے ہیں تو ان کی مراد مکرر اسانید اور موقوفات صحابہ اور ان کے فتاویٰ وغیرہ سب ہوتے ہیں تکرار سند سے جب ایک متن بار بار مروی ہو تو اسے وہ متعدد احادیث تصور فرماتے ہیں"
اس کے بعد فرماتے ہیں:۔

قیل ویؤید ان ھذا ھو المراد ان الاحادیث الصحاح التی بین اظھرنا بل وغیر الصحاح لو تتبعت من المسانید والجوامع والسنن والاجزاء وغیرھا لما بلغت مائۃ الف بلا تکرار بل ولا خمسین الفاً ص۲۹

یعنی "اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ جو احادیث اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں انھیں مسانید سنن اجزاء جوامع وغیرہ میں اگر پوری طرح تلاش کیا جائے تو ان کی تعداد صحیح اور غیر صحیح ملا کر بھی پچاس ہزار تک نہیں پہنچتی" (ص۵۱)

ایک اور شبہ کا حل

یہ شبہ کہ محدثین کے مخصوص شرائط کے ماتحت باقی جو کچھ بچا وہ سب غلط ہے یہ بھی لاعلمی اور جہالت کی کرشمہ سازی ہے۔ امام بخاریؒ خود فرماتے ہیں:۔

ما ترکت من الصحاح اکثر (تدریب ص۲۹)

"صحیح بخاری سے جو روایات متروک اور نظر انداز ہوئی ہیں وہ بہت زیادہ ہیں۔
صحیح بخاری یا صحیح مسلم کا انتخاب مخصوص شرائط کے ماتحت ہوا ہے اس کا

مطلب یہ تو تمام صحیح احادیث کا استیعاب ہے اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انکے سوا باقی سب احادیث غلط ہیں بلکہ ائمہ حدیث تصنیف و تدوینِ کتب کے وقت بعض شرائط ذہن میں رکھتے تھے۔ان شرائط کے تحت جو صحیح احادیث ان کے معیار پر ان کی نظر میں پوری اتریں انھیں وہاں جمع کر دیا یہ بھی ممکن ہے کہ ان شرائط کے مطابق بھی کہیں ذہول ہو گیا ہو۔مثلاً امام مسلمؒ نے صحیح میں اپنی شرط یہ بتائی ہے۔

انما وضعت ھھنا ما اجمعوا علیہ

"میں نے صحیح مسلم میں وہ احادیث درج کی ہیں جن پر بلحاظ صحت ائمہ حدیث کا اجماع ہوگا"

لیکن معلوم ہے کہ کئی مقامات پر یہ شرط قائم نہیں رہ سکی اور وہ ایسی حدیث بھی ذکر فرما گئے ہیں جن پر ائمہ حدیث کا بلحاظ صحت اجماع نہیں۔امام بخاری فرماتے ہیں

احفظ مائۃ الف حدیث صحیح و مائتی الف غیر الصحیح۔

(تدریب ص۲۹)

"مجھے ایک لاکھ صحیح حدیثیں یاد ہیں اور دو لاکھ غیر صحیح"، حالانکہ صحیح بخاری میں تقریباً چار ہزار حدیثیں ہیں اس لئے یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ صحیح بخاری کے علاوہ امام بخاریؒ کے نزدیک تمام احادیث غلط اور غیر صحیح ہیں۔یہ کہا جا سکتا ہے کہ انکی شرط کے مطابق نہیں۔

مستدرک حاکم، صحیح ابن حبان، صحیح ابن خزیمہ یہ سب کتابیں بشرطِ صحت تدوین و تصنیف کی صورت میں آئیں۔ان پر بعض اعتراضات کے باوجود کافی ذخیرہ محدثین کے نزدیک صحیح ہے۔البتہ اصول خمسہ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی میں صحاح کا کافی ذخیرہ آگیا ہے لیکن استیعاب کا دعویٰ یہاں بھی نہیں کیا جا سکتا۔ان کے علاوہ حدیث کی کتابوں میں بھی صحیح احادیث کا ذخیرہ موجود ہے

البتہ بعض جگہ کچھ ایسی مشکلات سامنے آگئیں کہ وہاں صحیح اور ضعیف میں امتیاز

کرنا کافی دقت طلب ہو گیا۔ طبرانی، سیوطی، ہیثمی کی کتابوں میں جو ذخیرہ پایا گیا ہے اس میں چھان پھٹک کے لئے ماہرین فن کی ضرورت ہے۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ میں محدثین اور کتب حدیث کے طبقات کی تقسیم اس طریقے سے فرمائی ہے کہ اگر حدیث کا طالب علم انھیں غور سے پڑھے تو اسے بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے (حجۃ اللہ البالغہ ص۱۰۵ جلد ۱)

ہمارے دور کے منکرین حدیث کی حیثیت فن حدیث کی اہمیت کے لحاظ سے ایک ایسے شخص کی طرح ہے جو ایک مضبوط مکان کو نقب لگانا چاہتا ہے لیکن وہ مکان کے نہ اندرونی نقشہ سے واقف ہے نہ ہی وہ اس کی پیچ در پیچ راہوں سے آشنا ہے اس لئے وہ کبھی آتے گرفتار ہوتا ہے کبھی جاتے ہوئے۔ تاہم ان کے اس حوصلہ کی داد دینی چاہیئے کہ پے در پے ناکامیوں کے باوجود انھوں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ گو اس راہ میں ناکامی کے ساتھ ندامت بھی ہمیشہ دامن گیر رہی۔

ایک غیر معقول بات

جسٹس محمد شفیع فرماتے ہیں

"پس یہ امر بالکل واضح ہے کہ قرآن کا پڑھنا اور سمجھنا ایک دو آدمیوں کا مخصوص حق نہیں۔ قرآن سادہ اور آسان زبان میں ہے اسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا حق ہے جو ہر مسلمان کو دیا گیا ہے اور کوئی شخص خواہ کتنا ہی فاضل یا عالی مقام کیوں نہ ہو وہ مسلمان سے قرآن پڑھنے اور سمجھنے کا حق نہیں چھین سکتا۔

(بحوالہ منصب رسالت نمبر ص۲۴)

پھر فرماتے ہیں:-

"اس دنیا میں چونکہ انسانی حالات اور مسائل بدلتے رہتے ہیں، اسی لئے اس بدلتی ہوئی دنیا کے اندر مستقل ناقابل تغیر و تبدیل احکام و قوانین نہیں چل سکتے۔ قرآن مجید بھی اس عام قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہے" (حوالہ مذکور)

ظاہر ہے یہ ارشادات اتنے اونچے مقام سے ہو رہے ہیں جہاں معقولیت اور دانش مندی کے سوا کوئی امید نہیں رکھی جاسکتی لیکن اگر قرآن کی تفسیر اور تشریح کا حق ہر آدمی کو دے دیا جائے اور اس کے لئے کوئی معیارِ علم نہ رکھا جائے تو کیا قانون کے متعلق بھی اسی کشادہ دلی سے اجازت دی جائے گی چونکہ قانون کا تعلق عامۃ الناس سے ہے اس لئے قانون کے فہم اور توجیہ کا حق چند قانون دانوں کو نہیں دیا جاسکتا جیسے اس کے لئے معقول وجہ نہیں کہ چند بوریا نشین یا ائمہ مساجد قرآن فہمی اور تفسیر کے حق پر قابض ہو جائیں اسی طرح کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ چند وکیل یا جج قانون فہمی کے حق پر قابض ہو جائیں۔

اگر قانون کے تحفظ کے لئے کوئی دلیل مل گئی تو امید ہے بلکہ یقین ہے وہ دلیل قرآن و سنت کی تشریح کے لئے بھی کارآمد ثابت ہوگی، اسی طرح اگر یہ صحیح مان لیا جائے کہ بدلتے ہوئے حالات میں مستقل قانون قبول نہیں کیا جاسکتا اس لئے قرآن کو بھی کسی وقت آپ کے سامنے سربسجود ہونا ہوگا۔ تو پھر یہ فرمایا جائے کہ وحیِ الٰہی اور خدا کے علم کے التواء اور ذاتِ حق کی ہمہ دانی کا مطلب کیا رہا؟ انسانی قوانین اور الٰہی قوانین میں مابہ الامتیاز کیا ٹھہرا؟ اس پر اس کے سوا ہم کیا عرض کر سکتے ہیں کہ:۔

ایاز! قدرِ خویش بشناس۔

منکرینِ سنّت اور معترض "مفکرین" سے

منکرین سنت اور حدیث پر اعتراض کرنے والے حضرات سے گذارش ہے کہ فنِ حدیث کی حیثیت اتھاہ سمندر کی ہے۔ امت نے تقریباً تیرہ سو سال اس کی خدمت کی ہے اور مختلف راہوں سے کی ہے۔ ابن صلاح کی علوم الحدیث اور حاکم کی معرفت علوم الحدیث پر نظر ڈالئے۔ آپ کو اس فن کی خدمت میں تنوع نظر آئے گا اور حافظ بغدادی کی الکفایہ میں بھی علوم حدیث کا کافی مواد ہے۔

ان متنوع خدماتِ حدیث کا نتیجہ یہ ہے کہ صدیوں کی عقیدت مندانہ خدمات اس کی پشت پر ہیں۔ اس بلندی سے اسے نیچے لانے کے لئے فنی قابلیت ضروری ہے اس کی باریکیوں اور نزاکتوں پر نظر رکھے بغیر تنقید کرنا خفت کا موجب ہو گا۔

آپ حضرات نے یہ شیوہ بنا رکھا ہے کہ ساری عمر انگریزی قانون اور انگریزی زبان پڑھتے ہیں پھر ملازمت کرتے ہیں، پھر ریٹائر ہوتے ہیں اور یہ آخری فرصت کی گھڑیاں جو آپ کو عبادت کے لئے قدرت نے عطا کی ہیں ان کو سنت پر اعتراض اور بحث کرنے میں صرف کرتے ہیں اور اہل فن کی نظر میں مضحکہ بنتے ہیں۔

یا پھر اونچی کرسیوں سے اس شریف فن پر حملہ آور ہوتے ہیں حالانکہ آپ ایک خاص قانون کے ماہر ہیں علوم الحدیث سے واقف نہیں۔ کرسی کی آڑ میں یہ شکار مناسب نہیں۔

آپ اپنے مقام سے نیچے آئیے اور اہل فن کے ساتھ بیٹھ کر اس کی مشکلات اور اس کے آداب ولوازم اور پھر اس کے نتائج پر غور فرمائیے، پھر اگر آپ کا ضمیر مطمئن نہ ہو تو شرح صدر سے تنقید فرمائیے۔

بلاتی ہیں موجیں کہ طوفاں میں اترو
کہاں تک چلو گے کنارے کنارے

ہمیں یقین ہے کہ اس فن کے آداب ولوازم کو جاننے کے بعد آپ نہ صرف یہ کہ اعتراض کے قابل نہیں رہیں گے بلکہ ان بوریا نشینوں کی صفوں میں ایک مناسب اضافہ ہوگا اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو آپ کے اعتراض معقول ہوں گے۔ ان میں کچھ وزن ہوگا اور سامعین کو کچھ فائدہ بھی پہنچے گا ؛

پہلا مقالہ تمام ہوا۔

۲
دوسرا مقالہ
جماعت اسلامی
کا
نظریۂ حدیث

جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث

ایک تنقیدی جائزہ

الحمد للہ وکفی وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔

عرصہ ہوا مولانا مودودی صاحب نے ایک مضمون "مسلک اعتدال" کے عنوان سے لکھا جس پر عامۃ المسلمین میں مولانا اور ان کی جماعت کے متعلق کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور یہ قصہ اخبارات میں کافی دیر تک چلتا رہا کہ حجیت حدیث اور سنت رسول پر اعتماد کے متعلق جماعت اسلامی کا موقف کیا ہے؟ بحث و نظر کا یہ سلسلہ ابھی تھمنے نہیں پایا تھا کہ مولانا مودودی نے جیل سے تشریف لاتے ہی مختلف مقامات پر چند تقریریں فرما دیں۔ نیت کا علم تو اللہ کو ہے۔ مگر ان تقاریر سے فضا میں تموج اور تیزی سی آگئی۔ جماعت اسلامی کے جرائد نے اپنی قیادت کی حمایت میں جرأت اور تہوّر سے کام لے کر خاصی گرمی پیدا کر دی۔ غالباً ان حالات سے متاثر ہو کر کسی اہل حدیث نے کچھ سوالات کئے جن کا جواب مولانا اصلاحی کے قلم سے اکتوبر ۵۵ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا۔ مولانا اصلاحی کے لب و لہجہ میں ممکن ہے کچھ فرق ہو، مقصد کے لحاظ سے مولانا اصلاحی کے نظریات مولانا مودودی سے چنداں مختلف نہیں۔ حدیث کے متعلق دونوں بزرگ قریباً ایک ہی طرح سے سوچتے ہیں۔

جماعت اہلحدیث کے احساسات کا ایک خاص مقام ہے اور قریباً ایک صدی سے جس نہج پر ان حضرات نے فن حدیث اور سنت کی خدمت کی ہے اس کا یہ لازمی نتیجہ ہے جماعت اسلامی کا طریق فکر اس سے مختلف ہے اس لئے اہلحدیث کا اس سے ناگوار تأثر

بالکل قدرتی تھا اور ایک گونہ تصادم اس کا طبعی نتیجہ۔ ان جوابات سے اس اہلحدیث سائل کی کہاں تک تسکین ہوئی؟ اس کا علم نہیں ہو سکا لیکن میرے تاثرات یہ ہیں کہ ان جوابات سے نہ کوئی اہلحدیث مطمئن ہو سکتا ہے نہ عامۃ المسلمین، بلکہ خود مجیب بھی شاید مطمئن نہ ہوں۔

ذہنی انتشار

"مسلک اعتدال" قریباً تیرہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ پورا مضمون پڑھ لینے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف علاّم جو کچھ لکھ رہے ہیں اس پر خود بھی مطمئن نہیں۔ پورے مضمون میں ذہنی انتشار نمایاں ہے۔ اس مضمون کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا حصہ پہلے حصہ میں مولنا منکرینِ حدیث سے اتفاق فرماتے ہیں کہ "احادیث ظنی تو ہیں اور ظنی چیز ثابت[1] شدہ نہیں ہوتی لیکن کسی چیز کا ثابت

---

[1] معلوم نہیں مولانا کس زبان میں گفتگو فرما رہے ہیں؟ شرعی اصطلاح تو یہی ہے کہ غیر ثابت شدہ مسائل کو رد کر دیا جائے۔ پھر یہ ارشاد کہ "ظنی چیز ثابت شدہ نہیں ہوتی"، اگر ظن بمعنی وہم ہے تو ارشادات درست ہے لیکن قرآن حکیم نے ظن کو وہم کے مرادف صرف اس وقت فرمایا جب وہ حق کے مقابل ہو اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا۔ قرآن میں ظن حقیقتِ ثابتہ کے معنی میں استعمال ہوا:-

وَاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا۔ (جن)	یہ قطعی حقیقت ہے کہ ہم زمین میں نہ خدا تعالیٰ کو عاجز کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی بارگاہ سے بھاگ سکتے ہیں۔
اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ	انھیں یقین ہے کہ وہ اللہ سے ملیں گے؛

شدہ نہ ہونا یہ کب معنی رکھتا ہے کہ وہ ردّ ہی کر دینے کے قابل ہو" (تفہیمات ص۳۱۲)

وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ۔	اسے یقین ہوتا ہے کہ اب جدائی کا وقت ہے۔
اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ	کیا انھیں یقین نہیں کہ وہ اٹھائے جائیں گے ان
وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ	کو یقین ہو گیا کہ وہ اس پر قادر ہیں۔

راغبؒ نے ظن کے متعلق ایک قاعدہ ذکر فرمایا ہے :۔

الظن اسم لما یحصل عن امارۃ و	ظن اس (علم) کا نام ہے جو علامات اور قرائن
متی قویت ادت الی العلم و متی	سے حاصل ہو۔ جب یہ قرائن پختہ ہوں تو ان سے
ضعفت جدا لم یتجاوز حد التوھم	علم و یقین حاصل ہوتا ہے، کمزور ہوں تو وہم
و متی قوی او تصور تصور القوی	سے کم نہیں، جب یہ قرائن قوی ہوں یا ان کے
استعمل معہ ان المشددۃ	قوی ہونے کا خیال ہو تو ان کے ساتھ اَنَّ مشددہ
وان المخففۃ الخ	اور مخففہ استعمال ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ظن کو علی الاطلاق غیر ثابت شدہ کہنا قطعاً غلط ہے اور اس نظریہ پر جو نتائج مرتب ہوں گے وہ بھی غلط ہی ہوں گے۔ اصل حکم ان امارت اور قرائن پر ہو گا جن سے ظن حاصل ہوا ائمہ حدیث کی اصطلاح میں 'ظن'، علم کے ایک خاص مرتبہ کا نام ہے۔ متواتر سے بدیہی علم حاصل ہوتا ہے۔ آحاد میں جب قرائنِ صدق موجود ہوں اور ان قرائن کے قوت و ضعف کے پیش نظر جو علم حاصل ہو اسے وہ ظن سے تعبیر کرتے ہیں۔ ائمہ نے اس علم کے متعلق فرمایا کہ یہ موجب عمل ہے پھر جن ائمہ نے تواتر میں عدد کے علاوہ اوصافِ رواۃ کو بھی ملحوظ رکھا ہے یا جن روایات کو تلقی بالقبول کا مقام حاصل ہو ان سے علم نظری کا حاصل ہونا بھی مسلّم ہے گویا یہ ایسا ظن ہے جس سے علم نظری حاصل ہو سکتا ہے۔ مولانا غور فرمائیں آیا غیر ثابت شدہ چیز موجبِ عمل ہو سکتی ہے یا اس سے علم نظری حاصل ہو سکتا ہے؟ ــــــ عام اہلِ قرآن ظن کو وہم کے مرادف سمجھ کر اسے غیر ثابت شدہ تصور کرتے ہیں۔ مولانا نے ذہول یا مسامحت سے اسی غلط استعمال کی بنا پر

"اس لئے احادیث کو کلیۃً رد کر دینا درست نہیں"۔ ارشاد ہے "منظونات کو من حیث الکل قبول کر لینا جس درجہ کی غلطی ہے اسی درجہ کی غلطی من حیث الکل رد کر دینا بھی ہے" (تفہیمات ص ۳۱۴) مولانا کا مشورہ یہ ہے کہ منکرین حدیث کو پورے ذخیرہ کا انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ (میرا خیال ہے منکرین حدیث سے پرویز پارٹی شاید مولانا کی تجویز سے اتفاق کرلے) اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ "آحاد کو رد کرنے سے دین میں جامعیت نہیں رہے گی۔ قرآن سے اور متواتر احادیث سے اسلام کا مکمل نظامِ حیات نہیں مل سکتا، صرف اخبار آحاد ہی ہیں جو ہم تک ہدایات کا عظیم الشان ذخیرہ بہم پہنچاتی ہیں" (تفہیمات ص ۳۱۶)

یہ اندازِ بیان کتنا ہی معذرت خواہانہ کیوں نہ ہو مگر درست ہے۔ طریق ادا میں کتنی مسکنت اور کمزوری ہو مگر مجارات مع الخصم کے طریق پر مولانا نے جو فرمایا مناسب ہے۔ طریق ادا سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر جو فرمایا کافی حد تک صحیح ہے

دوسرا حصّہ دوسرے حصہ میں مولانا ائمہ حدیث اور ان کی خدمات کی تعریف فرماتے ہیں۔ حدیث کی حفاظت کے ذرائع کو بھی قرآن کی غیر معمولی حفاظت کے ذرائع کی طرح بے نظیر کہتے ہیں، اصول محدثین کی تعریف فرماتے ہیں لیکن اس پر بے اطمینانی کا اظہار فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

"وہ بہرحال تھے تو انسان ہی، انسانی علم کے لئے جو حدیں فطرۃً اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں ان کے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص

ہر ظن کو غیر ثابت شدہ فرما دیا اور جب اس کے نتائج پر نظر پڑی تو غیر ثابت شدہ کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ صلت علی الاسد و بلت عن النقد۔ ائمہ فن کی اصطلاح کے مطابق ظن علم کے اس مرتبہ کا نام ہے جو بداہت سے کم ہو، علم نظری اور اس کے جملہ مراتب اسمیں شامل ہیں۔ ان قرائن کی بناء پر محدثین نے قوۃ اور ضعف کے مراتب متعین فرمائے ہیں:

فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے " (تفہیمات ص۳۱۸)

اس کے بعد متبعین حدیث پر تنقید فرماتے ہیں کہ :-

" ان (محدثین) کی نگاہ میں احادیث کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا جو معیار ہے ٹھیک ٹھیک اسی معیار کی ہم (اہلحدیث) بھی پابندی کریں مثلاً مشہور کو شاذ پر، مرفوع کو مرسل پر اور مسلسل کو منقطع پر لازماً ترجیح دیں " (تفہیمات ص۳۱۸)

بالکل بجا، مگر سوال یہ ہے کہ تواتر کی صورت میں جو یقین کا سرمایہ موجود ہے وہ بھی تو آخر انسان ہی ہیں، ان کے لئے بھی فطری حدود متعین ہیں۔ اگر یہ تنقید درست ہے تو قرآن اور سنت متواترہ کے یقین کو بھی ظن ہی کے مرادف سمجھنا چاہئے۔ گویا انسان کی فطری حدود کے اندر یقین کا وجود ناپید ہے۔ مولانا کے ذاتی خیالات یقیناً یہ نہیں ہوں گے مگر ان کے استدلال کی انتہا یہی ہے۔ ائمہ حدیث اور ان کی مساعی اور فن حدیث کے متعلق مولانا نے جو کچھ ایک ہاتھ سے دیا تھا اسے دوسرے ہاتھ سے واپس لے لیا، بلکہ ان کے نزدیک انسانیت کی لغت میں یقین کا لفظ ایک بے معنی لفظ ہے۔

اصول حدیث کے متعلق اہل حدیث اور متبعین حدیث کی ترجمانی مولانا نے جس طرح فرمائی ہے وہ قطعاً غلط ہے۔ ائمہ حدیث اور متبعین حدیث نے کبھی یہ دعویٰ نہیں فرمایا کہ یہ اصولِ تنقید آخری ہیں، ان پر اضافہ ناممکن ہے، بلکہ ہماری نظر میں اصولِ حدیث ایک متحرک فن ہے، وہ بتدریج اس حد تک پہنچا جہاں وہ آج موجود ہے۔ اگر کسی معقول اصل کا اس میں اضافہ فرمایا جائے تو فن میں اس کی گنجائش ہے۔ البتہ یہ شکایت بجا ہے کہ آج تک اس میں اضافہ کی جو کوشش کی گئی اس کی بنیادیں ازبس کمزور رہیں اور اسے اصول کی حیثیت سے قبول کرنا سخت مشکل ہے، ان میں تعمیر کے بجائے تخریب ہے۔ آپ نے اور آپ سے پہلے بھی بعض بزرگوں نے

"درایت" کا نام لیا مگر اس کی اساسی حیثیت کیا ہے؟ اس کا تذکرہ نہ ان حضرات نے کیا نہ آپ نے۔ بلکہ آپ خود بھی اس پر مطمئن نظر نہیں آتے۔

غرض حدیث اور فنِ حدیث کی مولانا نے جس قدر حوصلہ افزائی کی از راہِ عنایت کی تھی اور پھر اس کی عمارت آپ ہی کے مبارک ہاتھوں سے پیوند خاک بھی ہو گئی اور جناب ہی کے قلم سے منکرین حدیث کا کیس مضبوط ہو گیا۔ وما ھی باول دارو کثرت

تیسرا حصہ اس حصہ میں مولانا نے فقہاء اسلام کی بہت تعریف فرمائی، ان کو حق دیا کہ محدثین کے اصول کا تقاضا جا ہے کچھ ہو مگر فقہاء کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ضعیف پر عمل کریں، مرسل کو ترجیح دیں، منقطع کو قبول کریں۔ مولانا یہاں قادیانی شاعری کا لبادہ زیب تن فرماتے ہیں۔ فقیہ کا تعارف اس انداز سے کراتے ہیں کہ:-

"اس کی روح روحِ محمدی میں گم ہو جاتی ہے۔ اسکی نظر بصیرت نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے، اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔" (تفہیمات ص۳۲۴)

پھر فرماتے ہیں:-

"اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا، وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اسناد پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے، اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے" الخ (ص۳۲۴)

فقہائے اسلام کے مقام کی رفعت میں کلام نہیں لیکن "مسلک اعتدال" کے آخری صفحات میں جو کچھ فرمایا گیا ہے قطعی بے دلیل ہے اور محض شاعری، معاملہ صرف طریق فکر کے اختلاف کا ہے، نہ کوئی ہیرا ہے نہ جوت، مگر یہ محل جو شاعرانہ پرواز سے

تعمیر ہوا تھا اسے بھی بالآخر پیوندِ خاک فرماتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:-

"یہ چیز چونکہ سراسر ذوقی ہے اور کسی ضابطہ کے تحت نہیں آتی، نہ آسکتی ہے اس لئے اس میں اختلاف کی گنجائش پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی" ....الخ (تفہیمات ص ۳۲۴)

پھر یہ ہیرے کی جوت کیسے ہوئی؟ یعنی فقہائے اسلام کا طریق فکر بھی ذوقی ہے کوئی اصول نہیں۔

اب کوئی بتلائے ان تیرہ صفحات میں مولانا نے ہمیں کیا دیا اور کونسی اعتدال کی راہ بتائی؟ منکرینِ حدیث دریافت کرتے ہیں کہ حضرت نے اس قدر ملامت کے بعد ہمیں کیا عنایت فرمایا؟ آپ اور ہم میں نقطۂ امتیاز کیا ہے۔

مولانا اصلاحی صاحب

مولانا اصلاحی مستند اور پختہ کار عالم ہیں۔ مولانا فراہیؒ ایسے صاحبِ فکر سے انھوں نے استفادہ فرمایا ہے۔ آپ نے اپنے ارشادات میں قریبًا وہی سب کچھ فرمایا ہے جو مسلک اعتدال میں کہا گیا ہے۔ مگر ذہن اور خیالات کی پراگندگی کو الفاظ کی سطح پر نمایاں نہیں ہونے دیا۔ لیکن فضا کی گرمی اور اخبارات کی تیز تنقیدات سے ذہن متأثر ہے۔ بعض مقامات پر لہجہ خاصا تند ہو گیا ہے۔ طبعی متانت اور فطری سنجیدگی کے باوجود مولانا بعض ایسی چیزیں فرما گئے کہ اگر نہ فرماتے تو بہتر ہوتا، ایک متین آدمی کے لئے اس قدر نیچے آجانا کوئی اچھی مثال نہیں۔

ایک ضروری وضاحت زیرِ قلم گذارشات سے مقصد کچھ اپنے مسلک کی وضاحت ہے اور کچھ ان بزرگوں کے ارشادات اور ان کے مضر اثرات کی نشاندہی، تاکہ یہ ظاہر ہو سکے کہ حدیث اور سنت کی حمایت میں وہ راہ صحیح ہے جسے جماعت اسلامی کی قیادت نے اختیار فرمایا، یا وہ مسلک درست ہے

جس کی نشاندہی ائمہ حدیث اور سلف امت نے فرمائی ہے نیز اسلام کی وسعت اور ہمہ گیری ان حضرات کے طریق فکر سے ظاہر ہوتی ہے یا اہل حدیث کے طریق فکر سے، جن مقاصد کی تحصیل اور تکمیل آپ حضرات برسوں سے فرما رہے ہیں اس کی کفالت اہلِ حدیث کا مسلک کر سکتا ہے یا آپ کے یہ محتاط اور منقبض خیالات۔

جہاں تک مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی کی ذات کا تعلق ہے یا ان کی اصلاحی مساعی کا۔ میرے دل میں ان کے لئے پورا احترام ہے۔ گذشتہ ایام میں بعض اخباری اندازِ تحریر سے فضا میں جو تمازت پیدا ہو گئی تھی میں طبعًا اسے ناپسند کرتا ہوں۔ دین پسند جماعتوں کے تخاطب میں یہ ترشی کبھی نہیں آنی چاہئے اور موجودہ ظروف و احوال تو اس کے لئے قطعاً ناسازگار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دین پسند جماعتیں جس قدر بھی باہم دست و گریباں ہوں گی باطل کو اسی قدر فائدہ پہنچے گا۔

"مسلک اعتدال" اور مولانا اصلاحی کے ارشادات پر کئی وجوہ سے گفتگو کی جا سکتی ہے لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ زیرِ قلم گذارشات حدیث اور اس کے متعلقات تک محدود رہیں تاکہ اس موضوع پر ہم ایک دوسرے کو قریب سے سمجھ سکیں۔

"مسلک اعتدال" آج سے کئی سال پہلے بھی پڑھا تھا۔ اب پھر پڑھا ہے اس میں نہ کوئی علمی اور فنی خوبی ہے اور نہ کوئی اصلاحی نکتہ۔ مولانا اصلاحی نے کئی سال کے بعد اس کی نوک پلک کچھ درست فرمانے کی کوشش فرمائی ہے۔ قصورِ علم کے اعتراف کے ساتھ عرض ہے کہ اس میں بھی اطمینان کا کوئی سامان نہیں اور بعید مناسب ہوگا اگر یہ مقصد مضمون تفہیمات سے بالکل قلمزن کر دیا جائے۔

حدیث اور سنت

ائمہ حدیث اور فقہاء رحمہم اللہ نے حدیث اور سنت کو خاص معانی میں بھی

استعمال فرمایا ہے لیکن جہاں وہ اصول اور ادلہ کا ذکر فرماتے ہیں وہ انھیں ہم معنی اور مترادف سمجھتے ہیں۔ عنوان اور ابواب میں تو بعض اوقات "خبر" کا لفظ بھی استعمال فرماتے ہیں جو ان دونوں سے عام ہے مگر مقصد وہی ہوتا ہے جسے عرف عام میں سنت یا حدیث کہا جاتا ہے۔ منکرین حدیث اسی معنیٰ سے حدیث کا انکار کرتے ہیں اور سنت پر جرح اور اعتراض کرتے ہیں۔ اصولِ حدیث اور اصول فقہ کی مختصرات اور مطولات پر ایک نظر ڈالئے، وہ ان الفاظ کے مصطلع مفہوم میں نہ سکیڑ پیدا کرتے ہیں نہ اپنے موقف سے سرِ مو انحراف شکر اللہ مساعیھم۔ لیکن مولانا اصلاحی صاحب نے سنت کے مفہوم کو بالکل سکیڑ دیا ہے۔

سنت ائمہ سنت کی نظر میں

(۱) السنۃ وھی تطلق علی قول الرسول علیہ السلام وعلی فعلہ والحدیث مختص بقولہ (تلویح علی التوضیح ص۳۰ طبع نول کشور)

(۲) یطلق لفظ السنۃ علی ماجاء منقولا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قول او فعل او تقریر (اصول الفقہ للخضری ص۲۵۶)

(۳) السنۃ فی عرف المحدثین وجمھور اھل الشرع کل ما صدر عن الرسول صلی اللہ علیہ وسلم من قول او فعل او تقریر سواء صدر عنہ باعتبارہ رسولا ام باعتبارہ انسانا من البشر۔

(فقہ الاسلام حسن احمد خطیب ص۶۹)

(۴) (السنۃ) اما شرعا فھی قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم وفعلہ وتقریرہ (حصول المامول ص۲۲)

(۵) اما السنۃ فتطلق فی الاکثر علی ما اضیف الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من قول او فعل او تقریر فھی مرادفۃ للحدیث عند علماء الاصول (توجیہ النظر للجزائری ص۳)

(۶) اما السنة فهی لغة الطریقة واصطلاحا مرادفة للحدیث بالمعنی المتقدم الذی هو کل ما اضیف الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم
(لفظ الدرر ص۴)

(۷) والسنة ههنا ما صدر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم غیر القرآن من قول ویسمی الحدیث او فعل او تقریر۔
(القول المامول فی فن الاصول ص۴۷)

(۸) والسنة هی المرویة عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قولاً وفعلاً (رسالہ اصول لزین الدین الحلبی ۸۰۰ھ ص۱۶)

(۹) والسنة ما ورد عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم غیر القرآن او فعل او تقریر (قواعد الاصول لصفی الدین حنبلی ۷۸۴ء ص۹۱)

(۱۰) والسنة لغة العادة وشریعة مشترک بین ما صدر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم من قول او فعل او تقریر وبین ما واظب علیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلا وجوب (تعریفات للجرجانی ص۸۲)

(۱۱) والسنة لغة العادة وههنا ما صدر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیر القرآن من قول او فعل او تقریر کذا فی شرح المختصر ص۹۶ ج ۲ ۔ مسلم الثبوت)

(۱۲) السنة هی قول الرسول صلی اللہ علیہ وسلم او فعلہ۔
(منہاج للبیضاوی ۶۸۵ھ ص۶۱)

(۱۳) وانما اختار لفظ السنة دون لفظ الخبر کما ذکرہ غیرہ لان لفظ السنة شامل لقول الرسول وفعلہ علیہ السلام۔
(کتاب التحقیق شرح الحسامی ص۱۴۷)

(۱۴) السنة شرعا ما نقل عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

قولاً او فعلاً او اقراراً علی فعل (نزہت الخاطر العاطر ص۲۳۶ ج۱)

(۱۵) السنۃ تطلق علیٰ قول الرسول ﷺ وفعلہ وسکوتہ و علیٰ اقوال الصحابۃ وافعالھم الخ (نور الانوار ص۱۷۳)

(۱۶) السنن تنقسم ثلثۃ اقسام قول من النبی صلی اللہ علیہ وسلم وفعل منہ علیہ السلام اوشیء رآہ فعلمہ فاقر علیہ۔

(احکام لابن حزم ص ۶/۲)

(۱۷) یطلق لفظ السنۃ علیٰ ماجاء منقولا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی الخصوص مما لم ینص علیہ فی الکتاب العزیز۔

(موافقات ج ۴ ص ۳)

اس مفہوم کا ذکر اہل علم کے مصنفات میں بکثرت موجود ہے۔ ائمہ اسلام قرآن کے بعد سنت کو حجت شرعی سمجھتے ہیں اور سنت کا یہی مفہوم سمجھتے ہیں جو ان کے حوالوں میں مرقوم ہے۔ بعض تعریفات میں معمولی تغایر ہے۔ اس کا مفہوم اہل علم سمجھتے ہیں۔ ان تعریفات میں حدیث اور سنت کو ہم معنیٰ ظاہر کیا گیا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ کے قول، فعل اور تقریر سب کو شامل سمجھا گیا ہے اور اس معنیٰ سے اس کی حجیت محل نزاع ہے۔

ائمہ حدیث نے جو کتابیں سنت کے متعلق لکھی ہیں ان میں بھی قولی، فعلی اور تقریری سنت کا ذکر فرمایا ہے۔ تمام کتب سنن شاہد ہیں کہ ان میں سنت کو اسی متعارف اور مصطلح معنیٰ میں ذکر فرمایا گیا ہے اور معلوم ہے کہ سنت کے یہ دفاتر اور ان کے مصنفین کا علم وفضل امت میں مسلم ہے۔ سنت کے متعلق ان کا نقطۂ نظر یہی ہے جس کا ذکر اوپر کی عبارات میں ہوا۔

سنت مولانا اصلاحی کی نظر میں

جن حالات سے متاثر ہو کر مولانا اصلاحی نے ترجمان القرآن، اکتوبر ۵۸ء میں

زیرِ تنقید مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے، اہلِ حدیث، اہلِ قرآن وغیرہ جماعتیں سب مولانا کے پیشِ نظر ہیں اور ان سب پر مولانا اپنا تفوق ظاہر فرمانا چاہتے ہیں ۔ آپ فرماتے ہیں :۔

"حدیث اور سنت کا دین میں اصلی مقام واضح کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ مختصر طور پر وہ فرق واضح کر دوں جو حدیث اور سنت کے درمیان میں سمجھتا ہوں لیکن عام طور پر لوگ اس کو ملحوظ نہیں رکھتے ۔

حدیث تو ہر وہ قول یا فعل یا تقریر ہے جس کی روایت نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت کے ساتھ کی جائے، لیکن سنت سے مراد نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے صرف ثابت شدہ اور معلوم طریقہ ہے جس پر آپؐ نے بار بار عمل کیا ہو، جس کی آپ نے محافظت فرمائی ہو، جس کے حضور عام طور پر پابند رہے ہوں"

(ترجمان القرآن، اکتوبر ۱۹۵۵ء ص ۱۲۷)

مولانا کی یہ تعریف منطقی ہے نہ عرفی، تاہم :۔

(۱) مولانا نے جو فرمانا تھا کھل کر فرمایا ہے ۔ ان کی نظر میں جو اہمیت سنت کو حاصل ہے وہ حدیث کو نہیں ۔

(۲) اور یہ اہمیت بھی سنت کے اسی مفہوم کو حاصل ہے جسے مولانا نے اپنے لئے متعین فرمایا ہے یا جس کی تعلیم جماعت اسلامی کو دنیا اس وقت پیشِ نظر ہے

(۳) اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سنت کے متعلق یہ مولانا کی اصطلاح ہے، عام طور پر لوگ اسے ملحوظ نہیں رکھتے ۔

(۴) مولانا کی نگاہ میں کسی دوسرے مفہوم پر سنت کا اطلاق درست نہیں، سنت کا منطوق "صرف" یہی ہے (حالانکہ مولانا اس مفہوم میں پوری امت سے مختلف ہیں)

جہاں تک میرا یقین ہے مولانا نہ منکرِ حدیث ہیں نہ ان کو سنت سے انکار

ہے لیکن مولانا نے جس انداز سے بحث کا آغاز فرمایا ہے اس سے چور دروازے کھل سکتے ہیں اور منکرین حدیث کو اس سے کافی مدد مل سکتی ہے۔

(۵) مولانا نے سنت کی تعریف کو اس قدر سکیڑ دیا ہے کہ اس کا تعلق چند اعمال سے ہی ہوگا جن کا ثبوت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے علیٰ سبیل الاستمرار ہے جیسے نماز کے بعض ارکان، لیکن اقدارِ زکوٰۃ وغیرہ کے لئے شاید پھر خبر واحد ہی کا سہارا لینا پڑے۔

(۶) ہزار دفعہ فرمایا جائے "کہ اگر کوئی شخص اس (سنت) کو ماخذ دین تسلیم نہیں کرتا تو میں اس کو مسلمان تسلیم نہیں کرتا" سوال یہ ہے کہ اس "سنت" کی پہنائی ہے کہاں تک؟ اس کا احاطہ چند اعمال سے آگے نہیں بڑھے گا۔ پورا اسلام تو کسی دوسری جگہ ہی سے ثابت کرنا ہوگا پھر اسکی ادعا کی ضرورت ہی کیا ہے؟

(۷) دعویٰ یہ ہے کہ اسلام زندگی کے تمام گوشوں میں رہنمائی کے فرائض انجام دیتا ہے لیکن جناب کی پیش کردہ تعریف کے لحاظ سے تو اس کا دائرہ اس قدر تنگ ہوگا کہ زندگی کے بعض اہم گوشے بھی شاید اس کی رہنمائی سے خالی رہیں۔ سیاسی اور معاشی امور میں رہنمائی تو بڑی بات ہے، عبادات اور معاملات میں بھی ہمیں اسلام کی رہنمائی سے محروم ہونا پڑے گا۔ اخبارِ آحاد کے ساتھ معتزلہ کی طرح اگر سوتیلی ماں کا سا سلوک جاری رہا تو جہاد، تقسیم غنائم، جزیہ، محاربات ایسے اہم مسائل اور اسی قسم کے اکثر بین الاقوامی مسائل میں ہم اسلام کی رہنمائی سے محروم ہوجائیں گے اور تکمیلِ دین ایک ایسا خواب ہو کر رہ جائے گا جس کی کوئی تعبیر نہیں۔ قرآن عزیز اور سنن متواترہ کے ساتھ اہل قرآن کی طرح اگر ضروری احکام کشید کرنے کی کوشش کی گئی تو استدلال کا جو انداز اختیار کرنا پڑے گا اس کی حیثیت سیاسی جوڑ توڑ سے زیادہ بہتر نہیں ہوگی۔

ادارۂ طلوعِ اسلام کے بعد ادارۂ ثقافت اسلامیہ	انکارِ حدیث کے بعد ملک میں دو جماعتیں آپ کے

سامنے ہیں - ان کا طریق استدلال نمایاں ہے - ادارہ[1] طلوع اسلام کراچی اور ادارہ[2] ثقافت اسلامیہ لاہور - ان میں اکثریت منکرینِ حدیث کی ہے ، ان میں جو حضرات کھلے طور پر حدیث کا انکار نہیں کرتے ان کا ذہنی رجحان انکار ہی کی طرف ہے وہاں اسلام کے بنیادی حقائق کی تشریحات اس انداز سے کی گئی ہیں جس سے اسلام کے ارکان تک محفوظ نہیں رہ سکے - نہ نماز موجود ہے نہ روزہ ، نہ حج ہے نہ زکوٰۃ نہ توحید سلامت ہے نہ رسالت ، نہ قیامت ہے نہ جزا اور سزا - پورا اسلام قریباً دنیا پرستی کا دوسرا نام ہو گیا ہے - ملاحظہ ہو رسالہ " اسلام کی بنیادی حقیقتیں ،، مصنفہ خلیفہ عبدالحکیم - " مقامِ حدیث ،، از سید جعفر شاہ اور " نظام ربوبیت ،، از پرویز وغیرہ -

آج سے صدیوں پیشتر سنت اور حدیث کی حمایت میں ہم جہاں کھڑے تھے اس مقام سے ائمہ حدیث کے حملوں نے معتزلہ ، خوارج اور دوسرے مبتدع فرقوں کو شکست پر شکست دی تھی اور ہمارے اسلاف کی تعمیری اور تخریبی مساعی نے اہلِ بدعت کو ناکام بنا دیا تھا لیکن مولانا نے تعریف میں جو سکیڑ اور انقباض پیدا فرمایا ہے اس کا مطلب تو یہ ہو گا کہ ہم اپنے دعویٰ کے بہت سے حصوں سے خود ہی دست بردار ہو گئے - اگر ہماری ان فکری قیادتوں کی گریز پائی کا یہی حال رہا - تو ہمیں اپنی شکست کا اعتراف کرنا چاہیئے - ہم آحاد کے قیمتی ذخیرہ سے خود بخود دست کش ہو گئے - یہ غیر محتاط احتیاط قلتِ مطالعہ کا نتیجہ ہے یا جبن اور بزدلی کا؟ اللّٰھم انی اعوذ بک من الجبن -

(۹) اس تعریف سے شاید وہ مقصد بھی حاصل نہ ہو جس کے لئے یہ سکیڑ اور انقباض اختیار کیا گیا - میرا خیال ہے کہ اہل قرآن سے پرویز پارٹی شاید وقتی طور پر کسی قدر الفاظ کے ہیر پھیر سے آپ کے ساتھ اتفاق کرے ، غالباً ان کے انکارِ حدیث اور آپ کے اقرارِ حجیت سنت پر ، اس تعریف کے بعد کوئی نمایاں اثر نہیں پڑتا - کچھ اعتباری سا

امتیاز رہ جائے گا۔

مقامِ بحث سے انحراف

(۱۰) اس قسم کی تعریف مقامِ بحث سے ایک گونہ انحراف ہے۔ محل نزاع سنت کا وہی مفہوم ہے جس کا ذکر مختلف اہل علم کی مصنفات سے اوپر کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے سنت کی حمایت کا وہ مقام بدل لیا جس پر ہم قرونِ خیر سے آج تک قائم تھے اس انحراف اور حَیدَہ کی جناب سے امید نہ تھی۔

(۱۱) آنحضرتؐ کا عمل اور اس پر استمرار ثابت کرنے کے لئے تواتر کا ذخیرہ تو بہت ہی مختصر ہے، اگر آحاد پر اعتماد کیا جائے تو مولانا کے نقطۂ نظر سے اثبات الظن بالظن ہوگا اور بصورت اول زندگی کے عام گوشوں میں اس کا نتیجہ انکار حدیث ہوگا کیونکہ دفاتر سنت میں جو کچھ ملتا ہے یہ تعریف اس پر صادق نہیں آتی۔ نیز مولانا کی تعلیق ایسی ہے جیسے کوئی کہے کہ میں سنت کو حجت قطعی سمجھتا ہوں لیکن سنت کی تعریف یہ ہے کہ امام شافعی رح یا امام احمدؒ کی حیثیت کے آدمی از اول تا آخر اسے روایت کریں۔ سنگین شروط کا نتیجہ معنی انکار ہی ہوگا۔

(۱۲) اس تعریف کے مطابق صوم عاشورا جو غالباً آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی دفعہ رکھا۔ نماز تراویح جسے حضرت نے رمضان میں صرف تین دن باجماعت ادا فرمایا۔ دعا استفتاح کے مختلف صیغ جن پر مختلف اوقات میں عمل فرمایا ایسے ہی دوسری عملی سنتیں جن پر استمرار ثابت نہیں یا وہ زیر بحث ہے۔ اس تعریف میں کیسے شامل ہوں گی، ان کی سنیت سے انکار اس تعریف کے مطابق دشوار نہیں ہوگا۔

(۱۳) سنت کی تعریف میں بعض اہل علم کچھ قیود کے ساتھ عادات اور عبادات دونوں کو شامل سمجھتے ہیں، بعض صرف تعبدی امور ہی کو سنت میں داخل جانتے ہیں ـــــ یہ بحث اپنی جگہ محل نظر و غور ہے ـــــ لیکن مولانا کی تعریف اس باب میں

بھی خاموش ہے ۔ عاداتِ مستمرہ کو خارج کرنے کے لئے تعریف میں کوئی فصل نہیں۔ آپ کی اس تعریف کو زیادہ سے زیادہ اتنی اہمیت دی جاسکتی ہے کہ اگر کوئی عمل ان شرائط سے ثابت ہو جائے تو وہ بھی سنت ہو گا ۔

(۱۴) اصطلاحات کے تعین کا ہر شخص کو حق حاصل ہے لیکن ان کو ائمہ کی متعینہ اصطلاحات کی جگہ نہیں دی جاسکتی ۔ مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ میرے نزدیک صلوٰۃ کا مفہوم ربوبیت کبریٰ ہے اور آخرت سے مراد یوم الحساب نہیں بلکہ اسی دنیا میں کل کی فکر اور زندگی میں مستقبل کی فکر ہے اور ملائکہ سے مراد قدرت کے وہ کرشمے ہیں جو اسی دنیا میں انسان کے لئے مسخر فرمائے گئے ہیں، صوم سے مراد جذبات پر صرف انضباط اور کنٹرول ہے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ اپنی جگہ یہ چیزیں کتنی ہی مفید کیوں نہ ہوں مگر اس سے صوم و صلوٰۃ ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالملائکہ کے متعارف اور مصطلح مفہوم ثابت نہیں ہو گا ۔ اسی طرح سنت کے متعلق ایک جدید اصطلاح کی حد تک تو اس پر غور ہو سکتا ہے لیکن وہ ما بہ النزاع مسئلہ جس پر گفتگو چل رہی ہے اس سے حل نہیں ہو گا ۔ جہاں تک میرا خیال ہے مولوی احمد دین امرتسری قریباً اسی نقطۂ نگاہ سے اعمال متعارفہ اور معمول بہا سنن کا انکار نہیں کرتے تھے ، اذان ، نماز ، نکاح میں اسی متعارف طریق پر عمل کرتے تھے برہان القرآن اور ان کی تفسیر میں اس کا ذکر بار بار ملتا ہے ، حالانکہ مولوی احمد دین مسلمہ طور پر منکر حدیث تھے ۔ امید ہے مولانا اس طریق بحث پر نظر ثانی فرمائیں گے ۔ کیونکہ اس انحراف سے اصل مسئلہ حل نہیں ہو گا ۔

اثبات سنت کے طریقے

سنت کی تعریف کے بعد مولانا نے فرمایا کہ سنت چار طریق سے ثابت ہو سکتی ہے ۔

(۱) عملی تواتر (۲) اہل مدینہ کا تعامل (۳) خلفاء راشدین کا عمل (۴) آحاد ۔

خبر متواتر اور تواترِ عملی میں بھی فرق ہے مگر اس وقت اس بحث کی ضرورت

نہیں تواتر کی حجیت مسلم ہے جو سنت تواتر سے ثابت ہو وہ بہرحال ثابت شدہ ہے لیکن تواتر سے کس قدر سنن ثابت ہو سکیں گی۔ اس کا مختصر تذکرہ پہلے ہو چکا ہے اور آئندہ بھی ہو گا۔

احادیث پر گفتگو سے قبل تعامل اہل مدینہ اور سنت خلفاء راشدین کا معاملہ سامنے آتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہم تک اسناد اور روایت کے ذریعہ سے ہی پہنچیں گی جن میں زیادہ تر آحاد ہیں اس لئے اس کا مقام اخبار آحاد سے بھی فروتر ہونا چاہیئے۔ آحاد کی ظنیت اگر شبہات کا سبب بن سکتی ہے تو یہاں بھی ظن ہی ظن ہے۔ مرفوع اور صحیح آحاد سے گھبرانا اور اہل مدینہ کے تعامل سے استدلال معقول معلوم نہیں ہوتا۔ فر من المطر وقام تحت المیزاب والا معاملہ ہو جائیگا

مولانا نے اہل مدینہ کے کیس کو اپنے الفاظ میں بیان فرمایا کہ مدینہ منورہ تمام بڑے بڑے صحابہ رض کا مرکز تھا۔ زندگی کے مختلف معاملات میں صحابہ جو کچھ کرتے تھے امام مالک اسے سنت کا ہم مرتبہ سمجھتے ہیں کیونکہ ایسے وقت میں صحابہ سنت سے کیونکر الگ ہو سکتے ہیں الخ مختصراً۔ اور نتیجہ کے طور پر فرماتے ہیں:۔

"میں مالکیہ کے اس نقطۂ نظر کو قابل لحاظ سمجھتا ہوں"

(۱) موالک کی جس قدر کتابیں میری نظر سے گزری ہیں وہ لوگ اہل مدینہ کے عمل کو سنت کہنے کی جرأت نہیں کرتے، وہ جانتے ہیں کہ سنت نبوی کے اثبات کے لئے صحیح راہ سند ہے، شہرت کو اس میں کوئی دخل نہیں، آج کل سند کے متعلق جن خطرات کا اظہار کیا جاتا ہے اس وقت یہ خطرات موجود نہ تھے۔

(۲) امام مالک ۹۳ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور ۱۸۰ھ کے قریب آپ نے انتقال فرمایا اور عام طور پر کبار صحابہ رض ۳۰ھ سے پہلے ہی دینی خدمات کے سلسلہ میں عراق، شام، فارس وغیرہ مفتوحہ ممالک کی طرف تشریف لے جا چکے تھے دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے مدینہ میں علوج کی کثرت ہو گئی تھی جو دنیوی مقاصد کے

لئے مدینہ کو قریبًا اپنا مسکن بنا چکے تھے۔ شہادتِ عثمانؓ اور بعد کے واقعات اور حوادث کا ایک سبب اہل الرائے اور کبارِ صحابہؓ کی عدم موجودگی بھی تھی۔ ان حالات میں اہل مدینہ کے عمل کو کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی بلکہ قرین قیاس تو یہ ہے کہ اس وقت کے عمل کو کوئی اہمیت نہ دی جائے۔

(۳) تمام دنیا کے لئے مدینہ ہو یا کوفہ، سنت ہی صحتِ عمل کی کسوٹی ہے۔ اب سنت کے لئے کسی شہر کو معیار قرار دینا معقول بات معلوم نہیں ہوتی۔ سنت اگر دیانتًا حجت ہے تو کسی شہر یا کسی فرد کا عمل اس کے لئے بنیاد نہیں ہو سکتا۔ گھوڑا تانگے کے پیچھے نہیں جوتا جا سکتا۔

(۴) کبار صحابہؓ کا بھی یہی طریقہ تھا کہ سنت صحیحہ مل جانے کے بعد اپنے عمل کو بدل دیتے اور اپنی روش پر اصرار نہیں فرماتے تھے اس لئے اگر بالفرض صحابہ اس وقت مدینہ میں موجود بھی ہوتے تو بھی سنت ان پر حجت ہوتی، امام شافعیؒ فرماتے تھے

کیف اترک الخبر لاقوال اقوام لو عاصرتھم لحاججتھم بالحدیث

(احکام للآمدی ج ۲ ص ۱۶۵)

" میں ان لوگوں کی اطاعت کیونکر کر سکتا ہوں اگر میں اس وقت موجود ہوتا تو سنت کے اعتماد پر ان سے بحث کرتا۔"

حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:- والسنۃ ھی المعیار علی العمل و لیس العمل معیارا علی السنۃ (اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۹۵)

"سنت معیار ہے کسی کا عمل معیار نہیں۔"

(۵) اصل مستند چیز سنت ہے۔ صحابہؓ جہاں گئے ان کے پاس علم تھا اور انہوں نے آنحضرتؐ کے قول و فعل کی تلقین فرمائی، عجیب بات ہے کہ جب یہ حضرات مدینہ میں ہوں تو یہ علم مالکؒ کے نزدیک حجت ہو، لیکن جب یہ علم کوفہ یا شام میں چلا جائے تو اس کی حجیت محلِ نظر ہو جائے۔ والجلد ان والساکن والبقاع

لاتاثیر لها فی ترجیح الاقوال وانما التاثیر لاهلها وسکانها

(اعلام ج ۲ صـ۲۹۵)

اینٹوں اور مکانات کو کسی بات کی ترجیح میں کیا دخل ہو سکتا ہے، اس کا تعلق تو وہاں کے رہنے والوں سے ہی ہونا چاہیئے۔" علوم صحابہؓ اور سنن نبویہ جہاں ہوں حجت ہوں گی۔

(۶) مدینہ میں کبھی اہل علم باہم اختلاف فرماتے تھے۔ مؤطا میں مالکؒ نے خود ان اختلافات کا ذکر فرمایا۔ اس صورت میں بعض اہل مدینہ کے ارشادات دوسروں پر کیونکر حجت ہوں گے اور مولانا سنت ثابت کرنے کے لئے کن اقوال کو معیار قرار دیں گے۔ موالک کے اس اصول کا لحاظ کیسے کیا جائے گا جب دونوں طرف اہل مدینہ موجود ہوں۔

اہل مدینہ اور ترک سنّت

(۷) اہل مدینہ بعض اہم سنتوں کو ترک کر چکے تھے مثلاً :- (۱) ہاتھ باندھنا موالک میں رائج نہیں وہ کھلے ہاتھوں نماز ادا کرتے ہیں۔

(۲) موالک سلام صرف ایک طرف پھیرتے ہیں۔ جمہور ائمہ کا مذہب ہے سلام دونوں طرف ہونا چاہیئے۔

(۳) مالکی نماز میں بسم اللہ پڑھنا ہی پسند نہیں کرتے۔

(۴) رفیع الیدین ایسی معروف سنت موالک میں معمول بہا نہیں۔

(۵) تکبیرات میں جہر کا رواج مدینہ میں نہیں رہا تھا۔

(۶) دعاء استفتاح بالکل ترک کی جا رہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے تعلیم کے لئے عرصہ تک اسے جہر فرمایا (مسلم)

(۷) موالک میں رواج ہے کہ وہ صبح کی اذان وقت سے پہلے کہنا پسند کرتے ہیں حالانکہ سنت صحیحہ اس کے خلاف ہے، اذان وقت ہی کے اظہار کا ذریعہ ہے۔

(۸) مسجد میں جنازہ درست ہے لیکن موالک اسے جائز نہیں سمجھتے، ابن حزم نے احکام ج ۲ میں اس قسم کے بیسیوں مسائل ذکر کئے ہیں جن میں اہل مدینہ کا عمل سنت کے خلاف ہے یا موالک ان سنن کے پابند نہیں جن کا مدینہ منورہ میں عرصہ تک رواج رہا۔ اب دو ہی رائیں ہو سکتی ہیں یا مالک خود اہل مدینہ کے عمل کو حجت نہیں سمجھتے تھے یا اہلِ مدینہ کا عمل سنت کے مطابق نہ تھا۔

(۹) ممالک اور شہروں کے اعمال اور عادات میں حکومت کو جہاں تک دخل ہے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مدینہ میں جہاں خلفاء راشدین اور ائمہ ہدیٰ کا اثر رہا وہاں فاسق و فاجر حکام کا بھی اثر رہا۔ حافظ ابن حزم لکھتے ہیں کہ "زمانۂ خیر کے بعد مدینہ میں عمرو بن سعید، حجاج بن یوسف، طارق، خالد بن عبد اللہ قسری، عبد الرحمٰن بن ضحاک، عثمان بن حیان مری ایسے فاسق اور فاجر بادشاہوں کا دور رہا اور ان کے اخلاقی اثرات اور وحشت خیز بدعات سے کبھی مدینۃ الرسول متاثر ہوا (الاحکام)

امام مالکؒ کے زمانہ میں مدینہ اس ملی جلی تہذیب کا مظہر تھا معلوم نہیں مولانا موالک کے نقطۂ نظر کو کہاں تک قابلِ لحاظ سمجھتے ہیں۔

(۱۰) ایک صدی کے مختلف اثرات کے بعد مولانا اہل مدینہ کے عمل کو اس وہم یا ظن کی بنا پر سنت کی اساس قرار دیتے ہیں کہ یہ آنحضرتؐ کے ارشادات سے ماخوذ ہو گا اور سنت صحیحہ سے اس لئے گھبراتے ہیں کہ خبر واحد ظنی ہے۔ اوہام و ظنون کو علوم پر ترجیح ہماری سمجھ میں نہیں آئی اور نہ ہی مولانا ایسے فہیم آدمی سے اس کی امید ہونی چاہیئے۔ صلت علی الاسد و بلت عن النقد کی مثال اس سے زیادہ اور کیا ہو گی۔ مولٰنا نے کس سادگی سے فرما دیا :-

"اس طریقہ سے معلوم شدہ سنت کو اس علم سنت پر ترجیح دی گئی جو اخبارِ آحاد سے حاصل ہو"

مدینہ کے نام پر جذباتی اپیل تو کی جا سکتی ہے، علم و درایت کی دنیا میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

(۱۱) حقیقت یہ ہے کہ امام مالکؒ خود بھی اہل مدینہ کو یہ اہمیت نہیں دیتے جو اسے مولانا دے رہے ہیں۔ وہ سنت صحیحہ کو اہل مدینہ کے عمل سے رد کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ اگر ان کی نظر میں یہ عمل اس قدر اہم ہوتا تو وہ ہارون الرشید کی مؤطا مالکؒ کے متعلق پیش کش فوراً منظور فرما لیتے۔

انه شاور مالكا فى ان يعلق الموطا فى الكعبة ويحمل الناس على ما فيه فقال لا تفعل فان اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم اختلفوا فى الفروع وتفرقوا فى البلدان وكل سنة مضت قال وفقك الله يا ابا عبد الله (حجة الله ج ۱ ص ۱۱۶)	خلیفہ ہارون نے امام مالکؒ سے مشورہ کیا کہ مؤطا کو ملک کا قانون قرار دے کر کعبہ میں لٹکا دیا جائے تاکہ لوگ اس کے اتباع پر مجبور ہوں، امام مالکؒ نے فرمایا، صحابہؓ کا فروع میں اختلاف تھا اور وہ مختلف ممالک میں پھیل گئے۔ جو کچھ ان سے منقول ہے سب سنت ہے۔ ہارون نے معاملہ سمجھ کر فرمایا، اللہ تمھیں خیر کی توفیق دے۔

(اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۹۶ مفتاح السعادۃ تاشکبری زادہ ۹۶۲ھ ج ۲ ص ۸۷)

امام مالکؒ تمام صحابہؓ کے علوم کو سنت سمجھتے ہیں۔ علم مدینہ میں ہو یا کسی دوسرے شہر میں وہ اہل مدینہ کے علم کو سنت کی بنیاد نہیں سمجھتے، مؤطا میں عمل اہل مدینہ کا ذکر ترجیح اور تائید کے لئے ہے، اصل دلیل وہاں بھی سنت ہی ہے جس کا ثبوت اسی طریق سے ہوگا جو محدثین میں متعارف ہے۔ مولانا نے جس انداز سے اہل مدینہ کے عمل کا ذکر فرمایا ہے۔ متاخرین موالک یا مولانا ایسے وکلاء جو مقام چاہیں اسے عنایت فرمائیں، امام مالکؒ پر اس کی ذمہ داری نہیں ڈالی جا سکتی۔ امام قطعاً اس کے حق میں نہیں کہ اہل مدینہ کے عمل سے سنت صحیحہ کو رد کیا جائے، یہ ایسی وکالت ہے

جسے مؤکل پسند نہیں کرتا۔

(۱۲) بقول امام ابن حزم تین سو کے قریب اہل علم مدینہ سے کوفہ اور ان اطراف میں آباد ہو گئے اور اسی کے پس وپیش شام میں، اور ان کی یہ ہجرت محض دینی اور تبلیغی ضرورتوں کے پیشِ نظر تھی، اس ایثار کی یہ کتنی سخت سزا ہو گئی کہ ان کا عمل نہ حجت ہے نہ سند، کے لئے اساس، اور بعض دوسرے حضرات جو دینی یا دنیوی ضرورتوں کے ماتحت مدینہ میں آباد ہو گئے ان کے اعمال سنت نبوی کے لئے کسوٹی قرار پائے اگر وطنی عصبیت کا دین میں یہ مقام ہو تو علم ودانش کی کیا قدر وقیمت رہ گئی۔

فما حب الديار شغفن قلبي
ولكن حب من سكن الديار

(۱۳) اگر انسانی اعمال کو محض شرف وطنیت کی بنا پر احادیث صحیحہ اور اخبار آحاد پر بے اعتمادی کا ذریعہ بنایا جائے تو انکار حدیث کے لئے ایک خطرناک باب کھل جائے گا۔ فانها لا تعمى الابصار ولكن تعمى القلوب التي في الصدور۔

(۱۴) اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غیر مدنی صحابہ کے پاس بھی علوم نبویہ کے ذخائر موجود تھے ان میں بعض ایسے بھی تھے جو اہل مدینہ کے پاس نہیں تھے۔ اس صورت میں اگر حدیث پر عمل کیا جائے تو اہل مدینہ کے عمل کی حیثیت کیا رہی؟ اور اگر اہل مدینہ کے عمل کو ترجیح دی جائے تو منکرین سنت نے آخر کیا جرم کیا؟ اس اصول سے حجیت حدیث کے مسلک کو مدد ملی یا انکارِ حدیث کی تائید ہوئی؟ اس کا فیصلہ مولانا ہی فرما سکتے ہیں۔

(۱۵) امام مالکؒ نے مؤطا میں چند مقامات پر اہل مدینہ کے عمل کا ذکر فرمایا ہے ان کا اپنا انداز ترجیح کی حد تک ہے، الزام وحجت نہیں بلکہ بعض مقامات پر تو یہ

تذکرہ صرف اظہارِ واقعہ کے طور پر آیا ہے۔ حافظ ابن القیم مؤطا کی سرکاری حیثیت کے متعلق ہارون الرشید کی تجویز اور امام مالکؒ کے انکار کے بعد فرماتے ہیں :-

وھذا یدل علی ان عمل اھل المدینۃ لیس عندہ حجۃ لجمیع الامۃ وانما ھو اختیار منہ لما رای علیہ العمل ولم یقل قط فی مؤطاہ ولا غیرہ لا یجوز العمل بغیرہ بل یخبر اخباراً مجرداً ان ھذا عمل اھل بلدہ فانہ رضی اللہ عنہ وجزاہ عن الاسلام خیراً ادعی اجماع اھل المدینۃ فی نیف واربعین مسئلۃ (اعلام منیریہ، ج ۲ ص ۲۹۷)

"اسی سے ظاہر ہے کہ اہل مدینہ کا عمل حجت نہیں، نہ امت پر ہی اسے قبول کرنا ضروری ہے بلکہ مطلب صرف ایک واقعہ کا اظہار ہے، اہل مدینہ کے اجماع کا ذکر امام نے قریباً چالیس مواقع پر فرمایا ہے"

سنت سازی کی توجیہ غالباً مولانا نے کسی مالکی کے بیان سے فرمائی یا اپنی ہی درایت سے اسے جنم دے دیا، امام مالکؒ کے ارشاد سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ مولانا اصلاحی گو اہل حدیث نہیں لیکن وہ کھلے ذہن سے سوچنے کے عادی ہیں اگر وہ اعلام الموقعین ج ۲، اور احکام ابن حزم ج ۲ ملاحظہ فرمائیں تو وہ راقم سے اتفاق فرمائیں گے۔ انشاء اللہ۔

اہل مدینہ کے عمل کے اجزائے ترکیبی حافظ ابن قیمؒ اہل مدینہ کے عمل کا پس منظر ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں :-

"کان یحسب من فیھا من المفتین والامراء والمحتسبین علی الاسواق ولم تکن الرعیۃ تخالف ھؤلاء فاذا افتی المفتون نفذہ الوالی وعمل بہ المحتسب وصار عملاً فھذا ھو الذی

لا یلتفت الیہ لا عمل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وخلفائہ والصحابۃ فذالک ہو السنۃ فلا یخلط احدھما بالآخر فنحن لہذا العمل اشد تحکیما وللعمل الآخر اذا خالف السنۃ اشد ترکا وباللہ التوفیق (اعلام ج ۲ ص ۳۰۶)

"خلفاء راشدین اور صحابہ کا دور گزرنے کے بعد اہل مدینہ کا عمل کیا تھا۔ مفتی کا فتویٰ، امیر کا حکم اور کوتوال کا احتساب، رعیت اس کی مخالفت نہیں کر سکتی لیکن یہ قطعاً قابل توجہ نہیں، آنحضرت خلفاء اور صحابہ کا عمل تو سنّت ہے ہم ان کا فیصلہ قبول کرتے ہیں اور اس کے ساتھ دوسری کوئی چیز غلط نہیں کرنا چاہتے اور اس کے سوا جو عمل سنت کے خلاف ہو اس کا حتماً انکار کرتے ہیں"

اس کے بعد حافظ ابن قیم نے ایسی سنتوں کا ذکر فرمایا جو خلفاء اور صحابہ کے وقت موجود تھیں لیکن موالک نے ان پر عمل ترک کر دیا۔

یہی تذکرہ حافظ ابن حزم اس طرح فرماتے ہیں:۔

"یہ زمانۂ خیر تو گذر گیا۔ اس کے بعد عمرو بن سعید اور حجاج بن یوسف ایسے فاسق اور ظالم بھی مدینہ کے والی بنے اور عمرو بن حزم اور عمر بن عبد العزیز ایسے صالح اور نیک بھی اور اہل مدینہ کا عمل ان کے اثرات کا دوسرا نام تھا۔ مختصراً (الاحکام ج ۲ ص ۱۱۵)

مصر بھی آج کل علم "درایت" کا گہوارہ ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے اہل مدینہ کے عمل کے متعلق ایک مصری عالم کی رائے بھی سن لیجئے۔ شیخ حسن احمد الخطیب فرماتے ہیں:۔

"قالوا ان عمل اہل المدینۃ کعمل غیرھم من اہل الامصار فلا فرق بین عملھم وعمل اہل العراق والشام والحجاز وانما العبرۃ بالسنۃ فمن کانت معھم فھم اہل العمل المتبع

وکیف یکون عمل بعضهم حجة علی بعض اذا اختلف علماء المسلمین وقد انتقل اکثر اصحاب رسول اللہ صلعم عن المدینة وتفرقوا فی الامصار واکثر علماءهم صار والی الکوفة والبصرة والشام وانما الحجة فهی الاصل الذی یجب ان یرجع الیه وعمل مصر او بلد اصلا ولا معیار فی التشریع انتہی ملخصًا فقہ الاسلام ص۱۷۲ ۔

"جمہور ائمہ کا خیال ہے کہ مدینہ کو عمل میں باقی شہروں پر کوئی مرتبہ حاصل نہیں اختلاف کے وقت سنت کا اتباع اصل چیز ہے، کسی عالم کا قول دوسرے پر حجت نہیں۔ صحابہ مختلف ممالک میں پھیل گئے۔ سب کے پاس علم تھا۔ اصل چیز سنت ہے کسی شہر کا عمل تشریع کی بنیاد قرار نہیں پا سکتا"

جمہور ائمہ اسلام کی عمل اہل مدینہ کے متعلق یہی رائے ہے۔

خبرِ آحاد

خبرِ آحاد کے متعلق بہت سے فنی مباحث ہیں جن کی تفصیل اصولِ فقہ اور

لہ خبر کی دو قسمیں ہیں، متواتر[1] اور آحاد[2]، متواتر کی حجیت پر سب عقلمند متفق ہیں۔ البتہ سمنیہ اور براہمہ متواتر کو بھی حجت نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ کسی خبر سے بھی یقینی علم حاصل نہیں ہو سکتا جب افراد اور آحاد سے یقین حاصل نہیں ہوتا تو متواتر انہی کے مجموعہ کا نام ہے، اس میں یقین کہاں سے آگیا۔

متواتر کے سوا باقی سب آحاد ہیں، خبر دینے والا ایک ہو یا دس بیس، اصطلاح میں یہ خبر واحد ہی ہوگی۔ متواتر کا وجود چونکہ نسبتاً کم ہے، دنیا اور دین کے تمام کاروبار کا

انحصار خبر واحد پر ہے، دینی مسائل بھی اکثر خبر واحد ہی سے ہم تک پہنچے ہیں اور دنیا کی بیشتر اطلاعات میں بھی خبر واحد ہی کارفرما ہے ۔ حکومت سے لے کر عوام الناس تک اگر خبر واحد پر اعتماد کرنا ترک کردیں تو کاروبار کا پورا کارخانہ برباد اور تباہ ہو کر رہ جائے، دوسری طرف تواتر کے عدد کا کسی کام کے لئے اجتماع ناممکنات سے ہے ۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام وفود بھیجتے ان وفود کی اطلاعات پر لڑائیاں لڑی جاتیں، ہزاروں جانیں ضائع ہوجاتیں مگر خبر واحد کی افادی حیثیت کبھی زیر بحث نہیں آئی ۔

قرآن مجید نے فرمایا :۔

اِذَا جَآءَ کُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ (۴۹ : ۶) جب کوئی فاسق فاجر آدمی بھی تمھیں اطلاع دے تو اس کی خبر کی تحقیق کر لو، ایسا نہ ہو کہ بعد میں ندامت اٹھانی پڑے ۔

فاسق کی خبر کو مسترد کرنے کا حکم نہیں دیا گیا البتہ تحقیق وتثبت کی تائید فرمائی گئی ہے آیت میں وصفِ فسق کی تخصیص سے ظاہر ہے کہ ثقہ اور متدین آدمی کی اطلاع کے لئے یہ بھی چنداں ضروری نہیں، اس سے ظاہر ہے کہ خبر واحد کو دین اور دنیا کے معاملات میں کس قدر اہمیت حاصل ہے ۔

منافقین کے ارجاف سے بچنے کے لئے یہ تجویز نہیں کہ ان کی باتوں پر اعتبار کرنا چھوڑ دو بلکہ یہ فرمایا ایسی خبریں اہل علم اور اہل استنباط کی طرف لوٹائی جائیں تاکہ وہ ان سے صحیح نتائج اخذ کرسکیں ۔

تبلیغ وموعظت کی ضرورت کے پیشِ نظر فرمایا :۔ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّیَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ وَلِیُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَیْهِمْ (۹ : ۱۲۲) یعنی ہر گروہ سے کچھ لوگ علم وتفقہ کے لئے سفر

کریں اور واپس آکر اپنی قوم کو ڈرائیں۔ طائفہ کا لفظ ایک اور اس سے زائد کے لئے مستعمل ہوتا ہے اور یہ خبر واحد ہی ہوگی، ان کے علم و انداز پر کوئی عددی پابندی نہیں لگائی گئی کہ جب تک وہ سو پچاس نہ ہو جائیں کوئی بات زبان سے نہ کہیں۔ معلوم ہے جب وہ کہیں گے تو قرآن عزیز کی ہدایت کے مطابق ان کے ارشادات پر لازماً اعتماد ہوگا۔ خبر واحد کی حجیت اور اعتماد کے متعلق قرآن عزیز کی یہ صراحت ہے۔ آنحضرتؐ پر بھی پابندی نہیں لگائی کہ جب تک مخاطبین کی تعداد حد تواتر تک پہنچ جائے آپ کوئی لفظ زبان سے نہ فرمائیں۔ اگر خبر واحد شرعاً مستند نہ ہوتی تو آنحضرتؐ کے ارشادات پر ضرور کوئی نہ کوئی پابندی لگائی جاتی۔ ظاہر ہے کہ خبر واحد شرعی حجت ہے۔

اسی لئے ائمہ سنت نے تثبت اور تحقیق کے بعد اسے حجت مانا ہے، قرائن کے بعد اسے پوری اہمیت دی ہے اور جو اس سے ثابت ہوا سے علم کی حیثیت سے قبول فرمایا ہے۔ سلسلہ احادیث میں اکثر اخبار آحاد ہیں، ائمہ حدیث نے جہاں ضرورت محسوس کی تحقیق اور تبیین فرمایا۔ قرائن کی چھان پھٹک فرمائی ہے، اس کے لئے اصول وضع فرمائے اور اسے قبول فرمایا۔ یہی ممکن تھا، امکان کی حدود سے آگے انسان کے اختیار کی چیز نہیں۔ اس کا عمل اور علم، سعی اور کوشش، ممکنات تک محدود ہے، اس سے زیادہ کی تکلیف نہ اسے قدرت نے دی ہے نہ وہ اس کا مکلّف ہے۔

خبر واحد اور اس پر بحث و نظر

پہلی صدی ہجری اسلامی روایات کا مقدس دور ہے شریعت کی علمی اور عملی روایات اس وقت جو بن پر تھیں۔ جو کچھ اس وقت ہوا وہ اسلامی نقطۂ نظر سے بہت حد تک احترام و قبول کا مستحق ہے۔ ابن حزم فرماتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری میں خبر واحد بلا انکار قبول کی جاتی تھی، اہل سنت خوارج، شیعہ، قدریہ سب اسے قبول کرتے تھے پہلی صدی کے بعد متکلمین معتزلہ نے اس میں

یا ضعف کے قرائن پائے جائیں، ایسی خبر سے قطعاً علم حاصل نہیں ہوگا۔ ابن تیمیہؒ

اجماع امت کی مخالفت کی (احکام الاحکام ج ۱ ص۱۱۴)

شیخ محمد ابراہیم الوزیر الیمنی (۸۴۰ھ) فرماتے ہیں :-

"وقد انعقد اجماع المسلمین علی وجوب قبول الثقات فیما لا یدخله النظر ولیس ذالك بتقلید بل عمل بمقتضی الادلة القاطعة الموجبة لقبول خبرالآحاد وهی محررة فی موضعها من فن الاصول ولم یخالف فی هذا الا شرذمة یسیرة وهم متکلموا بغداد من المعتزله والاجماع منطبق قبلهم وبعدهم علی بطلان قولهم (الروض الباسم ص۳۲)

"ثقات کی ایسی خبریں جن پر کوئی اعتراض نہ ہو۔ ان کے قبول پر اہل اسلام کا اجماع ہے اور یہ تقلید نہیں بلکہ قطعی دلائل کا تقاضا ہے جن کا مفاد یہ ہے کہ اخبار آحاد کا قبول اور ان سے احتجاج ضروری ہے۔ یہ مسئلہ فن اصول میں اپنی جگہ پر مرقوم ہے اور بغداد کے معتزلہ متکلمین کے سوا کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس پر اجماع پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔"

اخبار آحاد پر اعتراض عموماً ان لوگوں نے کیا جو انسانی نفسیات سے ناواقف اور ان کی حدود امکان سے ناآشنا تھے۔ آج بھی اس میں وہی نیچر پرست شبہات کی راہیں پیدا کر رہے ہیں جو زمین پر بیٹھ کر آسمان کی باتیں کرنے کے عادی ہیں۔ چنانچہ مختلف ادوار میں اخبار آحاد کے خلاف انہی حلقوں سے آواز اٹھی جو یا تو خود بدعت کے داعی تھے یا اہل بدعت سے ایک گونہ متاثر تھے۔

منکرین	کونسی حدیث کے؟	کب؟
۱۔ خوارج	جو اہل بیت کے فضائل میں تھیں۔	۲۰۰ھ
۲۔ شیعہ	جو احادیث صحابہؓ کے فضائل میں تھیں	۲۰۰ھ

فرماتے ہیں :- ولاریب ان مجرد خبر الواحد الذی لا دلیل علی صدقہ

منکرین	کونسی احادیث کے ؟	کب ؟
۳- معتزلہ اور جہمیہ	احادیثِ صفات الٰہی	
۴- قاضی عیسیٰ بن ابان اور ان کے اتباع	جو احادیث غیر فقیہ صحابہ سے مروی ہیں :-	سنہ ۲۲۱ھ
۵- متاخرین فقہائے سے قاضی ابوزید دبوسی وغیرہ	〃 〃	〃 〃
۶- اس کے بعد معتزلہ اور متکلمین کیا تو متاخرین فقہاء کی ایک مختصر سی جماعت	اصول اور فروع دونوں میں ان حضرات نے خبر واحد سے اختلاف کیا۔	سنہ ۴۰۰ھ کے بعد
۷- یورپین تہذیب سے مرعوب گروہ، مولوی چراغ علی، سرسید احمد خاں وغیرہ	یہ حضرات فن سے قطعاً ناواقف تھے انکی تحقیق میں احادیث تاریخ کا ذخیرہ ہیں جو انکی نیچر کے موافق ہوا قبول کرلیا اور جو مخالف ہوا ترک کردیا۔	سنہ ۱۳۰۰ھ کے قریب قریب
۸- مولوی عبداللہ چکڑالوی مستری محمد رمضان گوجرانوالہ مولوی حشمت علی لاہوری مولوی رفیع الدین ملتانی	احادیث کا بالکلیہ انکار	سنہ ۱۳۰۰ھ کے بعد
۹- مولوی احمد دین صاحب امرتسری مسٹر غلام احمد پرویز	ان کے نزدیک قرآن وحدیث اور پورا دین ایک کھیل ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک سیاسی	

لا یفید العلم (الرد علی المنطقیین ص۳۸) خبر واحد میں اگر صدق کے قرائن

منکرین	کونسی احادیث کے؟	کب؟
یہ حضرات سرسید سے متاثر ہیں لیکن جاہل اور غیر محتاط۔	نظریہ جسے ہر وقت ہمیں بدلنے کا حق حاصل ہے۔ مولوی احمد دین بعض متواتر اعمال کو "مستثنیٰ" سمجھتے تھے۔	سنہ ۱۳۴۰ھ
۱۰۔ مولانا شبلی مرحوم، مولانا حمید الدین فراہیؒ، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی اور عام فرزندان ندوہ، باستثنائے حضرت سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ	یہ حضرات حدیث کے منکر نہیں لیکن ان کے اندازِ فکر سے حدیث کا استخفاف اور استحقار معلوم ہوتا ہے اور طریقۂ گفتگو سے انکار کے لئے چور دروازے کھل سکتے ہیں	سنہ ۱۴۰۰ / ۱۳۰۰ھ

یہ جدول میرے ذاتی مطالعہ کا نتیجہ ہے، مجھے اس کے کسی حصہ پر اصرار نہیں۔ میں ممنون ہوں گا اگر مجھے میری لغزش سے آگاہ کیا جائے۔ میرے خیال میں تحریکِ انکار حدیث تدریجی ارتقا سے اس مقام تک پہنچی ہے۔

تحقیق و ثبت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کا ہے اور فی الواقع اس کے انکار کا ایمان و دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا۔ قرآن عزیز کے الفاظ کی تاویل میں جب اختلاف ہو تو اس کے الفاظ کی قطعیت میں شبہ نہیں ہوگا، لیکن مفہوم کی تاویل اور اس کے تعین میں بحث رہے گی، جو تاویل قواعد صحیحہ اور علوم سنت کے خلاف ہوگی اس کے منکر کو قرآن کا منکر کہا جائے گا۔ اختلافِ تاویل کسی کو اس فتویٰ سے بچا نہیں سکتا۔ ٹھیک اسی طرح جو احادیث قواعد صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق

موجود نہ ہوں تو اس سے علم حاصل نہیں ہوگا۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے کتب حدیث کے پانچ طبقات متعین فرمائے ہیں، آخر میں فرمایا :۔ اما الطبقۃ الاولیٰ والثانیۃ فعلیہما اعتماد المحدثین وحوم حماھا مرتعھم ومسرحھم الخ ائمہ حدیث کا اعتماد پہلے اور دوسرے طبقہ پر ہے۔ یہی ان کے اعتماد کا محوری نقطہ ہے۔ تیسرا طبقہ جس میں بیہقی، طحاوی، مصنف ابن ابی شیبہ اور طبرانی وغیرہ کو شمار کیا ہے اس سے صرف ماہرین فن استفادہ کر سکتے ہیں، یہ عوام کے استعمال اور استفادہ کی چیز نہیں۔ باقی طبقات سے اہل بدعت استدلال کرتے ہیں، اہل حدیث ان پر اعتماد نہیں کرتے۔" (حجۃ اللہ ج ۱ ص ۱۰۶) کیونکہ ان طبقات میں صدق کے قرائن ناپید ہیں، ان کی اسانید میں خبط ہے اور ان کے رجال کتابوں میں عموماً ناپید ہیں۔

صدق کے قرائن اگر آحاد کے متعلق صدق کے قرائن موجود ہوں، مثلاً اس کی سند صحیح ہو، امت نے اسے قبول کیا ہو، مصنف نے صحت کا التزام کیا ہو، امت نے اس التزام کو درست تسلیم کیا ہو، اہل علم نے ان کتب کی خدمت کی ہو، شرحیں لکھی ہوں، لغات کو حل کیا ہو، رجال کو منضبط کیا ہو، مقدمات وحواشی لکھے ہوں، غرض اعتماد کی نظر سے دیکھا ہو یا واحد عن واحد منقول ہو اور اس میں شرائط صحت پائی جائیں یا امت نے عملاً اسے قبول کر لیا ہو، رواۃ کی ثقاہت معلوم ہو، ان

صحیح ثابت ہوں ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مترادف، صرف اختلاف اور کسی ایسے حضرات کا جو حقیقت سے آگاہ نہیں کسی حقیقت کو اپنے موقف اور مقام سے نہیں ہٹا سکتا قرآن اختلاف تاویل کے باوجود خدا کا کلام ہے اور شرعاً حجت، اسی طرح حدیث تحقیق وتثبت کے باوجود خدا کی طرف سے وحی ہے اور دین میں قرآن کے بعد حجت، امام عثمان سعید دارمی (۲۸۲ھ) فرماتے ہیں: لان ھذا الحدیث انما ھو دین بعد القرآن -

(نقض الدارمی علی بشر المریسی ص ۱۳۷)

حالات میں اس سے بھی یقین حاصل ہوگا اور اس پر عمل بھی واجب ہوگا۔ علامہ آمدی نے خبرِ واحد کے متعلق بہت بسط سے لکھا ہے لیکن اہلِ ظاہر اور اہلِ حدیث کے مسلک کا ذکر بہت اجمال سے فرمایا ہے، الاحکام فی اصول الاحکام ابن حزم، صواعق مرسلہ علی الجہمیہ والمعطلہ میں دونوں مسلک تفصیل سے مرقوم ہیں، اسی سے اہل حدیث کا مسلک پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ والقسم الثانی من الاخبار مانقله الواحد من الواحد فهذا اذا اتصل برواية العدول الى رسول الله صلى الله عليه وسلم وجب العمل به ووجب العلم بصحته ايضا (الاحکام ج ۱ ص۱۰۸)

جب ایک راوی دوسرے سے اتصال کے ساتھ نقل کرے اور یہ عادل ہوں تو اس پر عمل بھی واجب ہے اور اس کی صحت پر یقین بھی ضروری ہوگا[1] دوسرے مقام پر مرقوم ہے۔ فصح بهذا اجماع الامة كلها على قبول خبر الواحد الثقة عن النبي صلى الله عليه وسلم (الاحکام ج ۱ ص۱۱۴)

"خبر واحد صحیح کے قبول پر پوری امت کا اجماع ہے۔ پھر ج ۱ ص۱۱۸ میں فرمایا:-

وقد ثبت عن ابی حنيفة ومالك والشافعی واحمد وداؤد رضی الله عنهم وجوب القول بخبر الواحد وهذا حجة على من قلد احدهم في وجوب القول بخبر الواحد (احکام) ائمہ اربعہ اور داؤد ظاہری سب خبر واحد کے قبول پر متفق ہیں اور یہ ان کے اتباع پر حجت ہے۔

متاخرین فقہاء ابن حزم متقدمین ائمہ کے اجماع کا ذکر فرمانے کے بعد متاخرین فقہاء کا ذکر فرماتے ہیں جو معتزلہ اور متکلمین سے

---

[1] ائمہ اصول نے خبر واحد کو ظنی لکھا ہے، اس ظن کا محدثین کی اصطلاح میں یہ مطلب ہے کہ اس علم کا مرتبہ اس علم سے کم ہے جو متواتر سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ ظن بمعنی وہم نہیں جیسے منکرین حدیث نے سمجھا۔ (من المؤلف)

متاثر ہو کر مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے تھے اور جنھوں نے ظن مصطلح کو حدود علم سے باہر سمجھا۔ امام نے دو اصولوں پر زور دیا ہے (۱) وہ فرماتے ہیں کہ دین کامل ہے جیسے آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الخ سے ظاہر ہے۔ پھر اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا جو اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ سے واضح ہے اگر متاخرین فقہاء کے خیال کے مطابق کامل دین پر ظنون و اوہام غالب ہو جائیں اور حق و باطل اس طرح آمیز ہو جائیں کہ امتیاز ناممکن ہو تو حفاظت کا وعدہ کس طرح پورا ہوا؟ کیونکہ ذکر کا لفظ کتاب اللہ اور سنت دونوں پر حاوی ہے۔ پس اگر متاخرین کا خیال مان لیا جائے تو هذا انسلاخ من الدین و هدم للدین و تشکیک فی الشرائع (احکام ج ا ص۱۲۳) اس عقیدے کے بعد انسان دین سے بالکلیہ خارج ہو جائے گا اور دین کی پوری عمارت پیوند خاک ہو کر رہ جائے گی۔

(۲) معلوم ہے کہ خبر واحد میں تمام شبہات سند کی وجہ سے ہیں۔ صحابہؓ نے جب آنحضرتؐ سے سنا، اس وقت نہ تو سند تھی نہ کوئی شبہ گویا اللہ کی حفاظت یہیں ختم ہو گئی۔ مستقبل کے لئے اللہ تعالیٰ کوئی انتظام نہ فرما سکے بلکہ وضاع اور دجاجلہ دین پر غالب آ گئے جب ایسا نہیں تو لازماً دین قیامت تک محفوظ ہو گا اور یہ آحاد کی حفاظت سے ہی ہو گا۔ فقد ثبت یقیناً ان خبر الواحد العدل عن مثله مبلغا عن مثله الی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم حق مقطوع به موجب للعمل والعلم معاً (احکام ج ا ص۱۲۴) لہٰذا ثابت ہوا کہ حدیث صحیح متصل پر عمل واجب ہے اور اس کی صحت بھی یقینی ہے۔

اہل حدیث کا مسلک

اہل حدیث کے نزدیک خبر واحد میں جب صدق کے قرائن پائے جائیں یعنی حدیث

کی ثقاہت اور اتصال وغیرہ قرائن موجود ہوں تو وہ مفید علم ہو گی۔ وعند بعض اهل الحديث يوجب العلم لانه يوجب العمل ولا عمل الا عن علم۔

(تلویح ص۳۰۴)

عمل علم کی فرع ہے، جب علم ہی نہ ہو تو عمل کیسے ہوگا۔ اس لئے اہل حدیث کا مذہب ہے کہ خبر واحد سے علم اور یقین حاصل ہو گا۔ آمدی فرماتے ہیں :- والمختار حصول العلم بخبره اذا احتفت به القرائن ويمتنع ذالك عادة دون القرائن۔

(الاحکام للآمدی ج ۲ ص۵۰)

مختار مذہب یہی ہے کہ اگر قرائن موجود ہوں تو علم حاصل ہو گا ورنہ عادۃً منع ہے۔

اصول بزدوی ص۶۹۱ ج ۲۔ قال بعض اهل الحديث يوجب علم اليقين لما ذكرنا انه وجب العمل ولا عمل من غير علم وقد ورد الاحاد فى احكام الآخرة مثل عذاب القبر ورؤية الله تعالى بالابصار ولاحظ لذالك الا العلم۔

بعض اہل حدیث نے کہا کہ خبر واحد سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے، کیونکہ جب عمل واجب ہے۔ تو عمل علم کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے اور آحاد میں عذاب آخرت اور عذاب قبر اور رویت باری تعالیٰ کے متعلق جو کچھ وارد ہوا ہے اس کا مقصد علم اور اعتقاد ہی تو ہے۔

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ اعمال میں تو خبر واحد سے استدلال درست ہے مگر اصول اور عقائد میں استدلال درست نہیں۔ بزدوی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل حدیث کے نزدیک یہ تفریق درست نہیں، اہل حدیث اعمال اور عقائد دونوں میں خبر واحد کو حجت سمجھتے ہیں۔ ذهب اكثر اهل الحديث الى ان الاخبار التى حكم اهل الصنعة بصحتها توجب علم اليقين بطريق الضرورة وهو مذهب احمد بن حنبل (کشف الاسرار ص۶۹۱ ج ۲)

اہل حدیث اور امام احمد کا مذہب ہے کہ صحیح احادیث سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے
ابن قیم فرماتے ہیں جو لوگ خبر واحد سے علم کی نفی کرتے ہیں وہ معتزلہ اور بدعی فرقوں سے متأثر ہیں بعض فقہاء اور ائمہ اصول بھی ان سے متاثر ہیں لیکن سلف امت میں انکا کوئی پیشرو نہیں، ائمہ سنت امام شافعی، امام مالک، امام احمد، امام ابو حنیفہ رح اور ان کے تلامذہ امام داؤد، ابن حزم، حسین بن علی، کرابیسی وغیرہ نے فرمایا کہ خبر واحد سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔ امام احمد رح کے پاس کسی آدمی کا ذکر ہوا جو کہتا تھا کہ خبر واحد سے عمل واجب ہوتا ہے لیکن علم حاصل نہیں ہوتا۔ امام نے اسے ناپسند کیا اور فرمایا۔ "میں نہیں جانتا یہ کیا بلا ہے (صواعق ج ۲ ص ۳۶۲)

اس سے ظاہر ہے ائمہ اربعہ اور قدماء اس مسئلہ میں اہلحدیث کے ساتھ ہیں خبر واحد پر بدگمانی اس وقت پیدا ہوئی جب متکلین اور فلاسفہ نے اسلامی عقائد پر یورش کی اور متاخرین فقہاء اس سے متاثر ہو گئے۔

وجدان اور شعور علم اور یقین کا مسئلہ بہت حد تک وجدانی ہے۔ اس معاملہ میں صرف تعداد ہی نہیں، رجال کے اوصاف بھی مؤثر ہوتے ہیں، زہد و تقویٰ کی کمی کے باوجود جب ہم با اخلاق اور متدین آدمی سے کوئی خبر سن لیں تو ہم اپنے دل میں بہت زیادہ اطمینان محسوس کرتے ہیں، عامی یا غیر متدین آدمی متعدد بھی ہوں تو دل میں وہ یقین پیدا نہیں ہوتا مگر رواۃ کے اوصاف اور دوسرے قرآئن سے علم و یقین میں اضافہ ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ جماعت اسلامی کی قیادت نے عام فرقوں کی طرح خبر واحد کی ظنیت کا وظیفہ شروع فرما دیا، حالانکہ دینی جماعتوں کا طریق فکر، بدعی فرقوں سے مختلف ہونا چاہیئے۔ تعجب ہے جس جماعت کی دعوت اقامتِ دین ہو وہ رواۃ حدیث کا عام خبروں کے رواۃ سے موازنہ کرے اعتزال و تجہم کے مغالطہ سے متاثر ہو جائے اور پھر اس کا اظہار ایسے وقت میں کرے جب ملک میں اہل بدعت احادیث اور سنن کے خلاف ایک شور برپا کر رہے ہوں حالانکہ

اہلِ دیانت کی وجدانی کیفیت کو اہل دیانت ہی سمجھتے ہیں، اہل بدعت کے لئے اس کا سمجھنا مشکل ہے۔ ائمہ حدیث اس وجدان اور شعور کو اچھی طرح جانتے تھے انھوں نے اوصاف رواۃ اور موافق قرآن اور مخالف اثرات کو ذہن میں رکھ کر فرمایا:۔

والآحاد فی ھذا الباب قد تکون ظنونا بشروطھا فاذا قویت صارت علوما فاذا ضعفت صارت اوھاما وخیالات فاسدۃ (ابن تیمیہ بحوالہ صواعق ج ۲ صـ ۳۶۴)

اخبار آحاد کبھی ظنی ہوتی ہیں، کبھی علم و یقین کے مترادف اور کبھی اوہام اور فاسد خیالات۔

تلقی بالقبول امت کے قبول اور عمل سے کبھی حدیث یقین کے مقام پر پہنچ جاتی ہے حدیث[۱] انما الاعمال بالنیات، حدیث[۲] ذوق عیلہ، صدقہ[۳] فطر، حرمتِ[۴] نکاح مع العمہ والخالہ، حدیث[۵] حرمتِ رضاع مثل نسب، تعیینِ[۶] عشرہ مبشرہ وغیرہ احادیث کو امت نے عملاً قبول کر لیا ہے، ابن تیمیہ فرماتے ہیں ان سے متواتر ہی کی طرح یقین حاصل ہوتا ہے اما السلف فلم یکن بینھم فی ذالک نزاع (صـ ۳۷۳ ج ۲ صواعق) سلف میں اس کے متعلق کوئی نزاع نہ تھی۔

بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر امت متفق ہے اور انھیں تلقی بالقبول کا مقام حاصل ہوا ہے۔ ابن الصلاح فرماتے ہیں۔ لاتفاق الامۃ علی تلقی ما اتفقا علیہ بالقبول وھذا القسم جمیعہ مقطوع بصحتہ والعلم الیقینی النظری واقع بہ (ابن الصلاح صـ ۱۲) امت نے صحیحین کی متفقہ روایات کو اجماعاً قبول فرمایا ان احادیث کی صحت قطعی ہے، اس سے علم نظری اور یقینی حاصل ہوتا ہے۔ ہم مولانا اصلاحی کو قطعاً تکلیف نہیں دیتے کہ وہ ائمہ حدیث کو معصوم سمجھیں لیکن امت کی عصمت پر تو غور فرمانا چاہیئے۔ امت کی تلقی ائمہ حدیث اور اہل حدیث کے نزدیک بے حد مضبوط قرینہ ہے، تلقی بالقبول اور احادیث صحیحین

کے افادہ یقین کے متعلق دراسات اہل بیت میں نہایت نفیس اور مبسوط بحث موجود ہے جسے طوالت کی وجہ سے نظر انداز کیا جا رہا ہے اہل تحقیق کیلئے وہ بحث بہت مفید ہو گی۔

متاخرین میں مولانا سید انور شاہ رحمہ اللہ دقت نظر اور وسعت معلومات میں یگانۂ روزگار تھے، بخاری کے حاشیہ میں فرماتے ہیں:۔

حاصله انه يفيد القطع اذا احتف بالقرائن كخبر الصحيحين على الصحيح بيد انه يكون نظريا و نسب الى احمد ان اخبار الاحاد تفيد القطع مطلقا (ص۵۰۶ ج ۴ فیض الباری)

"حاصل یہ ہے کہ خبر واحد میں اگر قرائن موجود ہوں تو اس سے علم یقینی و نظری حاصل ہو گا۔ امام احمد سے منقول ہے کہ اس سے قطعیت کا فائدہ حاصل ہو گا"

دراصل یہ اختلاف قرائن کے قوت اور ضعف پر موقوف ہے۔

اس اختلاف کا پس منظر

انسان ماحول کا غلام ہے، معتزلہ اور ائمہ کلام اور دوسرے بدعتی گروہوں کا تعلق عموماً شاہی درباروں سے رہا۔ عباسی دربار تو ان مناظرہ بازیوں میں مشہور تھے وہاں یہ سب کچھ فتح و شکست اور دفتری اقتدار کے لئے ہوتا تھا۔ ان حالات میں سخن سازی غلط گوئی ہر چیز جائز سمجھی جاتی تھی تاکہ دربار میں اعزاز حاصل ہو۔ ایسے وقت میں پارٹی بازی لازمی ہے اور جھوٹ سے پرہیز ناممکن۔ فرد تو فرد ہے، جماعتیں غلط بیانی کرتی ہیں، اس ماحول میں خبر واحد پر اعتماد کون کرے اور کیوں کرے۔ اس معاملہ میں معتزلہ اور متکلمین معذور ہیں۔

ائمہ حدیث کی بے نیازی

ائمہ حدیث کا ماحول اس سے بالکل مختلف تھا درباروں سے بے نیاز، بادشاہوں سے نفرت، ہر چیز اللہ کی رضا اور خدمت دین کے لئے۔ ابن قیمؒ نے فرمایا:۔ كل احد يعلم ان

اهل الحدیث اصدق اهل الطوائف کما قال ابن المبارک وجدت الدین لاهل الحدیث والکلام للمعتزلۃ والکذب للرافضۃ والحیل لاهل الرای "سب جانتے ہیں کہ اہل حدیث بہت سچے ہیں۔ ابن مبارک نے فرمایا، دین اہل حدیث کے پاس ہے۔ باتیں بنانا معتزلہ کے پاس، جھوٹ روافض کی عادت اور اہل الرائے حیلوں کے عادی ہیں"۔

اس ماحول میں جہاں کوئی لالچ نہ ہو جھوٹ کیوں بولا جائے اور کون بولے؟ جو لوگ ان دونوں گروہوں کو برابر سمجھیں انھیں اس اختلاف میں تطبیق دینا مشکل ہوگا اور جو لوگ اس پس منظر کو سمجھتے ہیں، انھیں اس کے سمجھنے اور تطبیق دینے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ انسان جیسے ماحول میں رہے ان کی نفسیات اسی سانچے میں ڈھل جاتی ہیں، ولنعم ما قیل ع عن المرء لا تسئل وسل عن قرینہ۔

احادیث سے استفادہ

اس عنوان کے تحت ترجمان القرآن صفحہ ۱۴۰ سے صفحہ ۱۴۵ تک مولانا اصلاحی ایسے متین اور صاحب فکر کا قلم طنزیہ تعریضات کی طرف پھر گیا ہے۔ اگر مولانا یہ انداز اختیار نہ فرماتے تو ہم بھی محولنا کے ارشادات پر اور زیادہ غور کرتے، اپنے نقائص اور نارسائیوں کے متعلق ضرور سوچتے۔ اخبارات کے لب ولہجہ سے جو خلش مولانا کے ذہن میں تھی اس کا انتقام جماعت اور مسلک سے لینے کی کوشش فرمائی گئی۔ عفا اللہ عنا وعنہ۔

ماخذ میں غلو اور تحزب

جہاں تک ہمیں اپنے حالات کا علم ہے اپنی کمزوریوں کے اعتراف کے باوجود ذہن بحمد اللہ بالکل صاف ہے، نہ کسی ماخذ کے لئے غلو ہے نہ تعصب، البتہ اپنے اسلاف کے کارناموں کا احترام ضرور ذہن میں ہے اسے تعصب سے تعبیر فرمائیے یا غلو سے، آپ اور آپ کے رفقاء مختار ہیں، یہاں نہ "تحزب" ہے نہ "تشیع"، نہ "یک چشمی"۔ تمام ماخذ کو ان کی ترتیب ہی کے لحاظ سے مانتے ہیں، البتہ مقاصد کو ضرور پیش نظر رکھتے ہیں یہی وجہ ہے

ہمارے ہاں تفقہ، درایت اور قیاس کا اپنی جگہ پر پورا پورا احترام ہے لیکن سنن صحیحہ کو گو وہ آحاد ہی کیوں نہ ہوں، ہم ان حیلوں اور الفاظ کے ہیرا پھیری سے رد کرنا پسند نہیں کرتے، اعمال رجال خواہ وہ مدینہ میں ہوں یا خراسان میں، کوفہ میں ہوں یا شام میں، سنت صحیحہ کے ہم پایہ نہیں ہو سکتے۔ ہمارے ہاں اس وہم کی کوئی قیمت نہیں کہ فلاں شخص چونکہ مدینہ میں مقیم ہے اس لئے اس کے اعمال سنت ہیں، بلکہ ان سے سنت صحیح کو رد بھی کیا جا سکتا ہے، ہم بحمد اللہ مراتب کا احترام کرتے ہیں اور جناب کی نصیحت سے بہت پہلے یہ احترام موجود ہے۔ شاہ صاحب اور خطابی نے جمع حدیث کے متعلق جو شکوہ فرمایا ہے وہ اپنی جگہ پر درست ہے، سیوطی ہیثمی، ابن ابی الدنیا، طبرانی، دیلمی وغیرہ نے جس طرح احادیث جمع فرمائی ہیں اس سے واقعی اہل حدیث کے مسلک اور سلف کی روش کو نقصان پہنچا ہے، اہل بدعت بلا تحقیق ان ذخائر سے استدلال کرتے ہیں، لیکن اس میں بھی فن کے لئے کوئی عصبیت نہیں، سیوطی، ہیثمی وغیرہ پر عصبیت کی بدگمانی نہیں کی جا سکتی۔ طریقۂ تصنیف کی ایک لغزش ہے، یہ حضرات خود بھی اسکے قائل نہیں کہ ان تصانیف میں جو کچھ جمع کیا گیا وہ سب مستند اور قابلِ عمل ہے۔ مولانا اطمینان رکھیں کہ ہمارے ہاں یہ عیب نہیں۔

جناب کے ہاں دو تین ایسے بزرگ موجود ہیں جنھوں نے اہل حدیث کے ہاں تعلیم پائی ہے، ان سے دریافت فرمائیے کہ جماعت اسلامی میں شمولیت سے پہلے کبھی انھوں نے اندھا دھند احادیث کو بلا تحقیق قبول فرمایا؟ یا موضوع اور مقلوب روایات کو قابلِ عمل سمجھا؟ اب اگر جماعتی عصبیت ان کے اذہان پر غالب نہیں آ گئی تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ اہل حدیث میں بحمد اللہ یہ دھاندلی نہیں ہے بلکہ ائمہ جرح و تعدیل اور اہل نقد و نظر کے افکار سے استفادہ یہاں کا شعار رہے۔

اول تو ہم قرآن اور حدیث، قرآن اور عقل سلیم میں تعارض کے قائل ہی نہیں لیکن اگر بظاہر کہیں تعارض محسوس ہو تو اصول کی حد تک یقیناً یہی بات ہے کہ حدیث کا درجہ

قرآنِ عزیز کے بعد ہی ہونا چاہیئے۔ اصولِ حدیث میں تطبیق، ترجیح، توقف کی ساری صورتیں موجود ہیں۔ کما فصل فی موضعہ۔

ہاں استدلال اور اخذ مسائل کے وقت ہمارے نزدیک حدیث وحی ہے اور اس کا اسی طرح آنحضرتؐ کو علم دیا گیا جیسے قرآن کا۔ آنحضرتؐ نے قرآن کے الفاظ ہم تک پہنچائے اور احادیث کا مفہوم، اور ہمارا ایمان ہے کہ آنحضرتؐ نے اس باب میں پوری امانت اور صحیح دیانت سے کام لیا ہے۔ یہی حال صحابہؓ کا تھا، ہمیں ان کے علم و دیانت پر پورا الیقین ہے۔ عن حسان ابن عطیۃ کان جبریل ینزل بالقرآن والسنۃ ویعلمہ ایاھا کما یعلمہ القرآن (صواعق ص۳۴۴ ج ۲۔ شاطبی جامع بیان العلم ابن عبد البر) "جبریل قرآن اور سنت دونوں کو لے کر نازل ہوتے آنحضرت کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے" اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔ قرآن اور حدیث دونوں مآخذ ہیں اور بیک وقت ماخذ ہیں۔ اسی لحاظ سے آنحضرت نے فرمایا:- اوتیت القرآن ومثلہ معہ۔ حلت وحرمت اور بعض دوسرے مسائل میں سنت کو جو مستقل حیثیت حاصل ہے اس پر ہمیں پورا الیقین ہے اس مقام پر جناب کا یہ ارشاد بالکل مجمل ہے:-

"دین میں ان (احادیث) کی اصلی جگہ قرآن کے بعد ہے نہ کہ اس سے پہلے یا اس کے برابر، اگر کوئی شخص یہ ترتیب الٹ کر ان کو قرآن سے پہلے کر دے یا قرآن کے برابر کر دے تو وہ اسی غلو میں مبتلا ہو جائے گا جس میں اہل ظاہر مبتلا ہوئے جنھوں نے ہر حدیث کو حدیث متواتر بنا کے رکھ دیا"

اس چیستان کی تشریح فرمائیے۔ ہماری نظر میں تو کوئی ایسا آدمی نہیں "جو حدیث ہی کو سب کچھ سمجھے، قرآن اور اجتہاد کو نظر انداز کر دے" (ترجمان ص۱۴۱) نہ ہم نے کوئی ایسا آدمی دیکھا جو تعارض کے وقت یا طریقۂ ثبوت کے لحاظ سے حدیث کو قرآن سے مقدم سمجھے، نہ کوئی ایسا آدمی ملا جو ہر حدیث کو متواتر سمجھے، اہل ظاہر سے ابن حزم

کی کتابیں اہل علم کی نظر میں ہیں۔ محلیٰ چھپ چکی، الاحکام بازار میں موجود، جمہرۃ الانساب ملتی ہے۔ ہمیں تو ان دعاوی کی صداقت مشتبہ معلوم ہوتی ہے اور بیچارے اہل ظاہر پر یہ کھلی تہمت ہے مولانا ایسے متین آدمی کے قلم سے ایسے الفاظ نہ نکلتے تو بہتر ہوتا۔ وہ قیاس کے سوا باقی تمام ماخذ کو مانتے ہیں۔

غایت یہی ہے کہ بعض ناموں سے کسی خاص طریق فکر کے ساتھ تعلق اور ایک مسلک کے ساتھ ربط معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص جماعت اسلامی میں داخل ہوتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ شخص مولانا مودودی کی قیادت کو موجود قیادتوں سے بہتر سمجھتا ہے۔ ان پر اسے زیادہ اعتماد ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوگا کہ وہ مولانا مودودی کو آنحضرتؐ یا صحابہؓ یا ائمہؒ پر ترجیح دیتا ہے، اسی طرح ایک اہلحدیث کے متعلق یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ حنفی یا شافعی طریق فکر کی بجائے ائمہ حدیث کے طریق فکر کو ترجیح دیتا ہے۔ عملی زندگی میں ائمہ حدیث پر اعتماد کرتا ہے مگر یہ بدگمانی کیوں کی جائے کہ وہ حدیث ہی کو حجت سمجھتا اور قرآن اور اجتہاد کو نظر انداز کرتا ہے۔ ان صفحات میں مولانا کا طریق بحث بہت دلخراش ہے۔ اور ثقاہت سے گرا ہوا ہمیں متانت اور سنجیدگی سے شکوہ ہے کہ اس نے مولانا کا ساتھ کیوں چھوڑ دیا۔

دوسری شرط استفادہ کی دوسری شرط میں مولانا نے فرمایا ہے کہ "آنحضرتؐ کے بعد کسی کو معصوم نہ سمجھے" (ترجمان ص۱۴۳) یا اللہ ایسا کس نے کہا؟ کب کہا؟ کیسے کہا؟ واقعہ صرف اس قدر ہے کہ ائمہ حدیث نے تنقید حدیث کے متعلق صدیوں محنت فرمائی۔ احادیث کی صحت، ضعف، حسن، ارسال، انقطاع شاذ اور مقبول کے متعلق کچھ عقلی، کچھ لغوی اور عرفی فیصلے فرمائے، ان فیصلوں کو صدیوں سے اہل علم قبول فرما رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کی بلاوجہ مخالفت نہ کی جائے۔ اگر اختلاف ہو تو دلیل سے کیا جائے۔ اہلِ فن کے فیصلوں کی روشنی میں کیا جائے

اس کا نام عصمت نہیں، اس بدگمانی کے لئے ائمہ حدیث میں کوئی گنجائش نہیں، پورے وثوق اور پوری ذمہ داری سے گذارش ہے کہ آنحضرت صلعم کے بعد کسی کے متعلق عصمت کا خیال تک نہیں محدثین بھی انسان ہیں اور جماعت اسلامی کی قیادت بھی انسان۔ البتہ اسی تعصب سے اختلاف ہے کہ ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا "رسول کا مزاج شناس"، تصور کرلے، پھر اسے اختیار دے دے کہ اصول محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کرے، جسے چاہے رد کردے یا کوئی عالم قائد بلا وجہ کسی موضوع یا مختلق، مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعویٰ کردے کہ میں نے اس میں "ہیرے کی جوت دیکھ لی ہے۔" یہ مضحکہ خیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم ان شاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنت رسول صلعم کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔

ہمیں معلوم ہے، ہیرا ملے یا اس کی جوت، یہ صرف وہی جوہری جان سکتے ہیں جن کا اوڑھنا بچھونا سنت ہے اور جن کا شب روز کا مشغلہ سنت ہے۔ مزاج شناسی بھی انہی کا حصہ ہے۔ مولانا فرمائیں متعصب وہ لوگ ہیں جو قواعد اور اصول کا احترام کرتے ہیں یا وہ حضرات جو مفت میں جوہری بن جائیں یا ان کے دوست انھیں مزاج شناس رسول صلعم بنا دیں۔ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ۔

یہ فن کی قدر اور ہنر کے احترام کا مسئلہ ہے، اس میں عصمت کی کوئی بات نہیں یہ ترجمانی غلط ہے اور بالکل غلط ــــــ اور انتقامی جذبہ کی پیداوار۔ مولانا نے اس مقام پر اہل فن کے متعلق جن شبہات کا اظہار فرمایا ہے، اخبار آحاد کے خلاف جو احتمالات پیدا کئے اور انسانی فہم میں جن غلط فہمیوں کی نشاندہی فرمائی ہے اسے ممکن سمجھنے کے بعد عرض ہے کہ جو لوگ آج صدیوں کے بعد ان اغلاط پر مواخذہ کریں گے، ان اغلاط اور

غلط فہمیوں کی ڈھیر لگائیں گے۔ آیا مولانا اور ان کے رفقاء ان کے متعلق عصمت کا دعوی کر سکتے ہیں؟ وہ یقین فرما سکتے ہیں کہ ان مواخذات میں کوئی لغزش نہیں؟ یقیناً آپ ایسا فرمائیں گے تو خدارا بتایا جائے کہ آپ ظن کو صدیوں کے ظن سے ٹکرا کر ایک ظنی نتیجہ پر پہنچتے ہیں اور اسے "ہیرے کی جوت"، یا "رسول کی مزاج شناسی" سے تعبیر فرماتے ہیں لیکن اگر اصحابِ وقت کے بروقت فیصلے اور صدیوں کی محنت کے نتائج پر اعتماد کیا جائے تو اس کا نام آپ کی اصطلاح میں عصمت کا دعویٰ ہے مالکم کیف تحکمون۔ متقدمین ائمہ کی تنقید اور دلائل پر کوئی یقین کرے تو اس پر عصمت کی پھبتی اور آج اپنی معلومات کی روشنی میں صدیوں بعد کوئی ظنی فیصلہ ان قانونی فیصلوں کے خلاف آپ کریں تو اس کا نام ہیرے کی جوت۔ یہ جرأتیں آپ پر تنقید کرنے والوں کے لئے بدگمانی کی راہ کھولتی ہیں ؎

فاحفظ وقیت فتحت قدملھوۃ

کم قد ھوی فیھا من الانسان

وقت کی ضرورت ایسے وقت میں جب حدیث اور سنت کے خلاف لادینی حلقوں میں ایک طوفان بپا ہے، اس قسم کی کمزور اور بے اصل باتیں کرنا مناسب نہیں۔ یہ وقت باہم خطابات کی تقسیم کا نہیں اور نہ ہی بحث سے اس طرح پہلوتہی کرنا اس وقت قرینِ مصلحت ہے۔ یہ معذرت کا انداز اور چور دروازوں کی طرف رہنمائی نہ حدیث کی خدمت ہے نہ سنت کی حمایت۔ پچھلے دنوں مولانا مودودی کی ایک دو بے محل تقریروں سے اخبارات میں کچھ ہنگامہ ہوا تو ہمارے بعض "اہل حدیث"، دوست جواب جماعت اسلامی کے ہو چکے ہیں، مولانا کے نظریہ کی دیانۃً کھلی حمایت تو نہ کر سکے مگر اس طرح پردہ پوشی فرمائی کہ "پہلے علماء میں بھی بعض ایسا کہتے تھے"، بعض حضرات "مزاج شناسی" کے حوالوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، حالانکہ مناسب یہ تھا کہ مسلکِ اعتدال، ایسی تحریروں سے مولانا کو بھی

رد کا جاتا۔ جماعتی تعلقات کا احترام بے شک کیا جائے لیکن حق کا احترام اور سنت کی حمایت وقت کی شدید ترین ضرورت ہے جسے کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں ہونا چاہیئے۔ دنیا میں اسلامی نظام بپا ہونے کی بھی صرف یہی صورت ہے کہ سنت پر جس محاذ پر حملہ ہو، دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مدافعت کی جائے۔ اپنی انصاف پسندی اور وسعتِ ظرف کے ثبوت میں معذرت کا انداز ضرورتِ وقت کے بالکل خلاف ہے۔ خود مولانا کو بھی ایسے خوشامد پسند حضرات سے بچنا چاہیئے جن کو صرف یہی فکر ہو کہ ان کی وفاداری مشتبہ نہ ہو جائے۔

رواۃ کی عصمت راوی نہ معصوم ہیں نہ آج تک کسی نے ان کی عصمت کا دعویٰ کیا، نہ ایسا ممکن ہے، البتہ مجموعی لحاظ سے فن حدیث پر عصمت کا ظن غالب ہے۔ جس طرح حفاظ کو اللہ تعالیٰ نے توفیق عنایت فرمائی کہ وہ قرآن کو محفوظ رکھ سکیں، یعنی ہر حافظ معصوم نہیں، لیکن قرآن کے حفظ کی اللہ تعالیٰ نے انکو توفیق دی، اسی طرح حفاظِ حدیث کو اللہ تعالیٰ نے توفیق مرحمت فرمائی کہ وہ اس کی حفاظت فرما سکیں۔ اجماع امت میں ہر فرد معصوم نہیں لیکن بحیثیت مجموعی اجماع میں مجتہدین کو عصمت کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ تلقی بالقبول میں بھی یہی صورت ہے اگر حدیث دین ہے تو اس کی حفاظت کا ذمہ دار حق تعالیٰ کو ہونا چاہیئے، یہ حفاظت حفاظ حدیث ہی کی معرفت سے ہوئی ہے، اس لئے مجموعی حفاظت اور اجتماعی عصمت سے ان کو یقیناً حصہ ملا ہے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ اگر اس سے کوئی چیز ضائع ہو چکی ہے تو اس کی ضرورت نہ تھی اور جس چیز کی ضرورت تھی اسے محفوظ رکھنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے ائمہ حدیث کو عطا فرمائی۔ ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

حدیث کو تنقیدی نگاہ سے پڑھنے کا مطلب اس عنوان کے تحت مولانا نے فرمایا ہے کہ ہر حدیث پر

تنقید ضروری نہیں "تنقید کی ضرورت وہاں پیش آتی ہے جہاں کوئی ایسی حدیث آ جاتی ہے جو سنتے ہی طبیعت کو کھٹکتی ہے جو دین کے مسلمات اور شریعت کے معروفات کے خلاف معلوم ہوتی ہے جس کو عقل عام قبول کرنے سے اول وہلہ میں ابار کرتی ہے الخ اس ضمن میں مثال کے طور پر مولانا نے تین احادیث کا ذکر فرمایا ہے (حضرت ابراہیمؑ کے تین مرتبہ جھوٹ بولنے کی روایت۔ آنحضرتﷺ صلے اللہ علیہ وسلم کے قرآن کی آیات کے ساتھ تلك الغرانيق العلى کے الفاظ پڑھ دینے کی روایت، یا حضرت موسیٰؑ کے ملک الموت کو تھپڑ مارنے کی روایت)

مولانا نے جو فرمایا ایک حد تک مناسب ہے لیکن مولانا ہر ناپسندیدہ مقام پر بچارے اہل ظاہر کا ذکر فرما دیتے ہیں، شاید اس لئے کہ اس طریقِ فکر کا ہمارے ملک میں کوئی موید نہیں۔ جہاں تک اہل ظاہر کی کتابوں کا تعلق ہے ان میں یہ چیز موجود نہیں جیسے مولانا اہل ظاہر کی طرف منسوب فرما رہے ہیں۔ اہل ظاہر سے بعض مقامات پر لغزش ہوئی ہے لیکن وہ اتنے گئے گذرے نہیں جس طرح جناب کے ارشاد سے ظاہر ہوتا ہے ظاہری سکول فکر کے دو بزرگ عام طور پر مشہور ہیں۔ ابن حزم اندلسی اور امام داؤد ظاہری۔ یہ لوگ قیاس کو حجت شرعی تو بے شک نہیں جانتے لیکن حدیث میں ان کا مقام ہم ایسے مدعیانِ علم وعقل سے کہیں بلند ہے۔ اس انداز تنقید سے احتیاط مناسب ہے جو مولانا اصلاحی نے اختیار فرمایا ہے۔

تین احادیث

جن تین احادیث کے متعلق مولانا نے فرمایا ہے کہ عقلِ عام ان کو قبول کرنے سے ابار کرتی ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ ایسی مثالیں ذکر کرنے کی بجائے مولانا اپنے رفقاء سے مشورہ فرما کر ایک ایسا مجموعہ شائع کر دیتے جس میں وہ تمام احادیث جمع کر دی جاتیں جو مولانا کی طبیعت کو کھٹکتی ہیں یا عقل عام ان کو قبول کرنے سے ابار کرتی ہے تاکہ کم عقل لوگ اندازہ کر سکتے کہ ایسی احادیث کی مقدار کتنی ہے اور کس کس عقلمند کی عقل کو یہ احادیث کھٹکتی ہیں؟ ممکن ہے

کسی کی سمجھ میں کچھ آتا تو وہ آپ سے کچھ عرض کر سکتا۔ عقل اور احادیث میں جب بھی جنگ بپا کرنے کی کوشش کی گئی، اہل علم نے تطبیق کی صورت پیدا کر دی اور باہم صلح ہو گئی اعلام الموقعین، تاویل مختلف الحدیث یا مشکل الآثار ایسی کتابیں ان شبہات کے پیش نظر لکھی گئیں اور اپنے وقت میں بہت حد تک کامیاب ثابت ہوئیں۔

مولانا نے جن احادیث کا مثال کے طور پر ذکر فرمایا ہے ان کے متعلق مختصراً گذارش مناسب معلوم ہوتی ہے۔ حدیثِ غرانیق باتفاق محدثین، اصول محدثین کے مطابق ساقط الاعتبار ہے اور جن الفاظ سے ائمہ حدیث نے اسے قابلِ استناد سمجھا ہے وہ نہ طبیعت کو کھٹکتی ہے نہ عقلِ عام اس سے ابا کرتی ہے۔ معاریض ابراہیم علیہ السلام کی روایت اکثر کتب حدیث میں مروی ہے، اس کی سند اصولِ محدثین کے مطابق صحیح ہے۔ ائمہ حدیث سے فنی طور پر کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔

(الف) تعجب ہے ائمہ حدیث میں سے یہ حدیث نہ کسی کی طبیعت کو کھٹکی نہ انکی "عقلِ عام" نے اس سے ابا کیا۔

(ب) متقدمین فقہاءِ سنت سے بھی کسی نے اس پر اشتباہ کا اظہار نہیں کیا غالباً امام رازی پہلے آدمی ہیں جن کے مزاج پر یہ حدیث گراں گذری اور انھوں نے دبے لفظوں میں اس کے انکار کی کوشش کی، لیکن امام نے اس چیز پر غور نہیں فرمایا کہ ان رواۃ سے اور بھی بہت سی روایات مروی ہیں بنا بریں جس عیب کی بنا پر اسے رد کیا جائے گا اس کا اثر باقی احادیث پر بھی پڑے گا۔ اس لئے یہ رد نتائج کے لحاظ سے آسان نہیں۔

(ج) ابن قتیبہ (۲۷۶ھ) نے ابراہیم بن سیار نظّام جیسے معتزلی کے شبہات کا ذکر کیا ہے۔ نظام کہتے ہیں کہ اکابر صحابہ نے (حذیفہ بن یمان) حضرت عثمان کے پاس جھوٹ بولا۔ ابن قتیبہ فرماتے ہیں کہ تعریضِ توریہ ہے اور بعض اوقات جھوٹ کی بھی اجازت ہے۔ اس ضمن میں الزام کے طور پر انھوں نے ابراہیم علیہ السلام کی ان معاریض کا

ذکر فرمایا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظام ایسے غالی معتزلی کو بھی اس وقت اس حدیث پر اعتراض نہ تھا۔ نہ ہی یہ اس کی عقل کو کھٹکتی تھی (تاویل مختلف الحدیث ص ۴۲-۵۳)

(د) معتزلہ اور متکلمین عقل کی پرستش اصول اور عقائد کے مسائل میں کرتے تھے اور صفاتِ باری کے مباحث میں سنت ان کی عقول پر گراں گذرتی تھی مگر فروع میں ان کی عقلوں سے اس احساس کا دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ مسائل بھی ظنی ہیں ان پر ظنی دلائل سے استدلال صحیح ہے۔ آج کے عقل پرست حضرات نہ اصول میں حدیث کو معاف فرماتے ہیں نہ فروع میں۔ عقول پر یہ ابار یا کھٹکا دراصل موسم کی بات ہے۔

(ﮦ) فقہاء حدیث اور ائمہ اور شراحِ حدیث اس امر پر قریباً متفق ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے جھوٹ نہیں بولا۔ قرآن و سنت صراحۃً اس پر شاہد ہیں کہ یہ جو کچھ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا تعریض اور توریہ کے طور پر فرمایا اور یہ طریقہ گفتگو ادبیات کی جان ہے، دینی، سیاسی، کاروباری طبقے سب اس کا کھلے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ حافظ ابن قیمؒ نے جس اختصار اور سنجیدگی سے اس کا تذکرہ فرمایا ہے اہل تحقیق کے لئے اس میں تسکین کا سامان موجود ہے۔ فان قیل کیف سماھا ابراھیم کذبات وھی توریۃ وتعریض صحیح.... وقد فتح اللہ الکریم بالجواب عنہ۔ فنقول الکلام لہ نسبتان نسبۃ الی المتکلم وقصدہ وارادتہ ونسبۃ الی السامع وافھام المتکلم ایاہ مضمونہ۔ فاذا اخبر المتکلم بخبر مطابق للواقع وقصد افھام المخاطب ایاہ فھو صدق بالنسبتین فان المتکلم ان قصد الواقع وقصد افھام المخاطب فھو صدق من الجھتین وان قصد خلاف الواقع وقصد مع ذالک افھام المخاطب خلاف ماقصد بل معنی ثالثا لاھو الواقع ولاھو المراد فھو کذب من الجھتین بالنسبتین معًا وان قصد معنی مطابقا صحیحا وقصد مع ذالک التعمیۃ علی المخاطب وافھامہ خلاف ماقصدہ فھو صدق بالنسبۃ الی قصدہ

کذب بالنسبة إلى افهامه ومن هذا الباب التورية والمعاريض۔ و بهذا السلك عليها ابراهيم الخليل صلے اللہ علیه وسلم اسم الكذب مع انه الصادق فى خبره ولم يخبر الا صدقا فتامل الخ۔

(مفتاح دارالسعادة ص ۳۹ ج ۲)

امام کا مطلب یہ ہے کہ سچ اور جھوٹ کی تشخیص میں نفس الامر اور متکلم کے قصد اور ارادہ کو بھی دخل ہے اس لحاظ سے اس کی تین صورتیں ہوں گی ۔متکلم صحیح اور واقع کے مطابق کہے اور مخاطب کو وہی سمجھانا چاہیئے جو فی الحقیقت ہے ۔یہ دونوں لحاظ (واقعہ اور ارادہ) سے سچ ہے اور اگر متکلم خلافِ واقعہ کہے اور مخاطب کو اپنے مقصد سے آگاہ نہ کرنا چاہیئے ۔بلکہ ایک تیسری صورت پیدا کر دے جو نہ صحیح ہو نہ ہی متکلم کا مطلب اور مراد ہو ،یہ دونوں لحاظ سے جھوٹ ہوگا لیکن اگر متکلم صحیح اور نفس الامر کے مطابق گفتگو کرے لیکن مخاطب کو اندھیرے میں رکھنا چاہے اور اپنے مقصد کو اس پر ظاہر نہ ہونے دے اسے تعریض اور توریہ کہا جاتا ہے ۔یہ متکلم کے لحاظ سے صدق ہے اور تفہیم کے لحاظ سے کذب ہے ۔اسی لئے حضرت ابراہیمؑ نے اسے کذب سے تعبیر کیا ۔درآں حالیکہ حضرت ابراہیمؑ نے جو کچھ فرمایا وہ حقیقت میں صحیح تھا ۔شناعتِ عامہ سے بچنے کے لئے یہی مناسب تھا۔ نامناسب نہ ہوگا ،یہاں اگر حافظ ابن قیم کے استاد شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی بھی "صدق و کذبِ خبر" سے متعلق نفیس تحقیق پیش کر دی جائے ۔

الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح ص ۲۸۸ ج ۴ میں فرماتے ہیں ۔

والخبر تارة يكون مطابقا لمخبره كالصدق المعلوم انه صدق وتارة لا يكون مطابقا لمخبره كالكذب المعلوم انه كذب وقد تكون المطابقة فى عناية المتكلم وقد لا يكون فى افهام المخاطب واذا كان اللفظ مطابقا لما عناه المتكلم ولم يطابق افهام المخاطب فهذا ايضا قد يسمى كذبا وقد لا يسمى ومنه المعاريض لكن يباح للحاجة ۔ ملخصًا ۔

(د) بعض اہلِ علم نے دوسری راہ بھی اختیار فرمائی ہے، ان کا خیال ہے کہ کذب ہر حال میں حرام نہیں۔ بسا اوقات ضرورۃً شارع نے اس کی اجازت دی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا لیس الکاذب الذی یصلح بین الناس (ترمذی) احادیث میں بعض مصالح کا صراحۃً بھی ذکر آیا ہے۔ ابن حزم کا رجحان الفصل میں اسی طرف ہے۔ نئے لوگوں میں سے حسن احمد الخطیب نے "فقہ الاسلام" میں اس مسلک کا ذکر فرمایا ہے:

ومن ذالك اباحتهم الكذب اذا ترتب على الصدق مفسدة عظيمة وقد فصل الحموی فی الاشباه الكلام فی ذالك فقال ماخلاصته ان الكذب يجوز فی ثلثة مواضع فی الاصلاح بين الناس فی الحرب و على الزوجة لاصلاحها الخ ويراد بذالك استعمال المعاريض لا الكذب الصريح ونقل ان الكذب يباح لاحياء حق الخ (ص۲۳)

کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں جب انسان پوری صداقت کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اس کے اظہار پر اصرار کرے تو اس کی راہ میں مزید مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں جن میں دیانت کو نقصان پہنچ سکتا ہے جس کا قائم رکھنا ضروری ہے۔ اپنے ذاتی مقاصد کے لئے تو واقعی اس رخصت سے استفادہ معصیت ہے لیکن دینی اور ملی ضرورتوں کے لئے یہ گنجائش ناگزیر ہے۔ اذا ابتلی احدکم ببلیتین فلیختر اھونھما میں بھی یہی اصل کار فرما ہے۔

(س) تعریضات کی راہ زندگی کا ایسا لازمہ ہے کہ اس سے بچنا سخت مشکل ہے۔ آپ اپنا یہی مضمون ملاحظہ فرمائیے۔ آپ نے سوال ۱ کا جواب دیتے ہوئے معذرت فرمائی ہے کہ "جماعت اسلامی سنت کی کیوں اب تک کوئی نمایاں خدمت نہیں کر سکی؟" جماعت کا کام بہت آگے بڑھ جاتا لیکن جو حضرات اپنے آپ کو حدیث کی خدمت کا ٹھیکے دار سمجھے ہوئے ہیں، ان کو یہ غم کھانے لگا کہ اگر جماعت نے یہ کام سنبھال لیا تو پھر وہ کس چیز کا نام لے کر کچھ لوگوں کو اپنے ارد گرد جمع رکھ سکیں گے۔

مولانا کی تعریض

مولانا! اس سے قطع نظر کہ آپ ایسے متین اور عالم آدمی کے لئے یہ طعن و تشنیع کا انداز مناسب ہے یا نہیں، یہ تو جناب کو بھی معلوم ہے اور ہم بھی جانتے ہیں کہ اس ملک میں حدیث کی خدمت کا کوئی ٹھیکہ نہیں۔ جس چیز کو آپ مخاطب سے چھپانا چاہتے ہیں وہ اہم اور نمایاں خدمات ہیں جو کتاب و سنت کی اشاعت میں جماعت اہل حدیث سے ظاہر ہوئیں۔ دروس، مکاتب اور مطابع کے ذریعہ لاکھوں آدمی قرآن اور حدیث کے فیضان سے مستفیض ہوئے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جماعت اسلامی اس راہ میں لفاظی کے سوا کچھ نہیں کر سکی۔ لیکن آپ سائل کے سامنے یہ ظاہر کرنا پسند نہیں فرماتے بلکہ اسے اندھیرے میں رکھنے کے لئے "ٹھیکیدار" کی تعریض اختیار فرمائی ہے میں تو اسے تعریض ہی کہوں گا۔ لیکن اگر آپ میں جرأت ہے تو حضرت ابراہیم کی طرح اعتراف فرمائیے کہ میں نے جھوٹ بولا ہے۔ تفنن برطرف تعریضات سے اعراض فرما کر انکار حدیث کے لئے چور دروازے بنانے کی جرأت نہ پیدا کیجئے۔ آپ ایسے اہلِ علم بزرگوں کو جب آپ کے اتباع یہ حیلے بناتے دیکھیں گے تو ان کی جرأتیں اور بڑھ جائیں گی۔

ع زنند لشکریانش ہزار مرغ بہ سیخ

ختم نبوت کی تحریک میں آپ حضرات کا موقف عقلِ عام کی رسائی سے بالا تھا آپ کے بیانات سب اسی نوعیت کے تھے۔ لوگ انھیں جھوٹ دھوکہ کہتے ہیں۔ معلوم ہے کہ عوام کے سامنے اپنی جماعت کو بچانے اور لغزشوں کو چھپانے کے لئے یہ تعریضی بیانات دینے کے لئے آپ مجبور تھے۔ "عقل عام" کے تقاضے جب عقلِ عوام سے ٹکرانے لگیں تو مشکلات سے مخلصی کے لئے تعریضات کی راہ کھلی رہنی چاہیئے اور اگر اسے خیالی تصوف اور تصوری زہد و ورع سے روکا گیا تو زندگی میں ایک ایسا خلا نمودار ہوگا جسے پاٹنا ناممکن ہوگا۔

ہجرت کے سفر میں حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرتؐ کے متعلق یہ تعریض فرما کر "ساجل

یهدینی السبیل " دانش مندی کی انتہا کردی اور زبان اور ادب میں ایک مفید اضافہ فرمایا۔ آپ حضرات بھی عجیب ہیں، ایک طرف تو چاہتے ہیں کہ لوگ کھلے ذہن سے سوچیں لیکن جب سوچنے کا وقت آجاتا ہے تو آپ پر مصنوعی تصوف کا حملہ ہو جاتا ہے اور آپ عقلِ عام کی گود میں پناہ لیتے ہیں اور دوسروں پر طعن فرمانا شروع کر دیتے ہیں۔

(ح) میرا ذاتی تجربہ معاریضِ ابراہیمیؑ کے متعلق یہ ہے کہ جب تک بچپن غالب تھا اور عقل ناتمام تھی، کذب کا نام سن کر تشویش ہوتی تھی۔ اساتذہ اور رفقاء سے بحث ہوتی رہی لیکن جب تک تجربہ کی زندگی میں قدم رکھا۔ عمل نے تمام شبہات دور کر دیئے تعریض اور توریہ کو عملی دنیا کے ماحول پر محیط پایا۔ یہی وجہ ہے کہ انبیا نے بوقت ضرورت اسے استعمال فرمایا، صلحاء کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پس ہماری "عقل عام" کو تو اس حدیث سے کوئی کھٹکا محسوس نہیں ہوتا، بلکہ دین کی تکمیل پر مزید یقین ہوتا ہے کہ اس میں اس زاویہ کے لئے بھی رہنمائی کا سامان موجود ہے۔

حضرت موسیٰ کا تھپڑ

اس عنوان پر کچھ عرض کرنے سے قبل مولانا اور ان جیسے "محققین" کی خدمت میں گذارش ہے کہ یہ مسئلہ بھی کچھ آج نہیں چھڑا، تیسری صدی ہجری میں "درایت" کے ہیرو حضرات معتزلہ اس حدیث کو بھی مشکوک بنانے کی کوشش میں مصروف تھے اور حدیث پاک کے محافظ اللہ تعالیٰ نے محدثین کو توفیق دی کہ وہ اس حدیث کا صحیح مطلب بتا کر ان لوگوں کے دانت کھٹے کر دیں۔ چنانچہ اس زمانے کے جن محدثین نے اس حدیث کا جواب دیا، ان میں مشہور محدث حافظ ابو حاتم محمد بن حبان (المتوفی ۳۵۴ھ) بھی ہیں۔ آپ نے اپنی صحیح میں یہ عنوان قائم کیا ہے: "ذکر خبر شنع به علی منتحلی سنن المصطفیٰ صلی اللہ علیه وسلم من حرم التوفیق لادراك معناه" یعنی اس حدیث کا ذکر جس کو ان لوگوں نے جو اس کے معنی کی حقیقت تک پہنچنے سے محروم ہیں۔ محدثین پر طعن کا ذریعہ بنا لیا ہے۔

پھر حضرت موسیٰؑ کے اسی لطمہ والی حدیث کو ذکر کرکے لکھتے ہیں:

ان اللہ جل وعلا بعث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم معلما لخلقہ، فانزلہ موضع الابانۃ عن مرادہ فبلغ صلے اللہ علیہ وسلم رسالتہ وبین عن اٰیاتہ بالفاظ مجملۃ ومفسرۃ عقلھا عنہ اصحابہ او بعضھم وھذا الخبر من الاخبار التی یدرک معناہ من لم یحرم التوفیق لاصابۃ الحق، وذالک ان اللہ جل وعلا ارسل ملک الموت الی موسیٰ رسالۃ ابتلاء واختبار وامرہ ان یقول لہ: اجب ربک - امر اختبار وابتلاء لامر یرید اللہ جل وعلا امضاءہ کما امر خلیلہ صلے اللہ علیٰ نبینا وعلیہ ، بذبح ابنہ امر اختبار وابتلاء دون الامر الذی اراد اللہ جل وعلا امضاءہ فلما عزم علی ذبح ابنہ وتلہ للجبین، فداہ بالذبح العظیم وقد بعث اللہ جل وعلا الملائکۃ الی رسلہ فی صور لا یعرفونھا کدخول الملٰئکۃ علی ابراھیم ولم یعرفھم حتی اوجس منھم خیفۃ وکمجی جبریل الیٰ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وسؤالہ ایاہ عن الایمان والاسلام فلم یعرفہ المصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم حتی ولیٰ فکان مجئ ملک الموت الی موسےٰ علیٰ غیر الصورۃ التی کان یعرفہ موسےٰ علیہ السلام علیھا وکان موسیٰ غیورًا فرأی فی دارہ رجلا لم یعرفہ فشال یدہ فلطمہ فاتت لطمتہ علیٰ فقیء عینہ التی فی الصورۃ التی یتصور بھا لا الصورۃ التی خلقہ اللہ علیھا ولما کان المصرح عن نبینا صلے اللہ علیہ وسلم فی خبر ابن عباس حیث قال: امّنی جبریل عند البیت مرتین، فذکر الخبر وقال فی اٰخرہ ھذا وتتک ووقت الانبیاء قبلک - کان فی ھذا الخبر البیان الواضح ان بعض شرائعنا

قد یتفق بعض شرائع من قبلنا من الامم - ولما کان من شریعتنا
ان من فقاء عین الداخل دار لا بغیر اذنه او الناظر فی بیته بغیر
آمرہ من غیر جناح علیٰ فاعله ولا حرج علیٰ مرتکبه للاخبار الجمة
الواردۃ فیه کان جائزا اتفاق ھذہ الشریعة شریعة موسیٰ
باسقاط الحرج عمن فقاء عین الداخل دار لا بغیر اذنه فکان استعمال
موسیٰ ھذا الفعل مباحًا له ولا حرج علیه فی فعله فلما راجع ملک
الموت الی ربه واخبرہ بما کان من موسیٰ فیه امرہ ثانیًا بامر
آخر امر اختبار وابتلاء - کما ذکرنا قبل - اذا قال اللّٰه له : ان
شئت فضع یدک علیٰ متن ثور فلک بکل ما غطت یدک لکل شعرۃ سنة
فلما علم موسیٰ کلیم اللّٰه صلی اللّٰه علی نبینا وعلیه ، انه ملک الموت
وانه جاءہ بالرسالة من عند اللّٰه ، طابت نفسه بالموت ولم یستعمل
وقال فالآن فلو کانت المرۃ الاولے عرفه موسیٰ انه ملک الموت
لاستعمل ما استعمل فی المرۃ الاخری عند تیقنه وعلمه به -

عند قول من زعم ان اصحاب الحدیث حمالة الحطب ورعاۃ
اللیل ! یجمعون ما لا ینتفعون به ویروون مالا یوجرون علیه ! و
یقولون بما یبطله الاسلام !! جھلاً منه بمعانی الاخبار وترک
التفقه فی الآثار معتمدًا فی ذالک علیٰ رایه المنکوس وقیاسه
المعکوس !! "

(تعلیق المسند الامام احمد ص ۶۶-۶۷ ج ۱۴ - طبع مصر)

یعنی اللہ عزوجل نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنی مخلوق کی تعلیم اور اسے
اپنے ارادہ سے آگاہ کرنے کے لئے مبعوث فرمایا - چنانچہ آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا
اور اس کی آیات کی کبھی بالاختصار اور کبھی بالتفصیل ایسی وضاحت فرمائی جسے تمام

یا بعض صاحبِ فہم و ذکا صحابہ نے سمجھ لیا۔ یہ حدیث بھی منجملہ ان احادیث کے ہے جن کا معنیٰ ہر وہ شخص سمجھ سکتا ہے جو معرفتِ حق کی توفیق سے محروم نہیں ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے پاس بطور آزمائش ملک الموت کو یہ کہہ کر بھیجا کہ موسیٰ سے کہو "موت کے لئے تیار ہو جائے"۔ مگر اللہ تعالیٰ کا یہ حکم نافذ کرنے کے لئے نہیں بلکہ محض آزمائش اور امتحان کے لئے تھا۔ ایسا ہی ایک آزمائشی حکم اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے حضرت ابراہیم خلیلؑ کو بھی دیا تھا کہ وہ اپنے جان سے زیادہ عزیز بیٹے کو ذبح کر دیں۔ وہ حکم بھی نافذ کرنے کے لئے نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کیلئے منہ کے بل زمین پر گرایا تو خداوندکریم نے ان کی بجائے ایک دنبہ بھیج دیا۔ علاوہ ازیں بعض اوقات اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو انبیاء علیہم السلام کے پاس ایسی صورت میں بھیجا جسے وہ نہیں پہچانتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کے پاس فرشتے مہمان انسانوں کی شکل میں آئے اور ان کے کھانا نہ کھانے سے حضرت خلیل الرحمٰن خوف زدہ بھی ہوئے اسی طرح ایک دفعہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جبریل علیہ السلام مسافر آدمی کی صورت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے ایمان اسلام اور احسان کے متعلق سوالات کئے۔ آپؐ نے چلے جانے کے بعد انھیں پہچانا۔ اسی طرح ملک الموت موسیٰ علیہ السلام کے پاس غیر معروف شکل میں آئے۔ موسیٰ علیہ السلام ایک اجنبی آدمی کو یوں بلا اجازت اندر آتے دیکھ کر برداشت نہ کر سکے اور غیرتِ طبعی سے متاثر ہو کر اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا جس سے اس کی آنکھ پھوٹ گئی جو اس کی حقیقی آنکھ نہ تھی بلکہ ظاہری صورت کی عارضی آنکھ تھی۔ امامتِ جبریل کی حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرمائی ہے کہ نماز سے فراغت کے بعد جبریلؑ نے کہا:

"ھٰذا وقتك ووقت الانبیاء قبلك" (آپ کے علاوہ آپ سے پیشرو انبیاء کی نماز کے اوقات بھی یہی تھے)

اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ اس شریعت کے بعض احکام پہلی شریعتوں

کے بعض احکام سے موافق ہیں جیسے ہماری شریعت میں بلا اجازت گھر میں داخل ہونے یا بلا اذن مکان میں جھانکنے والے کی آنکھ پھوڑنے پر کوئی گناہ اور مواخذہ نہیں۔ بہت ممکن ہے موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بھی بلا اجازت گھر میں داخل ہونے والے کی آنکھ پھوڑنا جائز ہو اور اس بارہ میں صاحبِ مکان پر کوئی گناہ اور ملامت نہ ہو اور موسیٰؑ نے اس شرعی حکم کی تعمیل میں یہ فعل کیا ہو۔ پھر جب فرشتے نے ان کے اس سلوک کی اللہ تعالیٰ کے پاس جا کر شکایت کی تو دربارِ الٰہی سے اسے ایک دوسرا آزمائشی حکم دے کر بھیجا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام سے کہو "اگر آپ مرنا نہیں چاہتے تو بیل کی پیٹھ پر ہاتھ رکھیئے۔ جتنے بال ہاتھ کے نیچے آئیں، ہر بال کے عوض آپ کی عمر میں ایک سال کا اضافہ ہو جائے گا۔ اب کلیم اللہ کو معلوم ہوا کہ یہ ملک الموت ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغامِ موت لے کر حاضر ہوا ہے۔ چنانچہ آپ اب برضا و رغبت مرنے کے لئے تیار ہو گئے اور فرمایا "میں ابھی واصل بحق ہونا چاہتا ہوں"

مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ موسیٰ پہلی دفعہ ملک الموت کو نہیں پہچان سکے اگر انھیں معلوم ہو جاتا کہ یہ ملک الموت ہے تو یقیناً ان کے ساتھ وہی سلوک کرتے۔ جو دوسری مرتبہ کیا۔

یہ ہے اس حدیث پاک کا مطلب جسے اپنی الٹی سمجھ اور معکوس قیاس پر اعتماد کرنے کی وجہ سے احادیث اور آثار نبویہ (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ) کو سمجھنے کی توفیق سے محروم شخص نہ سمجھ سکا اور الٹا محدثینِ کرام پر "رطب ویابس جمع کرنے اور رات کی تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارنے" کا الزام لگا دیا۔

حضرت موسیٰؑ سے متعلق یہ حدیث معتزلہ کی طرح ہمارے مولانا کو بھی "عقل عام" کے خلاف معلوم ہوئی، حالانکہ بقول حافظ ابنِ حبان رح وہ ایک ابتلا تھا جسے یوں ہی ختم ہونا تھا۔

ظاہر ہے کہ موت کا وقت کم و بیش نہیں ہوتا اِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ

سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۱۰ : ۴۹) ملک الموت آئے اور تھپڑ کھا کر چلے گئے پھر اللہ کے پاس شکایت کی اور اتنی دیر موسیٰ علیہ السلام زندگی کی بہاریں گذارتے رہے ۔ اس حدیث سے یہ مفہوم اخذ کرنا صحیح نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ملک الموت قبل از وقت آزمائش کے لئے انسانی شکل میں آئے تھے اور انھوں نے حضرت موسیٰؑ کے سامنے ایک مطالبہ اس وضع میں رکھا جس کا ان کو حق نہ تھا ، اس کی پاداش ملی ، یہی قدرت کا منشا تھا ۔ انبیاء کی زندگی میں ایسے مراحل آتے ہیں جو عقلِ عام کی رسائی سے بالا ہوتے ہیں ۔ جو شخص ان کو عقل عام کے پیمانوں سے ناپنا شروع کردے گا وہ ناکام ہوگا ۔ اس کی تسکین اسی صورت میں ہوگی کہ وہ متعلقہ واقعہ کا انکار کرے اور عقل کے لئے تسکین کا بے حقیقت سامان پیدا کرے ۔ انبیاء کے معجزات اور ملاء اعلیٰ کے ساتھ ان کے تعلقات یہ عقلِ عام کا مسئلہ نہیں ، یہاں خواص کی عقلیں بھی حیران رہ جاتی ہیں لہٰذا اگر طبیعت مطمئن ہوسکے تو شارع کے الفاظ میں ہی اسے قبول فرمائیے ورنہ جو جی میں آئے فیصلہ کیجئے ، اسے اگر عقل کی سان پر چڑھایا گیا تو سان ٹوٹ جائے گی یہ واقعات قائم رہیں گے ۔

مؤدبانہ گذارش مولانا کے ارشادات کا جب یہ مقام سامنے آیا جس میں تین احادیث پر شبہ فرمایا گیا ہے تو مجھے بے حد دکھ ہوا اور مولانا کے ان ارشادات کے متعلق جب کچھ لکھنے کی کوشش کی تو طبیعت رنج و افسوس کے جذبات سے لبریز ہوگئی اس لئے قلم رکھ دیا ، میں نہیں چاہتا تھا کہ مولانا کے احترام کے خلاف نوکِ قلم سے کوئی فقرہ نکل جائے ۔ آج مدت کے بعد قلم اٹھایا ۔ سنت نبویؐ کے متعلق جذبات میں آج بھی دکھ اور قلق موجود ہے افسوس ہے کہ اتنی پوزیشن کے لوگ کس بے پروائی سے سنت کے متعلق جو منہ میں آئے کہہ جاتے ہیں ۔ اس وقت اگر کوئی ناخوش گوار لفظ قلم سے نکلا تو صمیم قلب سے اس کے لئے معذرت چاہتا ہوں ۔ مقصد طعن و تشنیع نہیں ۔ اس دورِ فتن میں سنت اور علوم نبویہ کے خلاف ایسے الفاظ

فی الواقع ناگوار ہیں۔ مولانا پر طنز قطعاً مقصود نہیں۔ سنت کے ساتھ محبت اور قلب کا، سنتِ رسول سے ربط ان پریشان خیالات کے اظہار کا موجب ہوا ؎

گفتگوئے عاشقاں در بابِ رب
جذبۂ عشق است نے ترکِ ادب

مولانا کے ارشادات کے بعض حصص اور مودودی صاحب کا "مسلکِ اعتدال" قطعاً اس قابل نہیں کہ ان کی اشاعت کی جائے۔ ان میں جو کچھ صحیح ہے وہ بھی غلط انداز سے کہا گیا ہے اور "مسلکِ اعتدال" میں تو دماغ کے کباڑ خانہ نے خیالات اس بے اعتدالی سے اُگل دیئے ہیں کہ اگر کوئی منکرِ حدیث بھی لکھتا تو یہی کچھ لکھتا۔

ائمۂ حدیث کے مناقشات

مولانا نے محدثین کے باہمی مناقشات کو اہلِ قرآن سے بھی زیادہ نمایاں فرمایا ہے اور اس انداز سے فرمایا ہے کہ شاید مولانا ملت کو کوئی عجیب اور نئی چیز عنایت فرما رہے ہیں مولانا غور فرمائیں یہ انسانی مزاج کی ایک کمزوری ہے، فنِ رجال کو چھوڑیئے، کوئی فن اس سے خالی نہیں۔ شعر و سخن، ادب، نحو اور قواعد، معانی، بیان، فقہ اور اصولِ فقہ کس فن میں یہ مناقشات نہیں؟ بقولِ جناب ائمہ تفسیر میں بھی یہ کمزوری موجود ہے اور آپ کی جماعت اور علماء کے مناقشات بھی اس کی ایک کڑی ہیں تو کیا اس بنا پر آپ اور تمام علماء کے افادات سے دست بردار ہو جانا چاہیئے؟ جب سے علمِ رجال وضع ہوا ہے اس قسم کا ذخیرہ موجود ہے اور اس کے باوجود اس میں حق و باطل کا امتیاز غیر مشتبہ طور پر کیا جا سکتا ہے اور کیا گیا ہے۔ پھر اس بے ضرورت مواد کو حدیث کے دفاع کے موقع پر ذکر کرنے کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی؟ جہاں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ کہنے کا موقع تھا وہیں آپ نے شرم سے نظر نیچی فرما لی، جہاں تن کر چلنے کا موقع تھا آپ سربسجود ہو گئے۔ عبد اللہ چکڑالوی، خواجہ احمد دین امرتسری، مستری رمضان گوجرانوالہ، محبوب شاہ گوجرانوالہ، سید عمر شاہ گجرات"

شیخ عطاء اللہ وکیل، مفتی محمد دین وکیل گجرات، ملتان کے منکرینِ حدیث، ڈیرہ غازی خاں کے اہلِ قرآن اور ادارہ طلوع اسلام کے اربابِ قیادت، اور ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے ملحدین کے نظریات میں بعد المشرقین اور ان کا باہمی برسوں کا جوت بیزار کسے معلوم نہیں لیکن کبھی انھوں نے آپ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا؟ نماز زکوٰۃ، حج کے متعلق جو پراگندہ خیالی اور اس کے متعلق جو بدعملی ان اساطینِ الحاد و فسق میں موجود ہے اس کا کبھی انھوں نے اعتراف کیا؟ پھر مولانا مودودی کو کیا مصیبت ہے کہ امام ابن اسحاقؒ اور امام مالکؒ کی شکر رنجی کا بلا ضرورت تذکرہ چھیڑ دیں۔ علماء عراق اور امام مالکؒ کے بعض مخالفانہ آراء و افکار کا اشتہار دیں، امام ابو حنیفہؒ اور اعمش کی چشمک کا نوحہ فرمائیں۔ اس سے اصل فن اور اس کی خوبیوں پر آخر کیا اثر پڑتا ہے اور ان مقدسین میں جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے، اگر سو پچاس میں کسی وقت (بشرط صحتِ سند) کوئی شکر رنجی یا مناقشہ ہوا بھی ہو تو پورے فن پر اس کا کہاں تک اثر پڑ سکتا ہے؟ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اول تو آپ حضرات سنت کے دفاع کی ذمہ داری لیتے ہی کیوں ہیں، آپ کے ہاں مولوی عبدالغفار حسن صاحب ایسے دو ایک حضرات اور بھی موجود ہیں جو غالباً آپکی جماعت کے مزاج اور اس کے نظم کے احترام کی وجہ سے خاموش ہو جاتے ہیں، انھیں اجازت مرحمت فرمائیے وہ اس موضوع پر لکھیں اور اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق لکھیں۔ جماعت کے اجتماعی مزاج سے انھیں مستثنیٰ فرمایا جائے میرا خیال ہے وہ یہ فریضہ بہتر طور پر ادا کر سکتے ہیں۔ یہ فرض کفایہ اچھا ہے ان پر ڈال دیا جائے۔

آحاد کے متعلق اختلاف اور خرابی کا پہلا دور

یوں تو زمانۂ نبوت ہی میں ایسا عنصر موجود تھا جو آنحضرتؐ کی تفصیلی ہدایات، تربیت اور آپ کے احتساب سے گھبراتا تھا، کبھی غنائم کی تقسیم کے سلسلہ میں ذہن نمایاں ہوتا، ان ھذہ القسمۃ لم یرد بہا وجہ اللہ (مسند احمد)

کبھی آنحضرتؐ کی طرف غلول کی نسبت کرتے، مختلف طور پر وہ آنحضرتؐ سے تنفر پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ رَاَیْتَ الْمُنَافِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْکَ صُدُوْدًا۔ منافق آپ کی خدمت میں آنے سے گھبراتے اور بدکتے ہیں لیکن دانش مند اور سلجھی ہوئی طبائع کی موجودگی میں اس ذہن کو ابھرنے کی توفیق نہ مل سکی۔ حضرت علی رضؓ کی خلافت میں ان لوگوں کو کچھ کھل کر کہنے اور اجتماعی طور پر شرارت کرنے کا موقعہ ملا، اس کی تفصیل احادیث اور ادب کی کتابوں میں ملتی ہے۔

اس ذہن کی تنظیم لیکن دوسری صدی میں معتزلہ کی وجہ سے اس ذہن نے ایک باقاعدہ اور اصولی شکل اختیار کرلی۔ مگر خوارج اور یہ حضرات کھل کر حدیث کا انکار نہ کرسکے۔ فضائلِ اہلِ بیت کا انکار خوارج نے کیا اور احادیثِ صفات کا انکار حضرات معتزلہ نے کیا اور احادیثِ مناقب کا انکار شیعہ نے کیا۔ اس کے علاوہ یہ حضرات احادیث کا پورا پورا احترام کرتے تھے۔ معتزلہ فروع میں شیعہ ہیں، بعض حنفی اور شافعی۔ وہ اپنے اپنے اماموں کی طرح فروع میں احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔ اسی طرح خوارج میں آج بھی حدیث پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔ الجامع الصحیح کے نام سے حکومتِ مسقط کی طرف سے حدیث کی ایک کتاب خوارج میں موجود ہے جسے وہ بڑی عقیدت سے پڑھتے ہیں۔ خوارج کے اس جزوی انکار کا تذکرہ سنت کی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ اعتزال کی سرپرستی عباسی حکومت نے کی۔ اس فتنہ نے قریبًا دوسری صدی میں سر اٹھایا۔ اس لئے انکارِ حدیث کے متعلق یہ چور دروازہ قریبًا دوسری صدی میں کھلا۔ ان کا زیادہ زور ان احادیث پر تھا۔ جو صفاتِ باری تعالیٰ کے متعلق ان کے مزعومات کے خلاف تھیں اور حدیث کے متعلق ان کے ذوق کی "سلامتی" کا یہ حال ہے کہ وہ متواتر احادیث کو بھی آحاد کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔ نصوصِ قرآنیہ کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ بھی اسے سن پائیں تو انھیں حیرت ہو سے

ولے تاویلِ شاں درحیرت انداخت
خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

آحاد پر اشتباہ دوسری صدی کے شروع میں

یہ لوگ قرونِ خیر میں تو موجود نہ تھے، انکی نشان دہی وہ لوگ کرسکتے ہیں جن کو ان سے سابقہ پڑا۔ ابن حزم فرماتے ہیں:

"وایضا فان جمیع اھل الاسلام کانوا علی قبول خبر الواحد الثقۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یجری علی ذالک کل فرقۃ فی علمھا کاھل السنۃ و الخوارج والشیعۃ والقدریۃ حتی حدث متکلموا المعتزلۃ بعد المأۃ من التاریخ فخالفوا الاجماع فی ذالک اھ (الاحکام ص۱۱۴/۱)

"تمام مسلمان اگر راوی ثقہ ہو تو خبر واحد کو قبول کرتے تھے۔ اہلسنت خارجی، شیعہ، قدریہ کا یہی خیال تھا۔ ہاں پہلی صدی کے بعد معتزلہ متکلمین کی جماعت پیدا ہوئی اور انھوں نے اس اجماع امت کی مخالفت کی۔"

امام احمدؒ اور اسحاق بن راہویہ خبر واحد صحیح سے جو کچھ ثابت ہو اس سے انکار کو کفر سمجھتے تھے۔ ابن قیمؒ ایک مقام پر ان لوگوں پر اس طرح سے تعجب فرماتے ہیں: "یہ لوگ آنحضرتؐ کی احادیث کو اس لئے نہیں مانتے کہ (وہ آحاد ہیں) ان سے علم حاصل نہیں ہوتا، اور ذہنی خیالات اور باطل شبہات کو قبول کرلیتے ہیں جو معتزلہ جہمیہ اور فلاسفہ سے منقول ہیں اور ان کا نام براہینِ عقلیہ رکھ لیتے ہیں"
(صواعق، ج۲ ص۳۷۵)

ابن قیمؒ نے صواعق مرسلہ کی دوسری جلد کے قریباً ایک سو سے زائد صفحات معتزلہ

کے اسی نظریہ کے خلاف لکھے ہیں جو انھوں نے خبرِ واحد کے متعلق ظاہر کیا اور اسی نظریہ کے سہارے پر سیکڑوں سننِ صحیحہ کا انکار کیا۔ حق کی جستجو کرنے والوں کو اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ حدیث کے متعلق تحقیقی مطالعہ کے لئے موافقات کا باب السنۃ، احکام ابن حزم کا باب السنۃ اور صواعق مرسلہ کا یہ مقام ضرور دیکھنا چاہیئے۔

دوسرا دور

معتزلہ کے اس حملہ سے صرف اہلِ حدیث اور حنابلہ محفوظ تھے احناف، موالک، شوافع اور شیعہ سے بعض اہل علم اعتزال سے متاثر ہو گئے تھے۔ وہ فروع میں احادیث کو مانتے، احاد کی ظنیت پر یقین کرتے تھے۔ احناف میں سے بشر مریسی (متوفی ۲۲۸ھ) تو کھلے معتزلی ہیں۔ قاضی عیسیٰ بن[1]

---

[1] قاضی عیسیٰ بن ابان کا مسلک متقدمین ائمہ احناف میں مقبول نہ تھا جیسے اصول بزدوی اور اس کی شرح سے ظاہر ہے۔ متاخرین احناف بھی اسے اپنا نظریہ سمجھ کر اس سے استفادہ کرتے رہے اور مصراۃ وغیرہ کی روایات کو رد کرتے رہے۔ آج کل بعض نو آموز اور کم سواد حضرات اس غلط اور منحوس نظریہ کو حضرت امام سیدنا ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اس نظریہ کی کچھ آبرو رہ جائے یہ روایت ابو مطیع بلخی سے مروی ہے۔ روایت بالکل من گھڑت اور وضعی ہے اس کی نسبت حضرت امام کی طرف بالکل جھوٹ ہے۔ ابو مطیع بلخی ائمہ نقد کے نزدیک ناقابلِ اعتماد ہیں۔ ذہبی فرماتے ہیں وہ آثار کے ضبط میں واہی ہیں ابنِ معین نے فرمایا وہ راشی ہیں، نسائی نے انھیں ضعیف کہا، امام احمدؒ نے فرمایا ان سے روایت درست نہیں۔ ابو داؤد نے کہا یہ متروک الراویت اور جہمی ہیں۔ ابنِ عدی نے کہا ان کا ضعف ظاہر ہے۔ ابنِ حبان نے فرمایا یہ مرجئہ کا سردار ہے، اسے سنت سے بغض ہے اور اس میں غلط بیانی کرتے ہیں۔ ان کا انتقال ۱۹۵ھ میں ہوا (میزان الاعتدال، ایضاً تاریخ خطیب ۲۲۳) یہ نسبت قطعاً غلط وضعی اور مختلق ہے۔ آج کل کے بعض نوخیز طلبۃ العلم نے اسے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس اثر کے متعلق باقی مباحث کسی دوسرے وقت مذکور ہونگے۔ سردست اسقدر اظہار مقصود ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ رح کی طرف اس جہمی نظریہ کی نسبت غلط ہے۔

ابان (متوفی ۲۲۱ھ) امام محمد کے شاگرد ہیں۔ مولانا عبد الحئی نے فوائد البہیہ میں ان کا مختصر ترجمہ لکھا ہے، ابنِ ندیم نے فہرست میں لکھا ہے کہ ان کا تعلق سپاہی خاندان سے تھا۔ پھر علمی شغل اختیار فرمایا۔ خطیب نے صراحت کی ہے کہ وہ خلقِ قرآن کے قائل تھے۔

مصنف کتاب التحقیق شرح حسامی نے ان کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا ہے۔ قال عیسیٰ بن ابان وعبد الجبار من المعتزلۃ (ص۱۷۵) ان قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی عیسیٰ بن ابان کا رجحان بھی اعتزال کی طرف تھا۔ ان کی وجہ سے فروع میں بھی اخبار آحاد کو اشتباہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ چنانچہ عادل وضابط راوی اگر فقیہ نہ ہو تو اس کی روایت مقبول نہیں ہو گی بلکہ قیاس کو اس کی روایت پر ترجیح دی جائے گی۔ واما روایۃ من لم یعرف بالفقہ ولکنہ معروف بالعدالۃ والضبط مثل ابی ھریرۃ وانس بن مالک فان وافق القیاس عمل بہ وان خالفہ لم یترک الا بالضرورۃ (اصول بزودی ص $\frac{699}{2}$، احکام آمدی ص $\frac{169}{2}$)

عادل اور ضابط راوی اگر فقیہ نہ ہو جیسے ابو ہریرہؓ اور انس بن مالکؓ تو ان کی روایت اگر قیاس کے موافق ہو تو قبول کی جائے ورنہ اسے ضرورۃً ترک کر دیا جائے گا۔"

قاضی عبد العزیز بن احمد شارح اصول بزدوی فرماتے ہیں۔" حدیث کو قیاس پر مقدم کرنے کے لئے ہم نے جو فقہِ راوی کی شرط لگائی، یہ صرف عیسیٰ بن ابان کا مذہب ہے اور قاضی ابو زید دبوسی نے اسے پسند کیا اور مصراۃ اور عرایا کی حدیث کو اسی اصول پر تخریج کیا ہے اور بہت سے متاخرین نے اسے اپنا لیا۔ امام ابو الحسن کرخی اور باقی قدماءِ احناف اس کے خلاف ہیں۔ وہ فرماتے ہیں، عادل اور ضابط راوی کی حدیث بہرحال قیاس پر مقدم ہو گی اور اکثر علماء کا یہی خیال ہے۔ خود حضرت امام ابو حنیفہؒ ضعیف حدیث کو قیاس پر ترجیح دیتے ہیں (کشف الاسرار ص۷۰۳ ج ۲) یہ قاعدہ اصولِ فقہ کی قریباً تمام کتابوں میں مرقوم ہے، ورقدماءِ احناف نے بھی اسے پسند نہیں فرمایا کہ ضعیف حدیث پر قیاس کو ترجیح دی جائے۔ ویسے بھی یہ قول غلط ہے، قاضی عیسیٰ بن ابان

ایسے بزرگ، حضرت ابوہریرہ رضؓ اور حضرت انس رضؓ جیسے بزرگوں کو جو برسوں آنحضرتؐ کی خدمت رہے، جن کی مادری زبان عربی ہے، غیر فقیہ کہہ دیں تو بڑی عجیب بات ہے حالانکہ وہ خود نہ عرب ہیں نہ علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر حضرت ابوہریرہ کا تفقہ معلوم ہے، اکابر صحابہ مسائل میں ان کی طرف رجوع فرماتے تھے۔ گورنری کے عہدوں پر فائز رہے۔ خود ائمہ احناف نے ان کی احادیث کو خلافِ قیاس قبول فرمایا کشف الاسرار، کتاب التحقیق وغیرہ مبسوطات میں اس کی تفصیل مل سکتی ہے۔ اس کے باوجود متاخرین احناف میں انکار کے لئے جزوی طور پر یہ چور دروازہ کھولا گیا۔ احاد کو ترک کرنے کے لئے ایک راہ پیدا ہوئی۔ لیکن اس میں اس قدر احتیاط رکھی گئی کہ وہی احادیث متروک ہوں گی جن کے راوی فقیہ نہ ہوں گے (یہاں فقہ سے مراد یہ ہے کہ وہ راوی عربی زبان کو اچھی طرح جانتا ہو تاکہ روایت بالمعنیٰ میں غلطی نہ کرے) فقیہ رواۃ کی روایات رائے کے موافق ہوں یا مخالف، قاضی عیسیٰ بن ابان اور ان کے اتباع اسے قبول کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ رائے کا دروازہ بند نہیں ہونا چاہئے، کہیں نہ کہیں اس کے لئے گنجائش نکلنی چاہیئے۔ اس احتیاط کے باوجود ان کا یہ مذہب قدماء احناف میں قبولیت حاصل نہ کرسکا۔ امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ، امام محمد اور حضرت امام کے مشہور تلامذہ کو قاضی عیسیٰ بن ابان سے ان کی اس احتیاط کے باوجود اختلاف ہے صحیح راہ وہی ہے جسے جمہور ائمہ سنت نے اختیار فرمایا۔ قاضی عیسیٰ بن ابان کے مسلک میں سے اعتزال کی بو آتی ہے، اور ائمہ حدیث کا نقطۂ نظر تو قدماء اور اکابر احناف سے بھی مختلف ہے۔

تیسرا دور متاخرینِ احناف میں قاضی عیسیٰ بن ابان کے مسلک پر عمل ہونے لگا فقہ اور اصولِ فقہ میں اسی کی بنیاد پر فروع اور اصول تخریج کیے گئے بعض جگہ صریح احادیث کی بھی بعید از کار تاویلات کی گئیں۔ عینی شرح کنز میں نکاحِ حلالہ کے افادہ تحلیل کا ذکر فرما کر حدیث لعن اللہ المحلل والمحلل لہ

کی تاویل اس طرح فرمائی گئی۔ لعله اراد باللعنة الرحمة (عینی برحاشیہ کنز کشوری) یعنی حدیث میں لعنت سے شاید رحمۃ مراد ہو، غرض متاخرین کی تصانیف میں اعتزال کو کافی دخل ہوگیا۔ اصول فقہ میں سب سے پہلی تصنیف امام شافعیؒ نے کی اول من صنف فیه الامام الشافعی (کشف الظنون صفحہ ۸۹ ج ۱) اس کے بعد جب اصولِ فقہ فن کی صورت میں مدون کیا گیا تو اس میں اہلِ حدیث اور معتزلہ نے بہت کچھ لکھا۔ واکثر التصانیف فی اصول الفقه لاهل الاعتزال المخالفین لنا فی الاصول ولاهل الحدیث المخالفین لنا فی الفروع

(کشف الظنون صفحہ ۸۹ ج ۱۔ ابجد العلوم صفحہ ۳۲۵ ج ۲)

اصولِ فقہ میں معتزلہ نے زیادہ کام کیا، وہ اصول اور عقائد میں ہمارے مخالف ہیں یا پھر اہل حدیث نے تصانیف کیں، وہ فروع میں ہم سے مختلف ہیں،،

معتزلہ کا اثر عقائد میں تو تھا ہی، فقہیات بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے

(حجۃ اللہ صفحہ ۱۶۱ ج ۱)

بعضهم یزعمان بناء المذهب علی هذه المحاورات الجدلیة المذکورة فی مبسوط السرخسی والهدایة والتبیین ونحو ذالك ولاان اول من اظهر ذالك فیهم المعتزلة ولیس علیه بناء مذهبهم۔ ”بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہدایہ، تبیین، مبسوط سرخسی میں جو جدلی مباحثات پائے جاتے ہیں، حنفی مذہب کی بنا ران پر ہے، انھیں معلوم نہیں کہ یہ معتزلہ کی مہربانی ہے حنفی مذہب ان پر مبنی نہیں“۔ غرض دوسرے دور میں فروع اس سے متاثر ہوئے اور عقائد کے بعد اعمال پر اس کا اثر پڑا۔

فقہ راوی:

دوسرے مقام پر شاہ صاحب نے فرمایا ”محققین کی یہ پختہ رائے ہے کہ عدل

اور ضبط کے بعد راوی کے لئے فقہ کی شرط یہ صرف عیسیٰ بن ابان کا مذہب ہے اور بہت سے متاخرین بھی اس میں ان کے ساتھ ہیں، امام کرخی اس کے خلاف ہیں اور قدماء احناف سے بھی یہ مذہب منقول نہیں۔ ان کی رائے ہے کہ حدیث بہر حال مقدم ہے"۔ (حجۃ اللہ ص۱۶۱ ج ۱)

غرض رائے اور قیاس کی دھاندلی متاخرین میں ہے۔ یہ قدماء میں نہ تھی قدماء کی اس احتیاط کے باوجود ائمہ حدیث نہ متقدمین کی روش پر مطمئن تھے، نہ متاخرین کے طریق پر، یہ حضرات دونوں جگہ حدیث اور سنت کے صافی چشموں کو مکدر پاتے تھے۔ شعبی فرماتے ہیں۔ لقد بغض الی ھولاء الارایئون المسجد حتی انہ لا بغض الی من کناسۃ داری قالوا من ھم قال الحکم و حماد و اصحابہ ۱۵ (مختصر بیان العلم ابن عبد البر ص۱۴۶ ج ۲ القول المفید للشوکانی)

جو لوگ اس وقت اس محتاط روش پر مطمئن نہیں وہ آج کل نیچر پرستی پر کیسے مطمئن ہو سکتے ہیں۔ آج کے اہلِ حدیث حضرات سب کچھ دیکھتے ہیں اور ان کی سلفیت پر کوئی آنچ نہیں آتی ؎

اکل امرء تحسبینی امراء
و نار توقد باللیل نارا

ہمیں یقیناً معلوم ہے کہ ائمہ اربعہ حدیث کو حجت مانتے ہیں، اسے دین کا ماخذ سمجھتے ہیں اور اسی تعریف سے حجت سمجھتے ہیں جو ائمہ سنت اور عامۃ المسلمین میں مسلم ہے اور ایک دوسرے کو مسلمان سمجھنے کے باوجود اہلِ حدیث کو احناف، شوافع، اور حنابلہ کی فقہیات سے اختلاف ہے، وہ ان سکول ہائے فکر میں حدیث اور سنت کی تقدیس کو اس قدر محترم اور محفوظ نہیں سمجھتے جس قدر اہلِ حدیث اور سلفی سکولِ فکر میں اسے محترم اور محفوظ پاتے ہیں۔

چوتھا دور انگریز کی آمد کے بعد جب ملک میں تعلیمی نظام تقسیم ہوا، دینی تعلیم حضری تعلیم سے الگ ہو گئی۔ سکولوں اور کالجوں کا طریق فکر مذہبی مدارس سے مختلف ہو گیا۔ عیسائی مبلغ اپنی حکومت کی سرپرستی میں ہندوستان میں چھا گئے۔ علماء اور مذہبی مدارس تو ان سے کیا متاثر ہوتے، انگریزی تعلیم اور اس کی حمایت کرنے والے ان سے بہت حد تک متاثر ہوئے۔ سید احمد خاں مرحوم سے لے کر سکولوں کے طلبہ اور اساتذہ تک اس کے اثر سے نہ بچ سکے، ان میں سے بعض حضرات کی اسلام سے وابستگی واقعی خلوص پر مبنی تھی اور ان لوگوں نے عیسائی شبہات کے جواب میں پورے زور سے قلم اٹھایا مگر ذہن چونکہ متاثر تھا، قلم لڑکھڑا گیا۔

"امہات المومنین"، "خطباتِ احمدیہ"، "تفسیرِ احمدی"، (مصنف سید احمد خاں) میں یہ چیز نمایاں ہے۔ جو حدیث مقاصد کے خلاف آئی اڑا دی گئی، جہاں کسی آیت کا مفہوم یا کوئی معجزہ نیچر سے منحرف ہوا اس کا حلیہ اس طرح بگاڑا اور تاویل و تحریف میں ایسا ترادف پیدا کیا جس پر ملائکہ بھی حیران ہو گئے۔ حکومت کو بھی اس سے فائدہ ہوا ۱۸۵۷ء کے مظالم سے جن دلوں میں انتقام کی آگ جل رہی تھی انھیں ایک وقتی مشغلہ ہاتھ آ گیا۔ اس طریقِ فکر کے اثرات ملک میں مختلف انداز میں ظاہر ہوئے۔ اربابِ قادیان پر تاویل کا فیضان ہوا۔ مولوی عبد اللہ چکڑالوی کو انکارِ حدیث کا سبق ملا۔ مولانا شبلی رح اور مولانا حمید الدین فراہی رحمہما اللہ ایسے اساطینِ علم و فضل بھی تھوڑے بہت اس سے متاثر ہوئے۔ مولانا فراہی رح کی تفسیر کے جو اجزاء عربی میں شائع ہوئے ہیں ان میں حدیث سے بہت کم استفادہ فرمایا گیا ہے مگر تورات اور انجیل کے رائج الوقت نسخوں سے کافی استفادہ کیا گیا ہے۔

درایت اور تفقّہ مولانا شبلی رحمہ اللہ نے سیرۃ النعمان میں محدثین کے طریق فکر پر کڑی تنقید فرمائی، فقہائے کوفہ رحمہم اللہ کے طریق فکر کی اس عنوان سے حمایت فرمائی کہ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو شاید اس جدید انداز

کی وکالت کو کبھی پسند نہ فرماتے ۔ مولانا نے حدیث کا انکار نہیں فرمایا لیکن عقل کو درایت اور تفقہ کے نام سے اس قدر اہمیت دی جس سے حدیث اور ائمہ حدیث کے مسلک کو انکار کے قریب قریب نقصان پہنچا ، اور چند ایک اہلِ علم کے استثناء کے ساتھ تمام ندوہ کے متعلقین میں یہ مرض پایا جاتا ہے ۔ اس حلقے میں یہ غلطی عام ہے کہ ائمہ حدیث فقیہ نہ تھے ، تنقیدِ حدیث کے لئے جو اصول وضع کئے گئے ہیں ان میں درایت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے ۔ اصولِ درایت کے مطابق تنقید فقہاء نے فرمائی اور اب بھی ہر ایک کو حق ہے کہ اس نقطۂ نظر سے حدیث پر تنقید کرے ، جسے چاہے رکھ لے اور جسے چاہے ردی کی ٹوکری میں ڈال دے ۔ انا للہ ۔ پھر درایت کا مفہوم ایسا عام بیان فرمایا جس سے حدیث کا قتلِ عام ہو سکتا ہے ۔ سیرۃ النعمان میں مولانا فرماتے ہیں :۔

> "درایت کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو اس پر غور کیا جائے کہ وہ طبیعت انسانی کے اقتضاء ، زمانہ کی خصوصیات ، منسوب الیہ کے حالات اور دیگر قرائن عقلی کے ساتھ کیا نسبت رکھتا ہے"

"اقتضائے طبیعت" وہی نیچر کا ترجمہ ہے ۔ سرسید کا بھی یہی خیال تھا کہ نیچر کے خلاف کوئی چیز مقبول نہیں ہو سکتی ۔

اس میں درایت کا مفہوم اس قدر آزاد کر دیا گیا ہے کہ اس پر کوئی پابندی نہیں رہی ۔ اقتضائے طبیعت کی حد ؟ اور اس اقتضاء کا معیار کیا ہے ؟ اور عقلی قرائن کی تعیین کون کرے ، کیسے کرے ؟ زمانہ کی خصوصیات نصوص کی راہ میں حائل ہو سکتی ہوں تو پرویز کے جرم پر بھی نظر ثانی ہو جانی چاہیئے ۔

عقل کو اس قدر وسیع اختیارات نہ قاضی عیسیٰ بن ابان نے دئے تھے نہ معتزلہ کو یہ حوصلہ ہوا تھا ۔ یہ گنوار کے ہاتھ کسوٹی اور پاگل کے قبضہ میں تلوار دے دی گئی ہے جو ان کے جی میں آئے کریں ، دین کا خدا حافظ ۔

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ درایت کا مفہوم اہلِ علم کی زبان سے بھی سن لیا جائے تاکہ آج کی درایت اور پرانی درایت میں فرق ظاہر ہو سکے۔

العلم بدراية الحديث هو علم باحث عن المعنى المفهوم من الفاظ الحديث وعن المراد منها مبنيا على قواعد العربية وضوابط الشريعة ومطابقا لاحوال النبي صلى الله عليه وسلم (ابجد العلوم ص۴۳۶ ج۲ ایضاً مفتاح السعادة ومصباح السيادة) تاشکبری زادہ صاحبِ کشف الظنون ما اصولِ حدیث اور درایتِ حدیث کو ایک ہی فن تصور فرماتے ہیں (ص۳۶۶ ج۱) درایتِ حدیث میں حدیث کے مطلب اور مراد سے عربی قواعد اور شریعت کے ضوابط اور آنحضرت کے حالات کے مطابق بحث کی جاتی ہے۔"

اس درایت میں، اور جو درایت آج کل ہمارے بازار میں بک رہی ہے بڑا فرق ہے۔ مصطلح درایت میں علم ہے اور بصیرت ہے جب کہ ہمارے بازار کی درایت میں ذہنی آوارگی ہے اور پریشان خیالی ہے۔ شریعت میں عموماً اور حدیث میں خصوصاً اس قسم کی بے قاعدگی اور آوارگی کو جگہ نہیں دی جانی چاہیئے۔ سر سید احمد خاں مرحوم نے اسی درایت کے حوصلہ پر جھٹکے اور حلال کو برابر کر دیا تھا۔ وہ دونوں کو حلال سمجھتے تھے

مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی

مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی کا سکولِ فکر مولانا شبلی اور سر سید کے سکولِ فکر سے ملتا جلتا ہے۔ یہ حضرات بھی تفقہ اور درایت کے غائبانہ عاشق ہیں، مگر یہ ظاہر نہیں فرماتے کہ ان کے ہاں درایت کا کیا مفہوم ہے۔ مولانا شبلی نے جب درایت کی بحث چھیڑی تو اہلِ حدیث علماء نے ان کا اس طرح تعاقب فرمایا کہ اس بحث کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہا۔ فقہاء اور محدثین کی خدمات کو پوری طرح واضح فرمایا۔ مولانا عبدالعزیز اسلم آبادی کی حسن البیان، مولانا ابو یحییٰ شاہجہان پوری کی الارشاد اور مولانا عبدالسلام مبارک پوری کی سیرۃ البخاری میں یہ موضوع اس طرح چھان پھٹک کر

رکھ دیا گیا کہ آئندہ اس پر تفصیلاً لکھنے کی کسی کو جرأت نہ ہو سکی ۔

مودودی صاحب نے "دانشمندی" سے کام لیا ، درایت کو گول مول کر دیا ۔ کچھ نہیں فرمایا کہ درایت سے ان کی کیا مراد ہے اور وہ کونسے اصول ہیں جو فقہاء نے اس کے متعلق وضع فرمائے ۔ البتہ محدثین پر تنقید فرماتے ہوئے ارشاد ہے :

"وہ (محدثین) زیادہ سے زیادہ یہی کہتے تھے کہ اس حدیث کو صحت کا ظن غالب ہے ۔ مزید برآں یہ ظنِ غالب جس بناء پر ان کو حاصل ہوتا تھا وہ بلحاظ روایت تھا نہ بلحاظِ درایت ۔ ان کا نقطۂ نظر زیادہ تر اخباری ہوتا تھا ، فقہ ان کا اصل موضوع نہ تھا الخ (مسلک اعتدال ص ۳۱۹)

مولانا اصلاحی مدظلہ تنقیدِ حدیث کے منصب کو اور بھی کھلا رکھنے کی کوشش فرماتے ہیں ، ملاحظہ ہو :

"وہ (نقادِ حدیث) اخلاقی اعتبار سے بھی اتنا بلند ہو کہ اس نے دین بازی کو اپنا مشغلہ نہ بنا رکھا ، وہ حدیث پر نقد و تبصرہ کا اہل ہو ۔ یہ منصب نہ ہر ملائے مکتبی کا ہو سکتا ہے نہ دفتر کے کلرکوں کا ۔"

(ترجمان جلد ۵۰ عدد ۲ ص ۱۴۸)

پھر فرماتے ہیں ، مشائخ کی اسانید ، رسمی علوم کی تحصیل ، مدارس کی تعلیم سے بھی یہ اہلیت حاصل نہیں ہوتی کہ حدیث پر تنقید کر سکے بلکہ :

"میرے نزدیک آدمی کے علم و فضل سند اور بہترین شہادت اس کے اپنے کارنامے اور اس کی دینی خدمات ہیں ۔"

اصولاً کارناموں کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن اس معیار کے خطرات کو مولانا نے محسوس نہیں فرمایا ۔ مرزا غلام احمد ، عنایت اللہ خان المشرقی اور پرویز وغیرہ حضرات تنقید کا حق اور حدیث کے رد و قبول میں حکم کی حیثیت اپنے کارناموں ہی کی بناء پر منوانا چاہتے ہیں ۔ آپ رسمی علوم اور مشائخ کی اسانید کو نظر انداز فرما کر بعض

اعتراضات سے بچ گئے ہیں مگر کارناموں اور خدمات کے عموم سے ایک دوسری معیبت کی ذمہ داری آپ نے اپنے سر لے لی ہے۔ یہ آوارہ مزاج حضرات "کارناموں اور خدمات" کو اس طرح پھیلائیں گے کہ عوام کو ان کی گرفت سے بچانا مشکل ہوگا۔ مودودی صاحب کو بچا کر سارے فن کو مصیبت میں ڈالنا مناسب نہ ہوگا۔ حفظت شیئاً وغابت عنك اشياء۔ معیار اگر "کارنامے اور خدمات" ٹھہرا تو ان کی نوعیت ہر پانچ دس سال بعد ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔

خدمات اور کارنامے خدمات اور کارنامے اگر حدیث پر تنقید کا معیار قرار دیئے جائیں تو ان کے لئے کوئی پابندی ہونی چاہیئے

ہمارے آخری دور میں نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ، مولانا عبدالحئی لکھنوی، مرزا غلام احمد، مولوی احمد رضا خاں صاحب تصنیف و تالیف کے لحاظ سے مشہور ہیں۔ کیا ان سب کو حدیث پر تنقید کا حق دیا جائے گا؟ درس و تدریس کے مشاغل میں سید احمد خاں مرحوم، مولانا سید نذیر حسین صاحب رحمہ اللہ اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ کے کارنامے اور خدمات دنیا کو معلوم ہیں لیکن تنقید کا حق کونسی خدمات اور کارناموں کے بعد دیا جائے گا۔

درایت اور کارناموں کو اگر کھلا اور آزاد کر دیا گیا تو یہ انکارِ حدیث کا پیش خیمہ ہوگا۔ مولانا مودودی اور آپ کی روشنی سے حدیث پر نقد میں ایسی فوضویت اور آوارگی کا راستہ کھول دے گی جس کی مضرت انکار حدیث سے کم نہیں ہوگی۔ اس آوارگی کا اندازہ ان چند پڑھے لکھے حضرات سے نہیں لگانا چاہیئے جو آپ کے آگے پیچھے پھرتے رہتے ہیں اور نہ ان چند اہل حدیث رفقاء سے جو جماعتی پابندیوں کی وجہ سے منقار زیر پر رکھنے پر مجبور رہیں، جماعتی مصالح کی بناء پر وہ اپنا عندیہ کھل کر نہیں کہہ سکتے۔ اس کا اندازہ ان عوام سے لگانا چاہیئے جو ملک کے اطراف و اکناف میں آپ کا لٹریچر پڑھتے ہیں جب وہ حریم قیادت سے یہ سنیں گے کہ ائمہ حدیث اصولیں

درایت سے محروم تھے۔ ان کا نقطۂ نظر اخباری تھا، فقہی نہ تھا، جب انھیں معلوم ہوگا کہ مشائخ کی اسانید، مدارس کی تعلیم سے تنقیدِ حدیث کی اہلیت پیدا نہیں ہوتی تو وہ اپنے ذہن میں ائمہ اور دینی تعلیم کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟ وہ جب آپ کی زبان سے سنت کی محتاط اور سکڑی ہوئی تعریف سنیں گے، اخبارِ آحاد کی ظنیت کا وظیفہ سنیں گے تو اس ماخذ کے متعلق ان کے حسنِ ظن کو کس قدر ٹھیس پہنچے گی۔ حریمِ قیادت میں آنے کے بعد آپ کی ذمہ داریاں "مکتبی ملّا" سے کہیں زیادہ ہوگئی ہیں جو فرمانا ہو اسے بہت سوچ کر فرمائیے۔

نہ ہر درایت سے فنِ حدیث میں مہارت حاصل ہوتی ہے نہ ہر کارنامے اور خدمت سے انسان "رسول کا مزاج شناس" بن سکتا ہے، اس کے لئے وہی لوگ موزوں ہوسکتے ہیں جن کے شب و روز کا مشغلہ حدیث ہے، جن کے عزیز اوقات قال اللہ و قال الرسول میں بسر ہوتے ہیں، قیادت پیشہ حضرات نہ ہیرا پہچانتے ہیں نہ جوت۔

مزاج شناسی اور جوت

مولانا مودودی نے مسلکِ اعتدال میں اصولِ حدیث اور ان کے قواعد کو ظنی اور انسانی مساعی کا نتیجہ کہہ کر ان کے مقام کو ہلکا کرکے "دین کے سسٹم" "مزاج شناسی" اور "ہیرے کی جوت" پر نقدِ حدیث کا انحصار فرمایا اور پھر اسے ذوقی کہہ کر حدیث اور اس کی تنقید کو اس قدر بے اصول کردیا کہ اس مسکین فن پر ہر منچلا زبان درازی کرسکے اور مولانا اصلاحی نے کارناموں اور خدمات کو معیار قرار دے کر اسے اور بھی کھلا کردیا۔ یہ کشادگی نہ قاضی عیسیٰ بن ابان کے مسلک میں تھی نہ متاخرین فقہاء میں، اس کی "جوت" کچھ تو معتزلہ سے ملتی ہے اور کچھ سرسید کی نیچر پرستی سے۔ بیچارے اہلِ حدیث جو متاخرین فقہاء اور قاضی عیسیٰ بن ابان سے شاکی تھے۔ وہ آپ کے اس تنقیدی جودوسخا پر کیسے مطمئن ہوتے آپ حضرات کی یہ پیاری

کوششیں اس لئے تھیں کہ آپ ظن سے محفوظ رہ سکیں لیکن جہاں آپ اس وقت تشریف فرما ہیں وہاں ظن ہی ظن ہے۔ درایت ظنی، قیاس ظنی، علت ظنی، اس کا طرد و عکس ظنی، مزاج شناسی ظنِ محض اور ہیرے کی جوت ظنی، محدثین کا یا اصول فن آپ کی نظر میں اس لئے نہ جچ سکا کہ یہ انسانی کوشش ہے جو اپنی فطری حدود سے آگے نہیں جا سکتی، لیکن "درایت"، اور "دین کا سسٹم" اور "شریعت کا مزاج"، قیاس اور اس کی علل، یہ بھی تو انسانی مساعی کے نتائج ہوں گے۔ باقاعدہ ظن سے بھاگ کر آپ ذوقی اور بے قاعدہ ظن کے زیرِ سایہ آ گئے اور مسلکِ اعتدال کی تلاش میں بے اعتدالی کا شکار ہو گئے۔ ولتنظر نفس ما قدمت لغدا۔

احادیث میں یقین اور ظن

ائمہ حدیث کی نظر میں قرآن عزیز اور متواتر احادیث سے یقین حاصل ہوتا ہے اور متواتر احادیث کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے، تواتر لفظی، تواتر معنوی، تواتر عملی کی تعداد سنت کے دفاتر میں کثرت سے موجود ہے لیکن دین کے تمام شعبوں میں تواتر نہیں پایا جاتا بلکہ اس کے لئے آحاد ہی کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔ آحاد سے جو علم حاصل ہوتا ہے اسے بعض اہل علم نے ظن سے تعبیر کیا۔ گویا تواتر سے دوسرے مرتبہ پر جو علم حاصل ہوتا ہے اسے اصطلاحاً ظن کہا جاتا ہے۔ ظن زندگی کے تمام شعبوں میں پایا جاتا ہے۔ دینی اعمال کا فائدہ ظنی ہے۔ دنیا کے کاروبار اور ان کے نتائج ظنی ہیں، لغت ظنی ہے، الفاظ کی دلالت ظنی ہے، کعبہ کی سمت کا فیصلہ بعض اوقات ظن سے کیا جاتا ہے، جس ظن پر پوری زندگی کا انحصار ہے اسے نہ شرع نظر انداز کر سکتی ہے نہ عرف اور رواج۔ قرآن مجید نے اس ظن کو مستند سمجھا اور اس پر احکام مرتب کئے۔ حضرت موسیٰ نے ایک ظنی اطلاع پر مصر سے ہجرت کی، ایک لڑکی کی اطلاع پر مصر میں اسی جگہ پہنچے جہاں مدت تک قیام فرمایا۔ وادیِ سینا پر طور کا نظارہ ایک ظن کی بنا پر دیکھا اور نبوت سے سرفراز ہوئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے

محض امید کی بنا پر فلسطین میں قیام فرمایا اور ایسے ہی گمان کے پیش نظر حضرت اسمٰعیلؑ کو مع حضرت ہاجرہ حجاز کے ویرانہ میں اقامت کا حکم دیا۔ حضرت یوسفؑ کو خواب کی تعبیر کے صلہ میں جیل سے رہائی ملی اور اس کے ظنی عواقب کے پیش نظر حکومت سے سرفراز ہوئے کنعان سے حضرت یعقوبؑ نے خبرِ واحد کی بناء پر مصر کے سفر کی تیاری فرمائی۔ حضرت موسیٰؑ نے تیہہ کی زندگی اس گمان پر اختیار فرمائی کہ بنی اسرائیل کو کسی وقت آرام ملے گا۔ غرض قرآنِ حکیم نے اخبار احاد اور ظنی اطلاعات کو اس استناد کے ساتھ بیان فرمایا گویا اس میں وثوق اور یقین پایا جاتا ہے۔ عز بن عبدالسلام نے القواعد الکبریٰ کے شروع میں وضاحت سے لکھا ہے کہ دنیا اور آخرت کے معاملات کا بہت حد تک ظن پر انحصار ہے، اس لئے امت نے ظن کی اصطلاح استعمال فرمانے کے باوجود آحاد اور ظنیات کو دین میں اسی قدر اہمیت دی ہے جس طرح ایک مستند چیز کو اہمیت دی جانی چاہیئے۔ ظن کے اس اصطلاحی مطلب کو سمجھ لینے کے بعد یہ خیال کرنا کہ شریعت میں ظن کے لئے کوئی گنجائش نہیں، غلط ہے اور محض ایک وہم۔ بلکہ مظنونات کو "غیر ثابت شدہ" کہنا یا سمجھنا بھی غلط ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ظنیات کا مقام تواتر کے بعد ہے یا ظنون مصطلحہ تواتر سے متعارض نہیں ہو سکتے۔

فنِ حدیث اور عقل یہ بھی صحیح نہیں کہ احادیث کی تنقید میں درایت کو اہمیت نہیں دی گئی، یا محدثین کا نقطۂ نظر اخباری تھا فقہی نہ تھا بلکہ جہاں تک عقل اور درایت کا مقام ہے اس کا پورا پورا احترام فرمایا گیا ہے۔ اہل حدیث اور فقہاء کے طریق فکر میں اختلاف کا مطلب قطعاً نہیں کہ ائمہ حدیث تفقہ سے بے خبر تھے، اختلاف تو خود فقہائے عراق میں بھی موجود ہے۔ علامہ دبوسی کی تاسیس النظر سے ظاہر ہے کہ فقہاء رحمہم اللہ میں اصولی اختلافات موجود ہیں۔ یہ سب طریق فکر کا نتیجہ ہے، نہ فقہاء حدیث سے بے بہرہ ہیں نہ ائمہ حدیث

فقہ سے بے خبر۔ اختلاف کی وجہ صرف طریقِ فکر میں اختلاف ہے، اور نہ درایت اور ہیرے کی جوت سے یہ جوہری کوئی بھی بے خبر نہ تھا۔ رحمہم اللہ واسعۃً۔ ابن قیمؒ اپنے شیخ حافظ ابن تیمیہؒ سے نقل فرماتے ہیں:

قال وقد تدبرت ما امکننی عن ادلۃ الشرع فما رأیت قیاسا صحیحا یخالف حدیثا صحیحا کما ان المعقول الصحیح لا یخالف المنقول الصحیح بل متی رأیت قیاسا یخالف اثرا فلا بد من ضعف احدھما الخ

(اعلام الموقعین ص۲۲، ج۲)

" حسبِ امکان میں نے شرعی دلائل پر غور کیا ہے، میں نے صحیح قیاس کو صحیح حدیث کے خلاف نہیں پایا، جس طرح عقلِ صحیح نقلِ صحیح کے کبھی خلاف نہیں ہوتی جب قیاس کسی اثر کے خلاف ہوتا ہے تو ان میں سے ایک ضرور ضعیف ہوتا ہے، لیکن قیاس صحیح اور فاسد میں تمیز کرنا آسان نہیں "

اسی قسم کی صراحت امام شافعیؒ اور شاہ ولی اللہ سے بھی منقول ہے جسے طوالت کی وجہ سے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قیاس اور عقل ایک چیز نہیں ہے، قیاس بھی عقل کے خلاف ہو سکتا ہے، اس لئے اصول فقہ کے قواعد کو عقلی اصول سمجھنا قطعاً غلط ہے۔ یہ اصول ایک خاص طریقِ فکر کی ترجمانی کرتے ہیں جس کی وضاحت شاہ صاحب نے حجۃ اللہ، انصاف اور عقد الجید وغیرہ میں فرمائی ہے اس لئے اصولِ فقہ کو اصولِ عقلیہ سمجھنا کم فہمی ہے اور سادگی۔

ابن جوزی رح فرماتے ہیں۔ ما احسن قول القائل اذا رأیت الحدیث یباین المعقول او یخالف المنقول او یناقض الاصول فاعلم انہ موضوع

(تدریب شرح تقریب ص۱۰۰)

ابوبکر بن طیب نے فرمایا، وضع کی یہ بھی نشانی ہے کہ وہ عقل کے خلاف ہو اور اس کی کوئی توجیہ نہ ہو سکے اور جو حدیث حس اور مشاہدہ کے خلاف ہو وہ بھی موضوع ہوگی

قرآن مجید اور سنت متواترہ کے خلاف ہو، یہ بھی موضوع ہو گی اور جو اجماع کے خلاف ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ (تدریب الراوی ص ۹۹) سخاوی نے بھی فتح المغیث میں اس کے قریب قریب ارشاد فرمایا ہے۔

مولانا اصلاحی اور مودودی صاحب کے مضامین میں نقدِ حدیث کے متعلق جن نکات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ محدثین کی نظر اس سے بہت آگے ہے۔ یہ کس مسخرے نے آپ حضرات کو بتایا کہ محدثین نے اصولِ درایت کو نظر انداز کر دیا یا ان کا نقطۂ نظر صرف اخباری تھا۔ پورے وثوق سے عرض کروں گا کہ نقدِ حدیث کے متعلق فقہاء عراق نے عقل کی روشنی میں آج تک کوئی اصل وضع نہیں کی، یہ مولانا شبلی مرحوم اور مولانا مودودی کا ایک ایسا خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں۔ یہ ایک ایسا تخیل ہے جس کا نفس الامر سے کوئی تعلق نہیں۔ تنقید حدیث کے متعلق آج تک جو کچھ ہے عقلی ہو یا نقلی، روایت کے نقطۂ نظر سے ہو یا درایت کے لحاظ سے، سب ائمہ حدیث کی مساعی کا مرہونِ منت ہے، یہ میرا ہی خیال نہیں بلکہ آج سے چند سال قبل مولٰنا عبدالجبار عمر پوری، مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولٰنا عبدالسلام مبارک پوری رحہ نے بھی پوری آواز سے اس کا اعلان کیا۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ان کے اتباع و احفاد یہ سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہیں لیکن خاموشی پر مجبور ہیں انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اصول اور قیاس میں ائمہ عراق کی کوششیں قابلِ صد ہزار تحسین ہیں، ان کی موشگافیاں علمی حلقوں سے داد حاصل کر چکی ہیں، لیکن معلوم ہے کہ وہ عقل کے اصول نہیں بلکہ وہ ایک خاص طریق فکر کی تخریجات ہیں جن کی غیر معقولیت جماعت اسلامیہ کے حلقوں میں بھی مسلّم ہے۔ حال ہی میں مولانا اصلاحی کا ایک پُر مغز مقالہ زکوٰۃ کی تملیک کے متعلق شائع ہوا جس میں احناف کے مسلک پر کھلی اور کڑی تنقید فرمائی گئی تھی اور مولانا مودودی نے بھی اپنے رسالہ پردہ میں بعض فقہی مسائل پر بڑی بے لاگ

تنقید کی تو یہ خیال ہمارے اور آپ کے حلقوں میں مسلم ہے، اس لئے اس بحث میں آپ حضرات کا وقت ضائع کرنا مناسب نہیں۔

اصل نزاع بحث اس میں نہیں کہ فہم اور تنقیدِ حدیث میں محدثین کے نزدیک عقل اور درایت کو دخل ہے یا نہیں کیونکہ پورے دین کا خطاب عقلمندوں سے ہے بلکہ بحث اس میں ہے کہ آیا ہر مدعی عقل کو یہ اجازت دے دی جائے کہ وہ کتاب و سنت کو اپنی عقل کی سان پر رکھ کر پرکھنا شروع کر دے اور جو حکم اس معیار پر پورا نہ اتر سکے اس کا انکار کر دیا جائے یا اسے ماخذ کے لئے تعصب سے تعبیر فرما کر حقارت کی نگاہ سے ٹھکرا دیا جائے۔ آیا عقل و درایت کو احادیث و سنت کے اس قتلِ عام کی اجازت ہونی چاہیئے؟ ائمہ اور حفاظِ حدیث اور آج کے گنہگار اہل حدیث اس کے مخالف ہیں اور انشاء اللہ رہیں گے، الفاظ کی تعبیر میں تنوع اور اسالیبِ کلام میں ہیرا پھیری سے حقائق نہیں بدل سکتے۔

جدید قیادتوں کے طریقِ فکر اور اہل حدیث کے طریقِ فکر میں بیّن اور کھلا اختلاف ہے، قدم اٹھانے سے پہلے پوری طرح سوچنا چاہیئے۔ اور جدید نظریات کے احتساب سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ مسائل چھان پھٹک اور بحث و نظر سے حل ہوتے ہیں، زبان درازی سے نہیں۔ میری رائے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نظریات نہ صرف مسلک اہل حدیث کے خلاف ہیں بلکہ یہ نظریات تمام ائمہ حدیث کے بھی خلاف ہیں۔ ان میں آج کے جدید اعتزال و تجہم کے جراثیم مخفی ہیں۔

آخری گذارش

مولانا نے سائل کا جواب نمبروار دیا ہے۔ میں نے ضروری مباحث کو لے لیا ہے اور اپنے مسلک کی حسب ضرورت وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ نمبر ۶، ۷ کے

متعلق بعض چیزیں کہی جا سکتی تھیں، لیکن میں نے اسے نظرانداز کر دیا۔ اس میں جماعتِ اسلامی کی تعریف میں مبالغہ آمیزی ہے۔ جماعتی پراپیگنڈا اور دعایت ہے اس کا مولانا کو حق حاصل ہے۔ حضری دعوت اور دعایت کا یہی طریق ہے اور بعض حصص میں مولانا مودودی صاحب سے عشق اور ان کے محاسن کا تذکرہ، ان کے علم، طریقِ کار اور جرأت کا اشتہار ہے گو اس میں کتنا ہی مبالغہ اور تمادح ہو مگر کسی نظم کے ساتھ وابستگی کا یہ لازمی نتیجہ ہے، اس کا مولانا کو پورا حق ہے۔ اصل موضوع پر بقدرِ ضرورت گذارش کرنے کے بعد یہ چیزیں میرے موضوع سے باہر ہیں۔ اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه۔

ان گذارشات کو یہاں ختم کرتے ہوئے طویل سمع خراشی کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ انتہائی اختصار کے باوجود گذارشات خاصی طویل ہو گئی ہیں اور مکرر گذارش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میرے دل میں دونوں بزرگوں کے لئے پورا احترام ہے۔ لیکن میں نے اپنے مسلک کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اگر کوئی لفظ آپ حضرات کی شان کے خلاف ہو تو بصمیمِ قلب اس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ لیکن اپنے مسلک کو کسی مصلحت پر قربان کرنا میرے لئے مشکل ہے۔

وا ماحب لیلی فلا اتوب۔

دوسرا مقالہ تمام ہوا۔

۳
تیسرا مقالہ
سنّت
قرآن کے آئینہ میں

سنّت قرآن کے آئینہ میں

حدیث اور سنت عموماً ہم معنی استعمال ہوئے ہیں۔ آنحضرتؐ کے قول، فعل، تقریر اور اجتہاد پر یہ دونوں لفظ بولے گئے ہیں۔ آنحضرت کے ارشادات اسی قدر قابلِ احترام ہیں جس طرح آنحضرتؐ کی ذاتِ مقدس۔ قرآن کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر پیغمبر کا اپنے دور میں یہی مقام ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۴ : ۶۴) ہر پیغمبر صرف اس لئے بھیجا جاتا ہے کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ بعض انبیاء پر خاص آسمانی کتابیں نازل کی گئیں جیسے توریت، انجیل، زبور، قرآن، صحفِ موسیٰؑ و ابراہیمؑ اور بعض پر صرف احادیث ہی نازل ہوئیں، وہی ان کی شریعت تھی اور وہی احکام، حضرت اسمٰعیل، اسحاق، یونس، لوط، ہود وغیرہ علیہم السلام اسی قسم کے انبیاء تھے۔ ان پر بظاہر احادیث کے سوا کچھ بھی نازل نہیں ہوا۔ ان کی احادیث کی مخالفت کی وجہ سے ان کی امتوں پر عذاب نازل فرمایا گیا اور وہ رہتی دنیا تک بدنام ہوئے۔ ان انبیاء کے متعلق کسی خاص کتاب کا ذکر نہیں فرمایا گیا اور نہ ہی احادیث میں ایسا تذکرہ آیا ہے۔

آنحضرتؐ کی طرف دونوں قسموں کی وحی نازل فرمائی گئی۔ اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ (۴ : ۱۶۳) ہم نے تم پر اسی طرح وحی نازل کی جس طرح نوح علیہ السلام اور ان کے بعد آنے والے انبیاء پر نازل ہوئی۔ یعنی قرآن بھی نازل فرمایا گیا اور حدیث و سنت بھی۔

وحی کے مختلف طریقے

وحی کے طریقوں کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوا :-

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (۴۲ : ۵۱)	انسانوں کے ساتھ گفتگو میں ہمارے اللہ تعالیٰ کے تین طریقے ہیں۔ دل میں الہام فرمایا[۱] پردہ آواز یا فرشتہ[۳]، بصورت پیغمبر آجائے اور پیغام دے جائے۔

پہلے انبیاء کے متعلق ممکن ہے کہ ان تینوں طریقوں کے مجموعہ سے انھیں مخاطب نہ فرمایا گیا ہو بلکہ کسی طریق سے ان پر وحی نازل ہوئی ہو لیکن آنحضرتؐ کے متعلق فرمایا :

كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (۴۲ : ۵۲)	ہم نے تم پر اپنا امر اسی طرح وحی کیا۔

یہ حدیث شریف کی وحی کے طریقے ہیں۔ قرآن عزیز کے طریق نزول کی وضاحت یوں بیان فرمائی۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ‌+ (۲۶ : ۱۹۳)	قرآن پاک بواسطہ روح الامین تمہارے دل تک پہنچایا گیا۔ تاکہ تم ڈراؤ۔

اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ خود قرآن عزیز سے معلوم کیا جائے ۔ کہ ارشاد نبوی ص اور ان کی اہمیت قرآن کی نظر میں کیا ہے ؟ مستقبل کی مشکلات، رواۃ کے حفظ، عدالت، شذوذ اور علل کے نقائص مُنزّلِ قرآن کی نظر سے پوشیدہ نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم تھا کہ سلسلہ روایت سے شکوک وشبہات اور ظنون کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اس کے باوجود اگر قرآنِ عزیز، احادیث یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی اہمیت کو قبول فرمائے تو ہمیں اعتراض کا حق نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن علم کے اس شعبہ کو علیٰ علاتہٖ قبول فرماتا ہے۔ ظنون اور شبہات کے باوجود اس کی ضرورت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (۴۲ : ۵۱)	انسانوں کے ساتھ گفتگو میں ہمارے اللہ تعالیٰ کے تین طریقے ہیں۔ دل میں الہام[۱] غیر مرئی پردہ آواز یا فرشتہ[۳]، بصورت پیغمبر آجائے اور پیغام دے جائے۔

پہلے انبیاء کے متعلق ممکن ہے کہ ان تینوں طریقوں کے مجموعہ سے انھیں مخاطب نہ فرمایا گیا ہو بلکہ کسی طریق سے ان پر وحی نازل ہوئی ہو لیکن آنحضرت ؐ کے متعلق فرمایا:

كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (۴۲ : ۵۲)	ہم نے تم پر اپنا امر اسی طرح وحی کیا۔

یہ حدیث شریف کی وحی کے طریقے ہیں۔ قرآن عزیز کے طریق نزول کی وضاحت یوں بیان فرمائی۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ (۲۶ : ۱۹۳)	قرآن پاک بواسطہ روح الامین تمہارے دل تک پہنچایا گیا۔ تاکہ تم ڈراؤ۔

اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ خود قرآن عزیز سے معلوم کیا جائے۔ کہ ارشاد نبوی ؐ اور ان کی اہمیت قرآن کی نظر میں کیا ہے؟ مستقبل کی مشکلات، رواۃ کے حفظ، عدالت، شذوذ اور علل کے نقائص منزّلِ قرآن کی نظر سے پوشیدہ نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم تھا کہ سلسلہ روایت سے شکوک وشبہات اور ظنون کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اس کے باوجود اگر قرآنِ عزیز، احادیث یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی اہمیت کو قبول فرمائے تو ہمیں اعتراض کا حق نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن علم کے اس شعبہ کو علیٰ علّاتہٖ قبول فرماتا ہے۔ ظنون اور شبہات کے باوجود اس کی ضرورت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ

تعلیم قرآن کا ایک جز ہے اور وہ نقائص جن سے ہمارے شبہات میں اضافہ ہو رہا ہے اور جسے ہم شک، ظن یا وہم سے تعبیر کرتے ہیں۔ قرآن کی نظر میں یہ کوئی عیب نہیں ہے لہذا اس کی بنا پر احادیث کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ اگر حدیث کی حیثیت عام تاریخ حوادثِ روزگار کی ہوتی اور اسے کوئی غیر معمولی اہمیت حاصل نہ ہوتی تو قرآنِ مجید اسے اتنی اہمیت نہ دیتا اور اس کے متعلق اتنے گہرے اور مضبوط ارشادات نہ فرماتا اور نہ ہی اسے بار بار دہراتا۔

قرآن مجید میں احادیث کا تذکرہ

قرآن عزیز میں احادیث کا تذکرہ دو طرح پر ملتا ہے ۱۔ رسول کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے الگ باستقلال ذکر فرمانا ۲۔ آیات میں ایسے مقاصد کا ذکر جن کی تکمیل حدیث کے سوا نہ ہو سکے۔ اس کے ذیل میں اُن آیات کا ذکر آئے گا جن میں دونوں قسم کے تذکرے موجود ہوں۔

۱۔ مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔

(۷ : ۵۹) رسول جو کچھ تمہیں دیں اسے لے لو اور جس سے روکیں رک جاؤ اٰتٰكُمْ کو یہاں نَهٰكُمْ کے مقابلہ میں رکھا گیا ہے اور نہی کے مقابلہ میں امر ہوتا ہے اسلئے اٰتٰكُمْ کے معنی اَمَرَكُمْ ہوں گے۔ یعنی آنحضرتؐ کے امر پر سختی سے عمل کرو۔ امر کا مفاد وجوب ہے اور نہی کا تقاضا حرمت، یعنی آنحضرتؐ جس چیز کا حکم فرما دیں اس کی پابندی واجب ہوگی اور جس چیز سے روکیں اس کا کرنا حرام ہوگا۔ آیت کا عموم آنحضرتؐ کی اطاعت کے وجوب پر مشتمل ہے فَخُذُوْهُ میں اسی وجوب و تاکید کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ آیت کو تقسیم غنائم پر محمول کیا جائے تو بھی اصل مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس میں بھی تقسیم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے امر و نہی کی بنا پر ہوگی۔ اس میں تشریع کے اختیارات آنحضرتؐ کو تفویض فرمائے گئے۔ وجوب و تحریم دونوں میں آنحضرت کے ارشادات کو قطعی اور حتمی بتایا گیا اور لوگوں پر فرض کیا گیا۔ آنحضرتؐ کے امر و نہی کے

بعد صرف اسی کی تعمیل کی جائے کسی دوسری چیز کے انتظار کی ضرورت نہیں۔ ہمارے نزدیک حجیتِ حدیث کا یہی مطلب ہے۔

۲۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۴: ۶۴)

ہم نے رسول بھیجا ہی اس لئے ہے کہ لوگ اس کی اطاعت کریں۔ اس آیت میں رسالت کا مقصدِ حقیقی اطاعت قرار دیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص رسالت یا رسول کو تسلیم تو کرتا ہے لیکن اس کی اطاعت اور اس کے احکام کے سامنے انقیاد کو ضروری نہیں سمجھتا، تو یقین کرنا چاہئے کہ وہ نبوت کی غایت اور اس کے مقصد سے ناواقف ہے کسی چیز کی غایت اور مقصد سے انکار کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی افادی حیثیت سے انکار کر دیا گیا اور اسے بے سود سمجھا گیا۔ معلوم نہیں کہ اس کے بعد کفر و فجور کس چیز کا نام رکھا جائے گا اور چونکہ پیغمبر کو یہ مقام اللہ تعالیٰ کے اذن سے ملا ہے لہٰذا اس مقام کا انکار اللہ تعالیٰ کے ساتھ اعلانِ جنگ ہوگا۔ اعاذنا اللہ من ذٰلک۔

۳۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (۴: ۶۵)

خدا کی قسم ان میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک یہ لوگ آپؐ کو حاکم نہ مانیں۔ پھر آپ کے فیصلوں کو دلی رضامندی سے بے چون و چرا تسلیم نہ کریں۔

اس آیت میں چند امور قابلِ غور ہیں:

۱۔ باہمی نزاع اور اختلاف کا ذکر اصول موضوعہ اور مسلمات کی طرح فرمایا گیا ہے اور یہ اختلاف طبائع کا لازمی نتیجہ ہے یعنی اختلاف ضرور ہوگا۔

۲۔ پھر اس کے رفع کی صورت صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ ہے اور آپ کا حکم۔

۳۔ اس کے قبول میں دل کے وساوس اور خطرات کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔

۴۔ معلوم ہوا کہ یہ نزاع اور فیصلہ دونوں قرآن عزیز کے علاوہ ہیں، اگر اس سے مراد دنیا کے باہمی جھگڑے بھی لئے جائیں اور رسول کے فیصلے کی حیثیت امیر اور حاکم وقت کے حکم کی ہو تو بھی اصل حجیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ آیت کا عموم دونوں کو شامل ہوگا۔

مگر رسول کی حیثیت منقسم ہوگی۔ دنیوی حیثیت سے وہ حاکم اور امیر ہے اور اپنے روحانی منصب کے لحاظ سے وہ پیغمبر ہے، اگر دنیوی حیثیت سے اس کے فیصلہ کے انکار سے ایمان کی نفی ہو سکتی ہے تو اس کے روحانی منصب سے اختلاف یا اسکی حجیت کا انکار تو بطریقِ اولیٰ ایمان کی موت کے ہم معنی ہوگا۔ اس لئے یہ آیت حجیتِ حدیث میں نص ہے۔ فاین المفر

۴۔ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (۳۳ : ۳۶)

اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے کے بعد کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنی صوابدید اور پسند کو اس امر میں مداخلت کا موقع دیں اور اگر کسی نے اسکی خلاف ورزی کی تو اس کی گمراہی بالکل ظاہر ہے۔

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کی قبولیت شرطِ ایمان قرار پائی ہے۔

۲۔ فیصلہ کے بعد ذاتی پسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳۔ اور اگر کوئی اپنی پسند پر اصرار کرے اور صوابدید کے مطابق فیصلہ کی سعی کرے تو اس کے لئے ضلال مبین کی وعید موجود ہے۔

۴۔ اس قسم کے اختیار سے دستبرداری شرط ایمان قرار پائی ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور اجتہاد کی حجیت اس آیت سے بالکل واضح ہے اور اہلحدیث کا اس سے زیادہ کوئی جرم نہیں کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام

کو اس سے پست نہیں دیکھنا چاہتے۔ ہر صاحب امر کا حکم اپنے حلقۂ اثر میں حجت تصور کیا جائے لیکن رسولؐ کو اس معقول اور واجبی حق سے محروم رکھا جائے۔ کیوں؟

در حیرتم تمام کہ ایں چہ بوالعجبی است

۵۔ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ۭ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (۲۴ : ۶۳)

رسول کی دعوت اور پکار کو تم اپنی باہمی پکار و دعوت کی طرح مت سمجھو (بلکہ رسول کی پکار واجب القبول ہے) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو دوسروں کی آڑ میں حیلوں اور بہانوں سے آنحضرتؐ کی اطاعت سے بچنا چاہتے ہیں۔ جو لوگ آنحضرتؐ کے امر کی مخالفت کرتے ہیں انھیں ڈرنا چاہیئے کہ کہیں کسی آزمائش یا دردناک عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

اس آیت کی تصریحات پر غور فرمائیے:

۱۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پکار کا حکم لوگوں کی معمولی اور معتاد گفتگو سے مختلف ہے (باہمی گفتگو میں ایک دوسرے کی مخالفت کی جا سکتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے) یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔

۲۔ حیلوں بہانوں سے دوسروں کی آڑ میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ منافقین کا طریق ہے۔

۳۔ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی مخالفت کرتے ہیں (انھیں حجت نہیں سمجھتے) وہ عذاب الیم کے مستحق ہیں۔ یخالفون عن امرہٖ کا لفظ مخالفین کے لئے از بس غور طلب ہے۔

۶۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ　　نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور

وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (۲۴ : ۵۶)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو تم پر رحم کیا جائے ۔
فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَاللّٰہُ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۔ (۵۸ : ۱۳)	نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرو اور اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال سے خوب واقف ہے۔

ان دونوں آیات میں نماز اور روزہ کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ نور، سورۂ احزاب، سورۂ مجادلہ میں مقامِ رسالت اور اس کی اطاعت کا ذکر کثرت سے آیا ہے اور اس کی تاکید کے لئے اسلوبِ بیان میں عجیب حکیمانہ تصرف فرمایا ہے۔ جس کی خوبی کا لطف وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جن کو عربی زبان سے کچھ تعلق ہے۔

سورۂ نور میں الرسول کو بقید تعریف ذکر فرمایا ہے جس سے مراد صرف مُحَمَّدٌ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور سورۂ مجادلہ میں اللہ اور رسول دونوں کا ذکر فرمایا ہے۔ مطلب ایک ہی ہے۔ اندازِ بیان بے حد لطیف ہے۔ رسولہ میں رسالت کو اپنی قرار دے کر رسول کو بھی اپنا لیا ہے ؎

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا

۷۔ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (۳ : ۳۱)	اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔ تمھاری غلطیاں معاف فرمائے گا اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی محبت ایک مسلمہ مطلوب ہے۔ موحد اور مشرک دونوں اس کی طلب میں کوشاں ہیں۔ فرمایا اس کی راہ صرف میری اتباع ہے اور اس سے نہ صرف

تمھاری محبت کا اظہار ہو گا بلکہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے۔ محب ہونے کے بجائے تمھیں محبوبیت کا مقام حاصل ہو گا اور گناہ معاف ہو جائیں گے۔ محبوب کی لغزشوں سے درگزر کرنا محبت کا طبعی نتیجہ ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کا وجوب کس حکیمانہ انداز سے بیان فرمایا ہے۔ محبت الٰہی کے سرفروشوں اور سرگرداں متوالوں کو محبوبیت کا نسخہ بتا کر ان پر نوازش کی گئی ہے۔ عشق کے آرزو مندوں کو معشوق ہونے کی راہ بتا دی گئی ہے ؎

عزیزاں را ازیں معنی خبر نیست   کہ سلطانِ جہاں باما است امروز

یہ ساری نوازشیں آنحضرتؐ کی اتباع کے ساتھ وابستہ ہیں اور آنحضرتؐ کی عملی اطاعت اس عظیم الشان کامیابی کی ضامن ہے۔ کتنا تعجب ہے کہ آنحضرتؐ کے ارشادات کی حجیت کا انکار کر کے محبت اور محبوبیت کی دونوں راہوں پر پہرے بٹھا دیئے گئے ہیں۔ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ط

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ أَرَاكَ اللّٰهُ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا (۴ : ۱۰۵)

ہم نے تم پر کتاب یقیناً اس لئے اتاری ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی بصیرت سے لوگوں کے فیصلے کرو اور اس سلسلہ میں خیانت پیشہ لوگوں کی حمایت مت کرو۔

۱۔ کتاب حق اتارنے کی علت حکم نبوی کو قرار دیا ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فیصلہ کا حق نہ ہوتا اور فیصلہ قبول کرنا ضروری نہ ہوتا تو آنحضرتؐ پر کتاب اتارنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

۲۔ یہ فیصلہ بھی وحی ناطق سے نہیں ہو گا ارٰىك الله میں یہ وضاحت فرمائی گئی کہ یہ فیصلہ سوچ و بچار اور اجتہاد سے ہو گا اور آنحضرتؐ اپنی رائے سے فرمائیں گے۔

۳۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عہد لیا گیا ہے کہ وہ کسی غلط آدمی کی حمایت نہ کریں گے۔

آیت میں معاملہ دو ٹوک کر دیا گیا ہے ۔ یا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر نزولِ قرآن ہی کا انکار کر دیا جائے یا پھر آنحضرتؐ کے اجتہادات کو بھی من جانب اللہ سمجھا جائے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات محض تاریخی سرمایہ نہیں بلکہ واجب التعمیل احکام اور حقیقتِ ناطقہ ہیں ۔ مَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۔

ایک دھوکہ بعض منکرینِ سنت نے بڑی عنایت فرمائی ۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم احادیث کا انکار نہیں کرتے بلکہ یہ تاریخ کا ایک قیمتی سرمایہ ہے اور مقدس تاریخی دستاویز کَبُرَتْ کَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ مقامِ نبوت کو سمجھ لینے کے بعد اس کا مطلب انکارِ نبوت کے سوا کچھ نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی انتہائی توہین ہے ۔ اس لفظی ملمع سازی کا اس کے سوا کوئی مطلب نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مقام ابن خلدون ، ابن جریر ، ابن کثیر اور دیگر مؤرخین کے پس و پیش ہوگا ۔ ہر آدمی کو اس پر بحث و تنقید کا حق ہوگا ۔ پیغمبر تاریخی مباحث کا تختۂ مشق ہوگا ۔ بحث و نظر کی موشگافیاں نبوت کے ماحول پر محیط ہوں گی ، یہ مقام تمام علماء کا ہے بلکہ بحیثیت مؤرخ یورپ کے ملاحدہ نے بہترین تاریخی سرمایہ علم کی منڈیوں میں بکھیرا ہے جو اہلِ نظر کے لئے دعوتِ فکر کا سامان مہیا کر رہا ہے ۔

ہمارے یہ دوست (اگر شرم و حیا دنیا سے نابود نہیں ہوگئی تو) غور کریں کہ یہ کونسا مقام ہے جو آپ آنحضرتؐ کو عنایت فرما رہے ہیں ۔ ایک شخص اپنے باپ کے متعلق کہتا ہے کہ میں اس کا بیٹا تو نہیں لیکن ویسے وہ شریف آدمی ہے ۔ یورپ کے اکثر بے دین آنحضرتؐ کو مقدس انسان سمجھتے ہیں لیکن پیغمبر نہیں سمجھتے ۔ یہی حیثیت حضرات اہلِ قرآن نے انبیاء کو عنایت فرمائی ہے ۔ وہ دیانۃً سوچیں کہ مقامِ نبوت اور عام علم کے مقام میں کیا فرق رہا ۔ فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۲۴ : ۶۳)

دراصل ان حضرات نے شکست خوردہ ذہنیت پائی ہے ۔ محققین یورپ سے

عقیدت مندانہ تعلق نے اسلام اور اس کے عقائد، انبیاء اور ان کے مقام کو ان کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا ہے۔ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ

بجائے اس کے کہ وہ اس علمی سرمایہ پر فخر کریں جسے صدیوں سے ائمہ امت نے اپنے پیغمبرؑ کی وراثت سے حاصل کیا۔ یہ حضرات اس میں عار محسوس کرتے ہیں۔ اس پر ایمان سے ان کا دل ندامت محسوس کرتا ہے فَقَدْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِهٖ عِلْمًا ط

سنت کے ان حصوں پر جن میں کچھ تاریخی تذکرے موجود ہیں۔ شاید تھوڑی دیر کے لئے یہ لفظ گوارا کیا جا سکے لیکن "اوامر ونواہی"، ترغیب وترہیب، زہد وورع، اخلاق وعبادات اور اذکار وادعیہ پر کیونکر تاریخ کا لفظ بولا جائے۔ ان حضرات نے اس معاملہ میں اس ذہنی سخاوت کا ثبوت دیا ہے جسے علمی بدحواسی سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا بلکہ ان فقرات پر دھوکہ اور دجل ہے جو ایک حوصلہ مند ملحد اور دلیر کافر اور بہادر منکر کے لئے بھی مناسب نہیں۔ ان الفاظ میں نفاق کی بدبو ہے۔ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ط

ایسے الفاظ وہی زبانیں کہہ سکتی ہیں جن کے دل ایمان کی حلاوت سے خالی ہوں
اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ ط

۹۔ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (۱۶ : ۷۵)

آپؐ وحی کی تلاوت میں جلدی نہ کریں متفرقات کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے جب ہم پڑھ چکیں تو تم پڑھو پھر اس کے مقاصد کا بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے۔

ا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نزول وحی کے ساتھ ہی ضبط کرنے کی کوشش فرماتے تا کہ کوئی لفظ حفظ سے رہ نہ جائے۔ اس لئے فرمایا گیا کہ آپ اس فکر سے مطمئن رہیں قرآن کا جمع کرنا اور پڑھانا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔

۲۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۔ بیان کا مطلب یہاں اظہارِ مقاصد کے سوا کچھ نہیں اور یہ جمع اور قراءت سے بالکل مختلف ہے ۔ پہلی دونوں چیزوں کا مقصد الفاظِ قرآن کی حفاظت ہے ۔ بیان سے مقصد اظہارِ مطلب ہے جو وحی کی روح ہے ۔ اگر یہ محفوظ نہ ہو تو ان الفاظ کی حفاظت چنداں مفید نہ ہو گی وہی بیان ہے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قول ، فعل اور تقریر سے بیان فرمایا ۔ اِنَّ حرفِ تاکید کے ساتھ عَلَيْنَا کو مقدم فرما کر بیان کی ذمہ داری بطورِ حصر اپنے ذمہ لے لی کہ بیان صرف ہمارے ذمہ ہے اب سوچنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس بیان کو اس تاکید سے اپنے ذمہ قرار دیا ہے ۔ (۱) آیا ہوا بھی یا نہیں ؟ (۲) محفوظ بھی رہا یا نہیں ؟ آیت سے اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اس بیان کی حفاظت کا ذمہ بھی لے لیا گیا ہے ۔

۳ ۔ اگر رواۃ اور روایت ، اسانید اور رجال کے ظنون وشکوک اسے بیکار کر سکتے تھے ۔ انسانی علوم کی پیش بندیاں اسے غیر مستند کر سکتی تھیں تو پھر اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ کے مؤکد دعوے سے کیا فائدہ ؟

۴ ۔ اگر اس بیان کا مصداق اصطلاحی احادیث نہیں تو پھر یہ بیان دنیا میں کہاں ہے ؟ بہرحال یہ قرآن عزیز کے لفظی وجود سے تو جدا ہے ۔

۵ ۔ اگر یہ بیان واقعی محفوظ نہیں رہ سکا اور یہ تاکید دیندارانہ رکھ رکھاؤ سے زیادہ نہیں تو پھر الفاظ کی حفاظت سے کیا فائدہ ؟ الفاظ کی حفاظت سے معانی اور مقاصد کی حفاظت تو نہیں ہو گی ۔

۶ ۔ اس کے ساتھ اس بات پر بھی غور کرنا ہے کہ آیا لغت کی حفاظت حدیث سے زیادہ کی گئی ہے ؟ آیا قرآن کی زبان (عربی) انقلابات کی زد سے اب تک محفوظ ہے ؟ ان گذارشات پر دانشمندانہ اور دیانتدارانہ غور کرنے کے بعد سنت کی حجیّت واضح ہو جائے گی اور یہ قرآن ہی کا تقاضا ہے اور قرآن ہی کا منشا ۔

۱۰ ۔ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ ہم نے قرآن کو آپ کی زبان پر آسان کر دیا ہے

لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا (۱۹ : ۹۷) تاکہ آپؐ بشارت و انذار دونوں مقاصد پورا کرسکیں۔

الف۔ "لسان" سے مراد عربی زبان ہو یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات بصورتِ سنت وحدیث دونوں احتمال ہوسکتے ہیں۔ میری ناقص رائے میں دوسرا احتمال راجح ہے۔ صرف عربی زبان مراد لینا ٹھیک نہیں۔ یہاں لسان کی اضافت "ك" خطاب کی طرف ہے۔ معلوم ہے کہ عربی زبان لاکھوں آدمی بولتے ہیں اس تخصیص اور اضافت سے کیا فائدہ ؟ عربی زبان میں قرآن کا نزول ایک دوسری خوبی ہے جس کا تذکرہ قرآن نے دوسرے مقامات میں فرمایا ہے۔

اگر "لسان" سے مراد یہاں عربی زبان لی جائے تو لِتُبَشِّرَ میں لام تعلیل بالکل بے کار ہوگا۔ یہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت نہ رہے گی بلکہ ہر اہل زبان ایسا کرسکتا ہے اس طرح آیت کی ترتیب میں کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا۔

ب۔ قرآن کی سہولت اور آسانی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان کے ساتھ مقیّد فرمانے کے بعد اس کی علت کے طور پر دو چیزیں ذکر فرمائی ہیں۔

(۱) اہلِ تقویٰ کے لئے بشارت

(۲) جدال پسند اور خصومت پرست لوگوں کو ڈرانا، معلوم ہے کہ یہ مقصد صرف الفاظ کی تلاوت سے حاصل نہیں ہوسکتا اس کے لئے افہام وتفہیم، وضاحت اور تشریح ضروری ہے اور اس سلسلہ میں عرب زبان دان اور عجمی برابر ہیں۔

اب اگر یہ تشریح اور وضاحت شرعًا حجت نہیں تو انما سے حصر اور اس پر بشارت و انذار کا ترتب، بے مقصد ہوں گے۔ نبوت اور اس کے مقاصد کی پوری عمارت زمین بوس ہوجائے گی۔ ہمارے ان منکرین قرآن نے شاید قرآنِ عزیز کو کبھی سوچ کر نہیں پڑھا۔ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ

۱۱۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا جب تم ان کو اللہ کی وحی اور اس کے رسول کی

اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَاءَنَا اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۵ : ۱۰۴)	طرف دعوت دیتے ہو وہ کہتے ہیں ہمیں رسوم وعادات کافی ہیں جو اپنے بزرگوں سے ہمیں وراثت میں ملی ہیں گو وہ بزرگ علم و ہدایت سے یکسر خالی ہوں۔

"الی الرسول" بصورتِ عطف مذکور ہوا ہے اور معلوم ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ عام حالات میں دونوں مستقل ہوتے ہیں اور مغائر بالذات۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ہمارے پاس روپیہ بھی ہے اور زمین بھی، تو اس مثال میں روپیہ اور زمین ایک نہیں ہو سکتے بلکہ دونوں الگ الگ ہوں گے۔

مولوی عبداللہ چکڑالوی آنجہانی "الرسول" سے مراد بھی قرآن ہی لیتے تھے میری رائے میں یہ جہل عظیم ہے اور عربی زبان سے ناواقفیت پر مبنی۔ اس لئے کہ یہاں دعوتِ "الی الرسول" کا مطلب آنحضرتؐ کی سنت کی طرف دعوت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا اور یہ دونوں بظاہر دو مستقل چیزیں ہیں اور دونوں کی حیثیت مساوی ہے۔ (اوتیت القراٰن ومثلہ معہ) الرسول دعوتِ آسمانی کا ایک مستقل رکن ہے جب ہر سنتِ صالحہ قابلِ اتباع ہے تو سنتِ رسولؐ کو اس سے کیونکر محروم رکھا جائے اسے تو اور زیادہ واجب الاطاعت ہونا چاہیئے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَالَّذِيْنَ	جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں سے منکر ہیں وہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں تفریق قائم رکھیں وہ کہتے ہیں ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ یہ لوگ یقیناً کافر ہیں اور اہلِ کفر کے لئے توہین آمیز عذاب تیار کیا گیا ہے اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر یقین

اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَلَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ اُولٰٓئِکَ سَوْفَ یُؤْتِیْھِمْ اُجُوْرَھُمْ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝ (۴: ۱۵۰-۱۵۲)	رکھتے ہیں وہ ان میں تفریق پسند نہیں۔ ان کو عنقریب ان کا اجر ملے گا۔ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت میں اہلِ کفر اور اہلِ ایمان کا انداز بتایا گیا ہے۔ اہلِ کفر اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں میں تفریق کرتے ہیں۔ بعض کو مانتے ہیں بعض کا انکار کرتے ہیں اور یہ روش یقیناً کفر ہے اور اہلِ ایمان اللہ اور اس کے انبیاء میں تفریق نہیں کرتے یہ لوگ عند اللہ اجر کے مستحق ہیں اور ان کے لئے اللہ کی رحمت اور بخشش یقینی ہے۔

اللہ اور اس کے رسول ذات اور وجود کے لحاظ سے تو الگ الگ ہیں مگر ایمان کے لحاظ سے وہ دونوں ایک ہیں۔ دونوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ان میں تفریق کفر ہے رسول پر ایمان لانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا۔ آیت میں جن لوگوں پر قطعی کفر کا فتویٰ دیا گیا وہ اسی مقام پر تفریق کرتے ہیں بعض انبیاء پر ایمان لا کر بعض دوسرے انبیاء سے کفر کرتے ہیں یا اللہ پر ایمان رکھتے ہیں مگر پیغمبر کا انکار کرتے ہیں۔

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْکَ صُدُوْدًا (۴: ۶۱)	جب انھیں اللہ کے احکام اور رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ منافق تم سے رکتے ہیں۔

سابقہ آیت میں جس تفریق کا ذکر ہے وہ یہی معلوم ہوتی ہے آنحضرتؐ کے ارشادات سے اہلِ کفر و نفاق بھاگتے ہیں۔

اہلِ ایمان کی علامت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ وحی کی بعض اقسام کا اقرار اور بعض کا انکار نہیں کرتے۔ وہ وحی پر کلیتہً ایمان لاتے ہیں۔ ایمان باللہ اور ایمان بالرسول میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

۱۳۔ وَالنَّجْمِ اِذَا ھَوٰی مَا	ستاروں کی ڈوبتی ہوئی روشنی گواہ ہے ک

ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ‎+‎ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ـ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى +

(۱-۵ : ۵۳)

آنحضرتؐ نہ بھولے ہیں اور نہ آپ سے اعتقادی لغزش رونما ہوئی ہے وہ ذاتی خواہش سے نہیں بولتے وہ تو صرف وحی سے فرماتے ہیں جو طاقتور فرشتے کی معرفت ان پر نازل کی جاتی ہے۔

یہاں ضلالت وغوایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت کے تذکرے کے بعد ان کے تمام ارشادات کو وحی فرمایا ہے اور نفسانی خواہشات کی آمیزش سے پاک قرار دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ فداہ ابی وامی کا ہر ارشاد نفسانی خواہشات سے پاک اور وحی الٰہی سے مؤید ہے وہ شرعًا حجت ہوگا اور قابلِ قبول۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى میں جس طرح حصر فرمایا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ رسول بوصف رسالت وحی کے بغیر بولتا ہی نہیں۔ اس لئے اس کی زبان سے قرآن کی تلاوت ہو یا سنت کا بیان وہ اگر بحیثیتِ رسول ہے تو وہ بجز وحی کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ عادی اور دنیوی امور وصفِ رسالت کے تابع ہی نہیں لہٰذا وہ وحی نہیں ہوں گے انھیں آنحضرتؐ ترک فرما سکتے ہیں۔ صحابہ کے مشوروں سے اسے نظر انداز فرما سکتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ کے آراء و افکار کو اس پر ترجیح دے سکتے ہیں۔ جنگِ بدر میں مقامِ جنگ کی تبدیلی بریرہ کو مغیث کے متعلق مشورہ دینا اور بریرہ کو اس سے انکار پر رعایت دینا اس کی دلیل ہے کہ یہ معاملہ بلحاظ نبوت نہ تھا۔

۱۴- اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (۱-۴ : ۹۴)

ہم نے تیرا سینہ کھول دیا اور تمہارا تمام تر بوجھ اتار دیا اور تیرے ذکر کو چاردانگِ عالم میں پھیلا دیا۔ آسانیاں اور مشکلات اس دنیا میں آتی جاتی رہیں گی۔ آپ اپنے

فرصت کے اوقات میں پوری توجہ سے بارگاہ ایزدی میں حاضری دیں۔

اس سورۃ میں متعدد نعمتوں کو بصیغہ استفہام ثابت فرمایا ہے جن سے ظاہر ہے کہ شرحِ صدر کے بعد وہ تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں گی جو غلطی کا منطقہ اور موجب بن سکتی ہیں اور جب وہ تمام بوجھ اتار دیئے جائیں جو اس دنیا میں غلطی اور معصیت کا موجب ہو سکتے ہیں تو پھر ایسی محفوظ اور معصوم شخصیت جس کا دنیا میں اصل وظیفہ ذکرِ الٰہی اور شکر ہے۔ اس کے ارشادات کی حجیت ایک متدین اور عقلمند آدمی کی نظر میں کیونکر مشتبہ ہو سکتی ہے۔

اگر عام اربابِ تاریخ اور غیر معصوم علماء کی طرح اس کے اقوال پر بحث ہو سکے انھیں غلط اور ناقابلِ حجت قرار دیا جا سکے تو رفعِ ذکر کی صورت کیا ہوگی۔ اس کا ذکر تو عامۃ الناس کی طرح ٹھہرا وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ تو صرف وعدہ ہی رہا اس کی عملی صورت تو واضح نہ ہو سکی۔

امت سے بھی اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو شرح صدر کی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے انھیں دنیا کی قیادت سے بھی نوازا ہے اور یہ مقدس قیادت ہی دنیا کے لئے کامیابی اور سربلندی کی ضامن قرار پا سکتی ہے۔

ان عمومی القابات پر ایک نگاہ ڈالئے جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فداہ روحی کو نوازا گیا اور دوسری طرف منکرینِ حدیث کی اس بے جوڑ حجت نوازی کو ملاحظہ فرمائیے کہ اس سراپا علم و دانش پیغمبر کے ارشادات امت کے لئے حجت ہی نہیں تو آپ محسوس فرمائیں گے کہ ان دونوں مقامات میں نہ ربط ہے نہ جوڑ۔ کجا وہ رفعت کہ ذاتِ حق نے انھیں اپنے مخصوص خطاب سے سرفرازی بخشی اور کجا یہ انحطاط اور پستی کہ اس پاک باز اور مقدس شخصیت کے ارشادات کو شرعًا کوئی اہمیت ہی حاصل نہیں۔ این الثریا من الثریٰ واین الحضیض الدانی من السموات العلےٰ۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (۵ : ۳)

میں نے آج تمھارے لئے دین کو کامل کر دیا اور اپنے انعامات کی بارش برسا دی اور اسلام ہی تمھارے لئے پسندیدہ دین قرار پایا۔

اس آیت کا بظاہر حدیث کی حجیت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں صرف دین کی تکمیل کا تذکرہ ہے لیکن جب ہم کامل دین کے مختلف شعبوں کو دیکھتے ہیں، عبادات، معاملات، مغازی، سیر، معاشی اور بین الاقوامی مسائل پر غور کرتے ہیں تو قرآنِ عزیز کو ایک اصولی کتاب اور آئینی صحیفہ تصور کرنے کے بعد تفصیلات کے لئے ذہن میں تشنگی سی محسوس ہوتی ہے۔ اب اس تفصیل کے لئے اگر علماء کا بورڈ مقرر کیا جائے یا کسی ذہین آدمی کو مرکزِ ملت بنا کر اس کی طرف رجوع کیا جائے تو یہ پورا غیر معصوم ماحول، ظنون و اوہام اور شکوک و مزخرافات کی ایک گٹھڑی ہوگی جیسے ایک پاگل کے سر پہ رکھ کر اسے اندھے اونٹ پر سوار کر کے مہار اس کے ہاتھ میں دے دی جائے تاکہ وہ اس موہوم امانت کو اپنی مرضی سے بانٹتا پھرے ؎

کبھیمۃ عمیاء قادھا ماھا
اعمی علی عوج الطریق الحائر

اگر یہ ظنون و اوہام دین قرار پا سکتے ہیں تو پھر خبرِ واحد نے کیا جرم کیا ہے۔ کہ اسے ساقط الاعتبار قرار دیا جائے اور علم الاسناد نے کونسا گناہ کیا ہے کہ اس پہ تابڑ توڑ حملے کئے جا رہے ہیں۔ رجال اور اصولِ حدیث ایسے معقول اور متعارف فن کو کیوں نظر انداز کیا جا رہا ہے جس نے لاکھوں آدمیوں کی زندگیاں نکھار کر رکھ دیں اور فنِ روایت و درایت کو چھان پھٹک کر دنیا کو تاریخ کے اصولوں پر تنقید کا راستہ دکھایا اور تاریخ کو قصہ گوئی کے افسانوی دور سے نکال کر ایک منقح اور مستفد فن کی حیثیت دے دی۔ اب دو ہی راہیں ہو سکتی ہیں یا تو اسے کسی خاندان یا بستی کا رواج،

قانون قرار دے لیا جائے اور اس کی غیر محدود وسعتوں سے آنکھیں بند کر لی جائیں یا سنت کو حجت تسلیم کر لیا جائے۔

اسلام کی وسعتیں

اگر اسلام پوری دنیا کے لئے ہے اور اس کی وسعتیں پوری کائنات پر محیط ہیں۔ وہ حقیقت ہے افسانہ نہیں اور اس کا انحصار یقینیات یا مظنونات علمیہ مستندہ پر ہے تو پھر تکمیلِ دین کے لئے سنت اور فنِ حدیث کی خدمات سے گریز ناممکن ہے اس سے عبادات، معاملات، معاشیات، سیاسیات، حروب اور بین الاقوامی مسائل تک راہنمائی ملتی ہے اور وہ بھی وحی اور نبوت کی زبان سے جس کے سامنے ہزار مرکزِ ملت گھٹنے ٹیک چکے ہیں اور آئندہ بھی سرنگوں رہیں گے۔ عقل و شعور رکھنے دنیا میں ان مراکزِ ملت کو استشہاد اور یقین کا وہ مقام کبھی حاصل نہیں ہو گا۔ جو دفاترِ سنت اور دواوینِ حدیث کو حاصل ہوا ہے۔ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ۔

منکرینِ سنّت کا عجز

دین کی وسعت میں انکارِ حدیث سے جو خلا پیدا ہوا تھا اسے پاٹنے کی پون صدی کی کوششیں تو ہمارے سامنے ہیں، اس عرصہ میں بیچاری نماز ہی ان علماء کا تختۂ مشق رہی آج تک یہ اربابِ تحقیق نماز کے وقت ہیئت اذکار، نوافل و فرائض واجبات رکعات اور ارکان تک کا فیصلہ نہیں کر سکے جو لوگ اتحاد کا نعرہ لگا کر اختلافات سے بچنے کا عہد لے کر نکلے تھے۔ اب تک سراپا اختلاف ہیں۔ صرف قرآن پر اعتماد کرنے

کے بعد وہ چند گھڑیاں بھی اتفاق سے نہیں گزار سکے۔

اس امتِ مسلمہ کے حج و زکوٰۃ، صوم، معاملات، معاشیات اور سیاسیات کو شکر ہے ان حضرات نے چھوا بھی نہیں۔ اگر دین کامل ہے اور اس کی تکمیل کا مطلب وہی وسعت ہے جس کا ذکر اوپر آیا ہے تو سنت اور اس کے دفاتر، احادیث اور ان کے ذخائر کو کیوں کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے ان حضرات کے تراجم، حواشی اور ترجمانیوں کو بڑی نیک دلی اور پورے غور سے پڑھا ہے۔ خدا شاہد ہے ہمیں وہاں علم و یقین کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوا۔

انکارِ حدیث کا پس منظر

انکارِ حدیث احساس کہتری کی پیداوار ہے جس نے گریز پائی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ جب یہ حضرات کسی مخالف کا اعتراض سنتے ہیں تو چونکہ یہ قرآن و سنت اور ان کے مستند ماخذ سے واقف نہیں اور اس کی توجیہ سے ان کا ذہن قاصر ہوتا ہے اس لئے بھاگنا شروع کر دیتے ہیں جس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ نصوص کا انکار کر دیں اور احادیث کے متعلق تو وہ یہی ہتھیار استعمال کرتے ہیں کہ ہم اس حدیث کو نہیں مانتے لیکن جب یہ مصیبت قرآنِ عزیز میں آجائے اور قرآنِ عزیز انکے تبحر فی الجہل کا ساتھ نہ دے سکے تو پھر ایسی تاویلات گھڑتے ہیں جس سے محسوس ہوتا ہے کہ شاید ان کے خیال میں رب العزت اتنی عربی بھی نہیں جانتے جس قدر کہ یہ متبحر فی الجہل جانتے ہیں آپ ابن قتیبہؒ کی تاویل مختلف الحدیث فی الرد علی اعداء اہل الحدیث امام طحاویؒ کی مشکل الآثار اور قمی کی الاحادیث المشکلہ ابن فورک کی مشکل الاحادیث ملاحظہ فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ پرانے اہلِ بدعت حدیث کے کھلے منکر تو نہ تھے لیکن انھیں بعض احادیث اور بعض آیات سے ذہنی الجھن ضرور پیدا ہوئی

انھوں نے بھی دو راہیں اختیار کیں انکار یا تاویل ۔ یہ نتیجہ ہے احساسِ کہتری کا جو قلتِ علم کی وجہ سے پیدا ہوئی ۔

پھر عجیب یہ ہے کہ بعض احادیث کو یہ حضرات قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں لیکن نظام ان سے استدلال کرتا ہے ۔ حدیثِ تعریضاتِ ابراہیمی ہر منکرِ حدیث کے گلے میں اٹک رہی ہے نہ اگلتے بنتی ہے نہ نگلتے لیکن نظام کو دیکھئے وہ جھوٹ کے جواز میں اسی سے استدلال کرتا ہے اور اس حدیث کو اساس قرار دیتا ہے ۔ ان گذارشات میں اگر کوئی تلخی ہو تو میں اس کے لئے دوستوں سے معافی چاہتا ہوں لیکن آرزو یہ ہے کہ ان گذارشات کو بغور پڑھا جائے اور سوچا جائے ۔ پوری امت ایک طرف ہے اور آپ چند افراد ایک طرف ؏

جملہ عالم یک طرف آں شوخ تنہا یک طرف

سنتِ رسول ؐ کی حجیت اور استقلال کا مفہوم قرآن میں اس قدر عام اور واضح ہے کہ سیکڑوں آیات اس موضوع پر جمع کی جا سکتی ہیں ۔ توجہ کے لئے صرف چند آیات زیرِ قلم آئی ہیں تاکہ قرآن مجید کے طالب علم اس نہج پر سوچنے کی کوشش کریں، آئندہ کسی صحبت میں حدیث کی حجت کا تذکرہ آنحضرت ؐ کی سیرت کی روشنی میں ہوگا ۔ اور یہ ایک مستقل عنوان ہے کہ آیا جس شخص کی سیرت اس قدر بلند ہو اس کے اقوال و اعمال کا مقام یا اس کی حیثیت صرف ایک مؤرخ کی ہو گی اور اس کے ارشادات صرف تاریخ کا ایک قیمتی اور مقدس سرمایہ ناظرین اس کا انتظار کریں ۔

قرآن و حدیث کا باہمی ربط

بعض آیات قرآنِ عزیز میں اس طرح مذکور ہوئی ہیں کہ قرآن کا مفہوم حدیث کے بغیر مکمل نہیں ہوتا ۔ یہ قرآن کی آواز ہے جو ضرورتِ حدیث کو ثابت کر رہی ہے ۔ اشارۃ النص کے طور پر قرآن مجید ضرورتِ حدیث کو ثابت فرماتا ہے ۔ منکرینِ حدیث سے مؤدبانہ استدعا ہے کہ بحیثیت طالب علم قرآن میں اس طریق پر بھی غور کی تکلیف گوارا کریں ۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ دلوں کو کھول دے اور قوتِ فہم کو استفادہ کا موقع ملے ۔

۱- اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ (پ۱۰ - ع۱۱)	تحقیق گنتی مہینوں کی اللہ کے نزدیک سال کے بارہ مہینے ہیں۔ کتاب اللہ میں جس دن اس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو۔ ان میں چار مہینے حرام ہیں۔

ان چار ماہ کا ذکر قرآن میں اجمالاً آیا ہے۔ ان میں لڑائی جھگڑے کی ممانعت فرمائی گئی ہے ان میں ابتداءً لڑائی حرام ہے۔ لیکن نہ قرآن میں بارہ مہینوں کے نام مذکور ہیں اور نہ چار ماہ کا کوئی تفصیلی ذکر موجود ہے۔ یہ تذکرہ احادیث میں ملتا ہے یا عرب کی تاریخ میں۔ معلوم نہیں ہمارے اہلِ قرآن کون سا مقدس ذخیرہ قبول فرمائیں گے۔

۲- وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْۤا اَیْدِیَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ (پ۶ - ع۱۰)	چور عورت ہو یا مرد اس کا ہاتھ کاٹ دو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لئے جزاء ہے۔ اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے۔

یَد کا لفظ عربی زبان میں ناخن سے لے کر کندھے تک بولا جاتا ہے۔ قرآن نے اس کے کاٹنے کا حکم دیا ہے لیکن اس کی حد بیان نہیں فرمائی، تواتر عملی سے ثابت ہوتا ہے کہ چور کا ہاتھ کلائی سے کاٹنا چاہیئے۔ اور اس کی بنا سنت پر ہے سنت کی حجیت کا انکار کر دیا جائے تو ہاتھ یا تو بغل سے کاٹنا ہوگا یا کوئی اور مستند شرعی حد تلاش کرنی ہوگی۔ یہ قرآن میں سے سنت کے لئے ایک آواز ہے۔ قرآن کا مفہوم عمل کے لئے سنت کی توضیح کے بغیر صاف نہیں اور یہ دلیل ہے کہ سنت حجت ہے۔

۳- اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ (پ۶ ع۶)	جب نماز کا ارادہ کرو تو منہ کو دھو لو اور ہاتھوں کو کہنیوں تک اور سر کا مسح کرو اور پاؤں ٹخنوں تک دھو ڈالو۔

÷ ÷ ÷ ÷

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ۔

(پ ۶۔ ع ۴)

اگر بیماری کی وجہ سے پانی کا استعمال مضر ہو یا حالتِ سفر ہو اور پیشاب یا پاخانہ یا لمس کی وجہ سے وضو ٹوٹ جائے اور پانی دستیاب ہو سکے تو تیمم کے لئے پاکیزہ مٹی منہ اور ہاتھوں پر مل لو۔ اللہ تعالیٰ مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا اور اپنی نعمت کو پورا کرنا چاہتا ہے تاکہ تم شکر کرو۔

اس آیت میں وضو اور تیمم کی وضاحت کی گئی ہے۔ وضو اس سے پہلے موجود تھا ۱۲ سنہ نبوی بوقت معراج نماز فرض ہوئی۔ وضو بھی اس وقت بتا دیا گیا۔ چنانچہ آٹھ سال آنحضرتؐ اس ہدایت کے مطابق نماز ادا فرماتے رہے اور با وضو نماز ہوتی رہی۔ آٹھ سال کے بعد ۶ سنہ ہجری میں سورۂ مائدہ نازل ہوئی۔ اس میں وضو کی ترتیب بتا کر آٹھ سال کے عمل کی تائید فرما دی گئی۔ آٹھ سال تک جو کچھ ہوا سنت کی بنا پر ہوا تھا۔ آٹھ سال بعد قرآن میں اس کی تائید فرما دی گئی۔ اگر حدیث حجت نہ تھی تو وضو کیوں کیا گیا اور ہو سکتا ہے کہ اپنے مسلک کی پیچ میں بے وضو نماز پڑھنے کو ترجیح دی جائے لیکن شاید عمل اس کے خلاف ہے۔

آیت کے دوسرے حصے میں تیمم کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس میں ہاتھوں کا ذکر آیا ہے لیکن حد نہیں بتلائی گئی کہ آیا اس میں کلائی تک ہاتھ شامل ہو گا یا مرفقین تک یا بغل تک کوئی وضاحت بھی قبول کی جائے، اس کی بنیاد سنت پر ہو گی۔ قرآن اس میں خاموش ہے اور قرآن خود توجہ دلاتا ہے۔ ان احکام کی عملی صورت آنحضرتؐ کے عمل سے معلوم ہو گی اور یہ حجیت سنت کے لئے ایک اضطراری دعوت ہے۔

آیت کے نزول اور وضو کی فرضیت میں آٹھ سال کے فرق کا ذکر پہلے علماء نے بھی فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ مفتاح السعادۃ، الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی۔ ابجد العلوم

للنواب، کشف الظنون لچلپی وغیرہ میں ہے۔

ومثال الثانی اٰیۃ الوضوء انھا مدنیۃ اجماعًا وفرضہ کان بمکۃ مع فرض الصلوٰۃ وکاٰیۃ الجمعۃ فانھا مدنیۃ والجمعۃ فرضت بمکۃ کذا قیل والحکمۃ فی ذٰلک تاکید حکم السابق بالاٰیۃ (ابجد العلوم للنواب صدیق ص۲۳ ج۲)	وضو کی آیت مدینہ میں نازل ہوئی اور وضو نماز سمیت مکہ میں فرض ہوا۔ اسی طرح جمعہ مکہ معظمہ میں فرض ہوا تھا لیکن سورۂ جمعہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ ان حالات سے واضح ہوتا ہے کہ اثباتِ حکم میں سنت پر اعتماد کیا گیا اور قرآن میں اس کی تائید فرما دی گئی۔
۵۔ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ۔ (پ۱۔ ع۴)	قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ

نماز اور زکوٰۃ کا حکم قرآن میں بار بار آیا ہے لیکن تعیّن اوقات، رکعات اور وظائف و اوراد کی تفصیل قرآن مجید میں نہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ کی مختلف قسموں کے اموال میں نصاب کا تعیّن اور مقدارِ زکوٰۃ کی وضاحت قرآن میں نہیں۔ جن حضرات نے ان تفصیلات کو سنت سے الگ طے کرنے کی کوشش کی ہے وہ اپنی کوشش میں بری طرح ناکام ہوئے ہیں۔ اس لئے خود قرآنِ مجید حجیّتِ حدیث کا مطالبہ کر رہا ہے۔

اہلِ قرآن سے ادباً گذارش ہے کہ جہاں تک اسلام اور اس کی تعلیمات کا تعلق ہے سنت کی حجیّت اور تسلیمِ احادیث کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ تعلیماتِ اسلامی میں اس کی حیثیت ایک ایسے جز کی ہے جس کے انکار سے حقیقتِ ایمان میں فرق آ جاتا ہے۔ انکارِ نبوت اور انکار فرامینِ نبوت میں چنداں فرق نہیں۔ ایمان پیغمبر کے جسم پر نہیں لایا جاتا۔ اس کے ارشادات پر لایا جاتا ہے۔ جہاں تک ایمان و دیانت کا تعلق ہے، منکرینِ سنت اور انکارِ حدیث

کے لئے یہاں ٹھکانا نہیں اور "طلوع اسلام" اور اس قسم کے دوسرے لادینی رسائل ذہنوں کی جس طرح تربیت کر رہے ہیں وہ یقیناً اسلامی تربیت نہیں بلکہ اس آزادی کو دیکھتے ہوئے جس کی تلقین ان لوگوں کا شیوہ ہو چکا ہے خیال پیدا ہوتا ہے کہ کسی باقاعدہ اور منظم کفر میں بھی ان کے لئے جگہ نہیں۔ یہودیت اور نصرانیت کفر ہیں لیکن ان کا قانون بھی توڑنے کے بعد انسان ان کی طرف نسبت نہیں کر سکتا۔ بت پرستی بھی ایک قانون ہے اور اس کی کچھ حدود ہیں۔ ایک آزاد منش آدمی وہاں بھی اس وقت تک رہ سکتا ہے جب تک وہ ان پابندیوں کو قبول کرے میری دانست میں ہمارے ان آزاد منش حضرات کی جگہ یا اباحیت میں ہے یا اشتراکیت کی وسعتوں میں کسی باقاعدہ مذہب میں (کفر ہو یا اسلام) ہمارے ان دوستوں کے لئے بظاہر کوئی جگہ نہیں۔

تیسرا مقالہ تمام ہوا۔
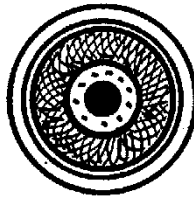
۴
چوتھا مقالہ
حجیت حدیث
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی
سیرت کی روشنی میں

حجیت حدیث

آنحضرتؐ کی سیرت کی روشنی میں!

یہ گذارشات جو اس وقت ناظرین کے سامنے ہیں ان سے مقصود نہ تو کسی کا رد ہے اور نہ ہی مناظرہ ، بلکہ قرآن حکیم میں غور کی ایک راہ ہے اور قرآن کے طالب علموں کے لئے سوچنے کا ایک نہج عرصہ ہوا امام الہند قدوۃ اصحاب العزیمہ حضرت مولانا ابوالکلام آزادؔ نے تذکرہ میں اس طریق فکر کی طرف کچھ ضمنی اشارات فرمائے تھے۔ اس کے بعد حضرت علامہ مولانا شیخ موسیٰ جار اللہ مہاجر موسیٰ رحمہ اللہ نے ایک مختصر سا مضمون اس انداز سے لکھا اور آنحضرتؐ کی سیرت کے چند پہلو قرآن سے استنباط فرمائے راقم نے بھی ان کی اقتدار میں اپنی بے مائیگی کے باوجود یہ چند سطور لکھی ہیں۔ ادنیٰ توجہ سے معلوم ہوا کہ یہ موضوع قرآنِ حکیم میں بے حد مبسوط ہے۔ اور اگر سنجیدگی سے سوچا جائے تو آنحضرتؐ کی مقدس سیرت کا بہت بڑا ذخیرہ قرآنِ مجید میں موجود ہے۔

میری ناقص رائے یہ ہے کہ انکارِ حدیث کی راہ دراصل قرآنِ عزیز میں صحیح فکر کے فقدان سے پیدا ہوئی ہے۔ قرآن حکیم کا طالب علم غور و تدبر سے قرآن کا مطالعہ کرے تو اسے یقین آجائے گا کہ قرآنِ عزیز کو کتاب اللہ اور کلام اللہ ماننے کے بعد آنحضرتؐ کے ارشادات کا انکار ممکن ہی نہیں یہ بحث تو ہوسکتی ہے کہ فلاں حدیث آنحضرتؐ کا ارشاد ہے یا نہیں نیز یہ کہ آنحضرتؐ کے ارشادات کی چھان پھٹک کے لئے کون سے قواعد اور اصول زیادہ کارآمد ہوسکتے ہیں؟ لیکن کسی روایت کو حدیث تصور کر لینے

کے بعد یہ بحث قطعی بے جا ہے کہ آیا حدیث حجت ہے یا نہیں ؟

ائمہ حدیث کی دور اندیشی

حدیث کی تنقید میں ائمہ حدیث اور فقہاء اسلام نے بڑی وسعت سے کام لیا ہے روایت، درایت تاریخ، رجال، ہر چیز کو آلاتِ تنقید کے طور پر استعمال فرمایا پھر تغیر احوال کے ساتھ یہ اصول بھی بدلتے رہے ایک وقت میں مرسل روایت کو حجت مانا گیا، لیکن جب حالات کے تقاضے بدلے تو مرسل کی حجیت پر بھی پابندیاں لگا دی گئیں۔ بلکہ مرسل کو ضعیف کی قسموں میں شمار کیا کما وح بہ الشافعی فی الرسالہ، اسی طرح اتصالِ سند میں امکان لقار کے بعد وقوعِ لقار پر زور دیا گیا نیز مقارنت اور امکان لقار کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا گیا (شروح بخاری ومقدمہ صحیح مسلم) روایت اور درایت کی تقدیم و اعتبار میں بڑی سنجیدگی سے غور فرمایا گیا اور ہر چیز کی اہمیت بلحاظِ مقام ملحوظ رکھی گئی" تنقید میں بے اعتدالی اور رائے عقل کو نصوص پر مقدم کرنے کے لئے اگر کوئی بہانہ بنایا گیا تو اس کی مخالفت اب بھی ہوگی لیکن عقل کی جائز مراعات سے کبھی انکار نہیں کیا گیا فطری قواعد اور متواتر امور اور قرآنِ عزیز کے توافق کی اہمیت کو محدثین اور ائمہ سنت نے بھی نظر انداز نہیں فرمایا جزاہم اللہ عنا وعن المسلمین خیر الجزاء۔

تنقید احادیث اور اجتہاد

تنقیدِ احادیث میں حافظ ابن صلاح کی یہ رائے تھی کہ اس میں اجتہاد کی اجازت نہ دی جائے کسی شخص کو متقدمین ائمہ کے بعد تنقید کا حق نہ دیا جائے لیکن ائمہ حدیث میں یہ رائے حافظ ابن صلاح رحمہ اللہ کی جلالتِ قدر کے باوجود تسلیم نہیں کی گئی بلکہ ائمہ نے وسعتِ ظرف کے ساتھ اس معاملہ میں تحقیق کی اجازت دی حافظ دار قطنی نے صحیح پر استدراک فرمایا۔ امام حاکم کی مستدرک اسی قسم کی ایک کوشش ہے۔ مسند ابو عوانہ کا انداز بھی صحیح مسلم پر استدراک ہی کا ہے ان استدراکات پر تحقیقی جوابات بھی ائمہ نے دئے مگر ان وسعتوں کے باوجود صحیحین کا مقام گرایا نہیں جا سکتا بلکہ یہ ائمہ ان استدرکات کے

باوجود صحیحین کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے رہے اور حدیثِ نبوی کو حجت سمجھتے رہے بلکہ ابتدائی دور کے محدثین نے انفراداً بعض احادیث پر ان کے مضامین کے لحاظ سے اعتراض کیا لیکن نہ ان کے مقام کا انکار کیا اور نہ حدیث کی حجیت ہی پر کوئی شبہ کیا ائمہ حدیث کی طرف سے ان انفرادی اعتراضات کا بھی مناسب اور حتمی جواب دیا گیا۔ حافظ ابنِ قتیبہ دینوری کی کتاب تاویل مختلف الحدیث فی الرد علی اعداء اہل الحدیث ایسی قیمتی کتاب اسی موضوع پر ہے اور حافظ طحاوی کی مشکل الآثار بھی اسی مقصد کے لئے لکھی گئی اور انفرادی شبہات کا کافی حد تک ازالہ کر دیا گیا مگر اس دور میں فنِ حدیث کی مجموعی حیثیت پر اعتراض کا حوصلہ کسی کو نہیں ہوا۔ زمخشری ایسے بالغ النظر لغوی اور ادیب نے اعتزال آمیز آزادی کے باوجود احادیث کا ذکر کیا اور اکثر معجزات کو تسلیم کیا جن کو خود ائمہ حدیث قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے بلکہ ائمہ حدیث کو قاضی بیضاوی اور زمخشری کی احادیث کے لئے تخریج کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ یہ غیر مستند ذخیرہ صحیح احادیث کی اہمیت پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

جہل بالقرآن اور انکارِ حدیث

حدیث کی حجیت کا انکار زمانۂ جہل کی پیداوار ہے۔ انکارِ حدیث کی ابتداء ان لیڈر منش علماء کی طرف سے ہوئی جو انگریزی تعلیم اور انگریز بہادر کی پیداوار ہیں۔ مولوی عبداللہ چکڑالوی کے علاوہ یہ تمام حضرات عموماً اسلامی علوم کو انسائیکلو پیڈیا سے حاصل کرنے کے عادی ہیں۔ یہ قرآن کی تاریخ اور پیغمبرِ اسلام علیہ السلام کی سیرت کو مسٹر نکلسن سے سیکھنا انتہائی تحقیقات تصور کرتے ہیں ان کی اکثریت ایسی ہے جنھوں نے اسلامی علوم کو اسلامی ماخذ سے حاصل نہیں کیا بلکہ اسلامی علوم کو یورپین مستشرقین اور انگریزی زبان کے توسط سے سیکھا ہے۔ ترجمہ قرآنِ عزیز میں جن حضرات کا مدار مسٹر ولیم میور پر ہے اگر وہ حدیث کا انکار کریں تو انھیں کون روکے اور کیونکر؟ مدیر طلوعِ اسلام، علامہ عنایت اللہ مشرقی اور مولوی احمد دین امرتسری یہ تمام علامہ صاحبان انگریز بہادر کی پیداوار ہیں اور ان کی

معلومات میں انگریزی طریق فکر کار فرما ہے ۔ جتند ما ھنالك مھزوم من الاحزاب مولوی عبداللہ بچارے ضرور قدیم وضع کے تھے تاہم اسلامی علوم کی تکمیل کا موقع ان کو بھی میسر نہ آسکا نیز کچھ برتری کا شوق بھی ان کو دامن گیر تھا جو حالات کی ناساعدت کے سبب پورا نہ ہوسکا ۔ شیخ محمد چٹو صاحب کی تاجرانہ ذہنیت نے مولوی عبداللہ کو حسب منشا کام کا موقع ہی نہ دیا ۔ یوں بھی مولوی عبداللہ بچارے کچھ زیادہ ذہین نہیں تھے ۔ الف لام اور تنوین سے جس طرح انھوں نے مسائل کشید کرنے کی کوشش کی وہ اہل علم کی محفلوں میں مضحکہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے ۔ نحو کی اس منطق سے اہل زبان بھی یقیناً ناآشنا ہیں ۔ اس کے علاوہ ان کا ترجمہ اور تفسیر جن لوگوں کی نظر سے گذری ہے ۔ وہ آسانی سے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ کسی ذہین اور ذکی آدمی کا کام نہیں ۔

اصول حدیث میں وسعت

مقصود کلام یہ ہے کہ انکار حجیت حدیث کی بحث سر تا سر قلت مطالعہ کی پیداوار ہے ۔ ائمہ حدیث نے ظرف و حال کے مطابق کچھ اصول وضع فرمائے اور آنے والے لوگوں کے لئے راستہ کھلا چھوڑ دیا تاکہ وہ رجال اور اسانید پر دیانت کی روشنی میں بحث کریں ۔ جس حدیث پر انھیں شبہ ہو اسے ظاہر کریں اس کی سند پر بحث کریں اسے درایت کی روشنی میں سمجھیں اور اس کے لئے اہل علم کی طرف رجوع کریں اگر تسکین نہ ہو تو شبہات کو اس حدیث تک محدود رکھتے ہوئے توقف کریں البتہ بحث جاری رکھیں ۔ لعل اللہ یحدث بعد ذالك امرا ۔ مگر فن پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش یقیناً ایک ملحدانہ کوشش ہے ۔ امت کے اعمال اور علمی خدمات کے ساتھ یہ وطیرہ احسان فراموشی ہے ان کے علوم سے استفادہ کے بعد ان پر بدگمانی کو احسان فراموشی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ۔ آج کے نوآموز اکتشاف محققین اگر سوچیں تو انھیں یقین ہوگا کہ آج الٹا سیدھا جو کچھ کہا یا لکھا جارہا ہے ۔ یہ متقدمین کا فیضان ہے اور ان کی علمی مساعی کا نتیجہ ہے اس استفادہ کے بعد ان پر زبان درازی اچھے اخلاق کا مظاہرہ نہیں ۔

مخالفینِ حدیث سے شکوہ

مخالفینِ حدیث کے پورے کیمپ سے ہمیں یہ شکوہ ہے کہ ان حضرات نے ہمیشہ خبط اور خلطِ مبحث کی کوشش کی۔ ان کا دعویٰ تو یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے اقوال، افعال، اجتہادات شرعاً حجت نہیں وہ خدا کا پیغام (قرآن) تو دے سکتے ہیں لیکن اس کی وضاحت کا ان کو حق نہیں اور اگر وہ اس پر عمل کریں تو وہ عمل امت کے لئے حجت نہیں۔ ان کی صوابدید ان کی ذات تک محدود ہے ہم اس کی تعمیل کے مکلف نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں سند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو لوگ آنحضرت سے بالمشافہ گفتگو فرماتے تھے ان پر بھی شرعاً اسے قبول کرنا ضروری نہ تھا۔ لہٰذا اگر یہ احادیث کے ذخائر تواترِ نقل سے بھی ہم تک پہنچ جائیں تو بھی بلحاظِ اقوالِ رسول یہ حجت شرعی نہیں ہیں۔ حجتِ شرعی صرف پیغام کے الفاظ یعنی قرآن ہے اور اسی طرح اگر آنحضرتؐ اپنی زندگی میں احادیث کا مجموعہ لکھوا دیتے اور وہ مجموعہ آج قرآن کی طرح ہمارے ہاتھوں میں ہوتا پھر جب تک وہ قرآن کے موافق نہ ہوتا ہم اسے قطعاً شرعی حجت نہ سمجھتے بلکہ اگر ہماری سمجھ اور ہمارے علم کی رو سے قرآن کے موافق اس کا مفہوم نہ ہوتا تو بھی ہم قرآن کو ترجیح دیتے اور وہ مفہوم جسے ہماری عقل قرآن تصور کرتی ہے اس کو حدیث کے اس مسلّم الثبوت مجموعہ پر ترجیح ہوتی۔ اس عقیدہ کے بعد سند یا تدوینِ حدیث کے اوقات یا حفظِ حدیث کے ظرف کی بحث بالکل بے فائدہ ہے یا کم از کم یہ ایک ثانوی بحث ہے جس پر ایک ضمنی دلیل کے طور پر تو بحث کی جا سکتی ہے لیکن انکارِ حدیث کے لئے اسے مستقل دلیل کا مرتبہ نہیں دیا جا سکتا۔

خلط مبحث

ان گذارشات سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خلطِ مبحث کی یہ روشنی ختم ہو جائے اسی لئے الاعتصام میں چند اقساط ظنِ حدیث کی مختلف حیثیتوں کے متعلق سپردِ قلم کی گئیں جن میں میں نے کوشش کی ہے کہ خلطِ مبحث سے بچوں اور اپنے دوستوں کو بھی بچاؤں تا کہ افہام و تفہیم میں کم سے کم وقت صرف ہو اور ہم ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ سمجھ سکیں۔ میں نے ان قریبی اقساط میں حدیث پر

بلحاظِ علمِ روایت ، بلحاظِ اوقاتِ تدوین ، بلحاظِ اصولِ روایت ، بلحاظِ درایت ، بلحاظِ رجال بالکل بحث نہیں کی کیونکہ ان حیثیات کا مقام ثانوی ہے ۔ ان حیثیات پر بحث آئندہ صحبتوں میں ہوگی اور ان شاء اللہ مفصّل ہوگی واللہ ولی التوفیق ۔

زیرِ قلم گذارش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل سیرت کے نقطۂ نظر سے ہے جس شخص کی سیرت اتنی مکمل ہو جیسے کہ قرآن ذکر فرماتا ہے ۔ آیا اس شخص کے اقوال حجت ہوں گے یا نہیں ؟ دوسری طرف ایک اہلِ قرآن انکارِ حدیث کے لئے دنیا کو قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ حالانکہ وہ زبان نہیں جانتا ۔ علوم اسلامیہ سے نابلد ہے ۔ لیکن پیغمبر کو جس کی سیرت یہ ہے یہ حق نہیں کہ وہ اپنا فہم لوگوں کے سامنے پیش کر سکے اور نہ ہی لوگ اس کے پابند ہیں کہ وہ اس کے کامل اسوہ کا اتباع کریں ۔ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ ۔

اعترافِ حقیقت

مناظرانہ حیثیت سے یہ مضمون کوئی اہمیت نہیں رکھتا ان گذارشات کا ماحصل آنحضرتؐ کی علمی خصوصیات ہیں ، کمالات ہیں ، اصابتِ فکر کے قرآنی تذکار ہیں اللہ تعالیٰ کی رہنمائی اور حفاظت کا اظہار ہے جو مختلف مواقع پر آنحضرتؐ کے شاملِ حال رہی ۔ صاحبِ وحی کی مقدس سیرت کے مختلف پہلو ہیں جن کے اظہار میں صرف قرآنِ عزیز پر انحصار کیا گیا ہے ان کی بصیرت اور دوررس نظر کا اظہار ہے ۔ ایسی خصوصیات اگر دنیوی معاملات میں کسی شخص کے اندر پائی جائیں تو دنیا میں اس پر اعتماد کرنا اخلاقی فرض ہو جاتا ہے اور عقل کا واجبی تقاضا میری دانست میں یہاں دین کا معاملہ بھی دنیا سے جدا نہیں اگر یہ خوبیاں دنیا میں اعتبار اور اعتماد کا سبب بن سکتی ہیں تو دین میں بھی انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ اعتماد ایک نفسیاتی کیفیت ہے جو ان خصائص سے پیدا ہوتی ہے ۔ یہ کیفیت اور اس کے اسباب اور مقتضیات دین اور دنیا میں مختلف نتائج کے حامل نہیں ہو سکتے اس کے باوجود اگر کوئی بزرگ آنحضرتؐ اور دوسرے انبیاء کو اس حق سے محروم رکھنے پر مصر ہوں

تو میں اقرار کرتا ہوں کہ ان گذارشات میں اسے مجبور کرنے کا کوئی سامان نہیں۔ میں نے دس آیات سے آنحضرتؐ کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر طالب علم سوچنا چاہے تو اس موضوع پر اسے سیکڑوں آیات ملیں گی جن سے مقامِ نبوت کی تشخیص کی جا سکتی ہے۔

طمانیت کا سامان

میں پورے وثوق اور دیانت سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اس موضوع پر برسوں سوچا مناظرات کے سیکڑوں صفحات پڑھے۔ اہلِ سنت علماء سے بہت کچھ سنا۔ اہلِ قرآن کے انتہا پسند اور دیانت دار بزرگوں سے زبانی گفتگو کی اور اس لادینی عقیدہ کا ان بزرگوں نے دیانت داری سے اظہار کیا۔ اور آج کل کے مصلحت کوش منافقین کی مساعی کا بہت سا حصہ بھی میری نظر میں ہے ان کی دعوت کے ظاہری الفاظ کو سمجھتا ہوں اور ان کے مافی الضمیر کو جہاں تک قرائن و احوال سے سمجھ سکتا ہوں، دیانتداری سے اس کے سمجھنے کی کوشش کی ہے مجھے اس بحث میں کسی چیز سے اس قدر تسکین نہیں ہوتی جس قدر اطمینان مجھے آنحضرتؐ کی سیرت کے اس نہج سے ہوا ہے۔ آنحضرتؐ کی سیرت دواوینِ سنت میں بہت مبسوط ہے اور اس سے بھی ایک طالب کو انشراح کا بہت کچھ سرمایہ میسر آ سکتا ہے لیکن قرآن عزیز کے اجمال و اختصار میں جو لطف و طمانیت پنہاں ہے اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکیں گے جو اس طریق پر سوچنے کی کوشش کریں گے۔ اس طریق پر سوچنے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ دل اور دماغ رسمی آلائشوں سے بالکل پاک ہوں۔ فطرت کے دائمی اور قدیمی اصول پیشِ نظر ہوں اور ان کے نفسیاتی اثرات سے کوئی طالب علم فطرتاً آشنا ہو تو معاملہ بہت جلد حل ہو سکتا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ رسمی مناظرات سے فطرت کی یہ قوت ہی ناپید ہو جاتی ہے اس لئے مناظر یقیناً اس افادی حیثیت سے محروم ہو جاتا ہے اسے اپنے طریق پر سوچنا چاہیئے ؎

خلق اللہ للحروب رجالاً + ورجالا لقصعۃ وثریدا ؎ ہر کسے را بہر کارے ساختند

ردو قبول کے اسباب کا تجزیہ

کسی چیز کے ردو قبول میں جہاں بعض دوسرے اسباب کارفرما ہیں، وہاں اعتماد کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے اور اعتماد میں انسانی سیرت کو بہت کچھ دخل ہے تجربہ شاہد ہے کہ بسا اوقات متعدد آدمیوں کی درایت پر اعتماد نہیں کیا جاتا اور ایک شخص جس کی عادات سے ہم واقف ہیں ہمیں زیادہ یقین حاصل ہوتا ہے اسی طرح اگر ایک بڑا صادق القول شخص کسی ایسے ملک میں چلا جائے جہاں لوگوں کو اس کی صداقت کا علم نہ ہو اور وہ اس کے اوصاف سے آشنا نہ ہوں تو وہاں اس کی روایت اور شہادت کو کوئی اہمیت نہیں دی جائے گی لیکن اگر اس کے ان اوصاف اور اس کی سیرت کے محاسن لوگوں کو معلوم ہوں تو پھر وہ کوئی قصہ یا واقعہ بیان کرے تو اس پر کوئی شبہ نہیں ہوگا اور اس کے جاننے والے خود اس کی خبر کو قبول کریں گے۔ علم رجال کی ایجاد محدثین نے اسی عقلی اور نفسیاتی اصول کی بنا پر کی تاکہ رجال کی سیرت کا علم ہو سکے اور روایت پر اعتماد کیا جا سکے۔ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ میں آنحضرت ﷺ نے بھی اسی اعتماد کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر میں غلط بیانی اور غلط گوئی کا عادی ہوتا تو آج سے چالیس برس پہلے بھی غلط بیانی سے کام لیتا۔

آنحضرت ﷺ کی سیرت قرآن میں

آنحضرت ﷺ کی سیرت ڈھکی چھپی چیز نہیں لیکن اس کا ذخیرہ زیادہ تر احادیث میں ہے منکرین حدیث ممکن ہے اس ذخیرہ پر اعتماد نہ کریں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ آنحضرت ﷺ کی سیرت قرآنِ عزیز سے تلاش کی جائے تاکہ ایک قرآن کا طالب علم سمجھ سکے کہ جس شخص کی سیرت اس طرح روشن ہے آیا اس کا قول، فعل اور تقریر اور اجتہاد قابلِ اعتماد ہے یا نہیں، غلط بحث سے بچنے کے لئے روایت اور رواۃ کا میں نے یہاں بالکل تذکرہ نہیں کیا کیونکہ حجیتِ حدیث الگ بحث ہے اور طریقۂ روایت اور رجالِ حدیث ایک الگ بحث۔ اگر راوی ضعیف ہے اس کی روایت کے مشتبہ ہونے

پر کوئی اعتراض نہیں۔ اگر راوی جھوٹا ہے تو اس کی روایت مسترد کر دی جائے گی لیکن حجیت حدیث پر ان عوارض کا کوئی اثر نہیں "حدیث بلحاظ روایت" کے موضوع پر کسی دوسری صحبت میں گذارشات کی جائیں گی حجیت حدیث کے مسئلہ میں عام اہل قرآن نے سند اور رجال کی بحث کو جس انداز سے گھسیٹنے کی کوشش کی ہے وہ دیانت داری پر مبنی نہیں ہے وہ صرف خلط بحث ہے۔

۱۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (۲۔ ۲۸۵)	رسول اور تمام اہلِ ایمان نے پیغمبر کی وحی کی تصدیق کی، یہ سب لوگ اللہ، رسول اور اس کی کتابوں اور فرشتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم اس کے رسولوں میں تفریق نہیں کرتے۔

اس آیت میں پیغمبر کو باقی تمام اہلِ ایمان کے ساتھ ایمان میں مساوی قرار دیا گیا ہے جس طرح عام لوگوں پر فرض ہے کہ پیغمبر کی وحی پر ایمان لائیں، پیغمبر پر بھی فرض ہے کہ وہ اپنی وحی پر یقین کرے اسی طرح خدا، رسول، ملائکہ اور آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ آیت اس امر پر شاہد ہے کہ پیغمبر اس امتحان میں کامیاب ہے اس لئے پیغمبر کے ارشادات پر بھی اسی طرح اعتماد ہونا چاہیئے جس طرح عامۃ المسلمین کی باتوں پر۔
منکرینِ حدیث عام مسلمانوں پر تواتر کی روایات میں اعتماد کرتے ہیں لیکن پیغمبر کو یہ حق دینے میں انھیں اعتراض ہے۔

۲۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝	اللہ کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا۔ جس نے انسان کو لوتھڑے سے بنایا۔ پڑھو تمھارا رب بہت برتر ہے جس نے قلم سے سکھایا اور انسان کو وہ چیز سکھائی جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

آیت مذکورہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے جس کی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یقیناً تعمیل فرمائی پھر فرمایا وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۔ اللہ تعالیٰ نے تم کو وہ علم سکھائے جنھیں تم نہیں جانتے تھے اور تم پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے۔

اس آیت میں پیغمبر کے علم اور قراۃ کا ذکر ہے اور ہر پڑھے لکھے آدمی پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ وصف قرآنِ عزیز کی شہادت سے ثابت ہے اس لئے ان کے ارشادات پر اعتماد ہونا چاہیئے ۔ انکارِ حدیث کے نظریہ کے پیشِ نظر پیغمبر کو اس اعتماد سے محروم کیا جاتا ہے اور یہ ظلم ہے۔

۳ ۔ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ○

قلم اور ان کے لکھنے کی قسم ، اللہ کے فضل سے تم مجنون نہیں۔ تمہارے لئے دائمی اجر ہے اور تم عظیم اخلاق کے مالک ہو۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے کہانت اور جنون ایسی مذموم عادات کی نفی کی گئی ہے اور آپ کے اعمال اور اطوارِ زندگی کو اس طرح سراہا گیا ہے اور انھیں یہ خصوصیت عطا فرمائی گئی ہے کہ آپ کا اجر کبھی ختم نہ ہوگا ۔ یہ صدقہ جاریہ ہے جو جناب کے انتقال کے بعد بھی جاری رہے گا یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی کی بہت بڑی خوبی ہے کہ اس کی قبولیت اور دائمی اجر کا اعلان بذریعہ قرآن اسی دنیا میں کر دیا گیا ۔ جس شخص کی پاکیزگی اور اخلاص عمل پر اسی دنیا میں اعتماد فرمایا گیا ہے کیا اس کے ارشادات پر اعتماد نہ کیا جائے گا ؟ انکارِ حدیث کی وجہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر بے اعتمادی نہیں تو اور کیا ہے ؟

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ کتنا بڑا اعزاز ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو عطا فرمایا گیا جہاں تک تجربہ شاہد ہے ساری بے اعتمادیاں بدخلقی کی

پیداوار ہیں لیکن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے علی الا علان بداخلاقی کی مدافعت فرمائی گئی ہے ؂

نگاہِ ناز جسے آشنائے راز کرے　　　وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

اور اعتماد کی بنیادیں مضبوط کر دی گئی ہیں اسی حقیقت کو ایک دوسری جگہ اور بھی واضح فرمایا گیا ہے۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔ آپ کے مزاج گرامی کی نرمی خدا تعالیٰ کی رحمت ہے ورنہ اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ پروانوں کی صفیں جو مسجد نبوی میں مقامِ نبوت کی زینت ہو رہی ہیں سب تتر بتر ہو چکی ہوتیں۔

اخلاق کی ان بلندیوں کے بعد اور سیرۃ رسولؐ کی اس سرفرازی کے باوصف جس کا اعتراف قرآنِ عزیز نے اس صراحت سے فرمایا ہے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال پر کوئی وجہ نہیں کہ بدگمانی کی جائے۔

۴۔ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝	اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے امیین میں سے ایک رسول برپا کیا جو ان پر اس کی آیات پڑھتا ہے ان کا تزکیہ کرتا ہے انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور یہ لوگ اس کی بعثت سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

اس آیت پاک سے حسب ذیل امور ثابت ہوتے ہیں۔

(ل) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ماحول میں مبعوث فرمائے گئے جہاں تعلیم کا چرچا نہ تھا اور نہ ماحول ہی علمی تھا۔

(ب) اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت فرماتے تھے۔

(ج) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے اثر سے اس ناخواندہ اور غیر مہذب قوم کے ذہن صاف ہو گئے اور انھیں اخلاقی اور روحانی اور جسمانی پاکیزگی نصیب ہوئی اس جملہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ دونوں کی کامیابی کا اعلان ہے پیغمبر کی قوتِ موثرہ کا اعلان ہے اور صحابہؓ کے اخذ و تاثر واقعی کی تعریف فرمائی گئی ہے۔

(د) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم انھیں کتابِ الٰہی کی تعلیم دیتے تھے وہ اُمّی بھی تھے اور معلم بھی اور حکمت کی تعلیم بھی اس اُمّی کی سیرت ہے صلی اللہ علیہ وسلم ان اوصاف کی موجودگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی جو اہمیت ہونی چاہیئے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں، قرآن جس شخصیت کی تلاوت، تزکیہ اور تعلیم کی تعریف فرمادے اس پر شبہات کا اظہار ایمان کے منافی ہے۔ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۔

۵۔ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۔	تمھیں میں سے تمھارے پاس رسول آیا تمھاری تکلیف اسے ناگوار ہے وہ تمھاری نصیحت کے خواہشمند ہیں اہل ایمان کے لئے ان کا دل بے حد نرم ہے اگر لوگ تمھاری اطاعت سے بے رخی برتیں تو ان سے کہدو میرے لئے میرا خدا کافی ہے اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں مجھے اس پر بھروسہ ہے اور وہ عرشِ عظیم کا محافظ ہے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

یہ سورۂ توبہ کی آخری آیات ہیں اور سورہ توبہ شوال سنہ ۹ھ میں نازل ہوئی اس میں سورہ نون کے بعض مجمل گوشوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ کی وضاحت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے کا صراحۃً ذکر فرمایا ہے اور یہ رحمت و رافت اس وقت ظاہر اور نمایاں ہوئی جب مکہ فتح ہو چکا

اور دشمن سرنگوں ہو چکے تھے اس قوت و عزت کے باوجود آپ کے اخلاق میں نہ جذبۂ انتقام ہے اور نہ شدت صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس حسنِ سلوک اور رفعتِ اخلاق کے باوجود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات قابلِ قبول نہیں تو معلوم نہیں ادارہ طلوعِ اسلام کون سا آلہ اعتماد کیلئے ایجاد کرے گا۔

۶۔ وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا۔ (۴۔۱۱۳)

اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری اور وہ علوم سکھائے جو آپ نہیں جانتے تھے اور تم پر یہ اللہ کا بہت بڑا فضل تھا۔

۱۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے علوم، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب و حکمت کی صورت میں نازل ہوئے۔

۲۔ اور یہ سب کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لاعلمی کے بعد سکھایا گیا۔

۳۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اس میں پیغمبر کی ذات کو کوئی دخل نہیں

جب علم اور حکمت اللہ کی طرف سے اتاری گئی تو اس کی تمام تر ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ہو گی پھر وہ حجت کیوں نہیں اور علومِ نبوی کو علومِ الٰہی سے ممتاز کیسے کیا جائے۔ یہ ایک ایسی سند ہے جس کے رواۃ پر کوئی شبہ نہیں۔ قرآنِ حکیم اس کی صحت اور صداقت کا خود شاہد ہے، اس صداقت کے قبول سے محرومی واقعی محرومی ہے۔

۷۔ مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَآءُ اِنَّہٗ عَلِیٌّ حَکِیْمٌ (۴۲۔ (۵)

اللہ تعالےٰ جب کسی سے کلام کرتا ہے تو اس کی تین صورتیں ہیں (۱) فرشتہ رسول کی شکل میں آئے (۲) غیبی آواز آئے (۳) یا بذریعہ الہام اسے اطلاع دی جائے۔

÷ ÷ ÷ ÷ ÷

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۴۲-۵۲)

ہم نے آپ کی طرف بھی اسی طرح اپنا امر وحی کیا "

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۱۰-۶۱)

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کسی حالت میں ہوں ، قرآن پڑھیں یا کوئی اور کام کریں مگر اللہ تعالیٰ اس میں شاہد ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے کوئی ذرہ پوشیدہ نہیں اور نہ ہی کوئی بڑی یا چھوٹی چیز اس کی نگاہ سے مخفی ہے "

پہلی آیت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے علوم اور ان کی تحصیل کی راہوں کا تذکرہ فرمایا اور دوسری آیت میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے تمام حالات کی ذمہ داری خود قبول فرمائی اور فرمایا جو تم کرتے یا کہتے ہو وہ میری نگاہوں میں ہے اور جب آسمان اور زمین کا کوئی ذرہ اور کوئی چھوٹی بڑی چیز ہم سے پوشیدہ نہیں تو پیغمبر کا قول وفعل اور دیگر امور ہم سے کیونکر چھپ سکتے ہیں ؟

سورۂ عبس میں ابن ام مکتوم کے واقعہ میں ذرا سی بے توجہی پر کس حکیمانہ انداز سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق عمل کی اصلاح فرمائی ہے اس سے واضح ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے احوال پر حظیرۃ القدس کی توجہ کس قدر مبذول تھی ۔ اس ذمہ داری اور احتراس کے بعد بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور اعمال گرامی کو احتجاج کا مقام حاصل نہیں ہوتا تو فرمایا جائے کہ حجیت کے لئے اور کونسی سند ہونی چاہیے جس کی سیرت اتنی پاک ، جس کا علم اتنا محفوظ ہو اس کے اقوال کیونکر مشتبہ ہوں گے ؟

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى میں بظاہر نطق ہی کو وحی قرار دیا گیا ہے اور آیت ع۲ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام حالات کا ذمہ لے لیا گیا ہے۔ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام علوم کی حفاظت بالکل واضح ہے

٨ - عَبَسَ وَتَوَلّٰى أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمٰى وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكّٰى أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى أَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَأَنْتَ لَهُ تَصَدّٰى وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكّٰى وَأَمَّا مَنْ جَاءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۔

(۸۰ - ۱/۱۰)

ایک نابینا آیا آپؐ نے اس سے رنج آمیز بے توجہی فرمائی آپ کیا جانتے ہیں۔ وہ پاکباز ہو نصیحت سے اسے فائدہ ہو غفلت پیشہ لوگوں کی طرف آپ زیادہ توجہ کرتے ہیں کیا معلوم اس میں تزکیہ کی روح ہے بھی یا نہیں اور جو لوگ ہمہ تن شوق ہو کر آئیں اور ان کا دل خشیۃ الٰہی سے معمور ہو آپ اس سے بے نیازی برتتے ہیں۔

ان آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات پر حکیمانہ تنقید فرمائی گئی ہے۔ بشری تقاضوں کی وجہ سے جہاں ایسا کوئی واقعہ رونما ہوا جو ملاء اعلیٰ کے مصالح کے خلاف تھا وہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو توجہ دلادی گئی تاکہ پیغمبر کی صوابدید ملأ اعلیٰ کے منشاء کے موافق ہو جائے۔

کتنا معمولی واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض قریشی رؤساء سے گفتگو فرما رہے تھے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی دلی آرزو تھی کہ یہ لوگ جہنم کی آگ سے بچیں اچانک عبداللہ بن ام مکتوم نے اپنی معتاد بے تکلفی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ کو اپنی طرف پھیرنا چاہا آداب مجلس کا تقاضا تھا کہ جب تک پہلی گفتگو ختم نہ ہو جائے دوسری طرف توجہ نہ فرمائی جائے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اسی قاعدہ کے مطابق عمل کیا انسانی آداب اور آئین مجلس کے لحاظ سے اس میں کوئی غلطی نہ تھی۔ مگر یہ اصول پسندی عبداللہ بن ام مکتوم ایسے مخلص کی دل شکنی کا موجب ہوئی جسے آسمان پر بھی ناپسند فرمایا گیا

اور ارشاد ہوا کہ ہدایت کی امید پر ان لوگوں کو نظر انداز نہ فرمایا جائے جن پر اللہ تعالیٰ کی نوازش ہو چکی ہے اور ان کے دل خشیت الہٰی سے معمور ہو چکے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یومیہ معمولات پر یہ کتنا بڑا احتساب ہے، حالانکہ ایسے واقعات ایک مبلغ کی زندگی میں آئے دن پیش آتے ہیں اور اسے حفظِ مراتب اور آدابِ مجلس کا یومیہ بار بار لحاظ رکھنا ہوتا ہے تاکہ اس کی زندگی معاشرہ میں اجنبی اور اعجوبہ تصور نہ کی جائے لیکن یہاں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آزاد نہیں چھوڑا گیا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

ایک سیاسی نوعیت کا واقعہ

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ فِيهِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۸-۶۸)

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر پیغمبر کے پاس قیدی آجائیں تو انھیں موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیئے۔ یہاں کوئی دنیوی مفاد پیشِ نظر رکھنا مناسب نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے منشا کے مطابق صرف آخرت کی بہتری مطلوب ہونی چاہیئے اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاملہ پہلے سے طے نہ ہو چکا ہوتا تو تمھیں بڑی سخت اذیت اور تکلیف سے سابقہ پیش آجاتا۔

بدر کی جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھ قیدی آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے مشورہ کے بعد ان سے فدیہ لے کر انھیں چھوڑنے کا فیصلہ فرما دیا۔ مجلسِ شوریٰ کی اکثریت اس فیصلے کے حق میں تھی خود قرآن کا جنگی قانون اس فیصلہ کی تائید میں تھا اِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً دونوں اختیار موجود تھے لیکن بدر کے قیدیوں کے متعلق مصلحتِ خداوندی کا تقاضا اس اختیار کے خلاف تھا۔ اور ائمۃ الکفر کو اس رخصت کا فائدہ دینا ناپسند تھا۔ اس لئے مجلسِ شوریٰ کے

اس جمہوری فیصلے کو ناپسند کیا گیا لیکن مسترد نہیں فرمایا تاکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفقار محتاط رہیں، جنگی معاملات میں ایسے فیصلے روزمرہ کا معمول ہے اور برسر پیکار قومیں اس قسم کے فیصلے عموماً اپنی صوابدید سے کیا کرتی ہیں لیکن یہ فیصلہ باوجودیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل جمہوری طریق پر کیا تاہم ناپسند فرمایا گیا اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقار عام متحارب قوموں کی طرح آزاد نہیں چھوڑے گئے۔ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ +

تیسرا واقعہ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ٥ (۹-۸۰)

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ (۹-۸۴)

ان کے لئے استغفار بے سود ہے۔ آپ ستر دفعہ بھی ان کے لئے استغفار فرمائیں ان کو بخشا نہیں جائے گا کیونکہ یہ خدا اور رسول کے منکر ہیں اور ایسے معصیت کیش لوگوں کے لئے بخشش کی راہیں نہیں کھل سکتیں اگر یہ منافق مرجائیں تو ان پر نماز مت پڑھو اور نہ ان کی قبر پر ٹھہرو یہ اللہ اور اس کے رسول کے منکر ہیں اور اسی فسق و فجور پر ان کی موت واقع ہوئی ہے۔

کسی کی موت پر دعا کرنا یا اس کی قبر پر جانا معاشرتی معاملات میں سے ایک معمول ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی معمول کے مطابق بعض منافقین پر نوازش فرمائی اس پر ارشاد ہوا کہ فاسق مزاج اور معصیت پیشہ لوگوں کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہونا چاہئے شہری زندگی میں کسی کے جنازے پر جانا یا تعزیت کرنا معمولی بات ہے بلکہ تبلیغی مصالح کے لئے ایک حد تک جاذب بھی۔ لیکن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فداہ ابی وامی کو منافقین کی حد تک اس اخلاقی رعایت سے بھی روک دیا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے

یومیہ معمولات پر کس قدر نظر رکھی گئی تھی۔

چوتھا واقعہ ڈسپلن اور نظم فوجی زندگی کی روح ہے لیکن اس کا تمام تر تعلق محکمانہ ہوتا ہے ایسے معاملات میں خارجی مداخلت نظم کے منافی سمجھی جاتی ہے۔ غزوۂ تبوک سے کچھ لوگ پیچھے رہ گئے ان میں اکثر منافق تھے ان کو یقین تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس جنگ سے بخیریت واپس نہیں لوٹیں گے کیونکہ ایک مضبوط اور باقاعدہ جنگی قوت سے تصادم ہوگا اور ان کے خیال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر کی جنگی استعداد ان سے ٹکر لینے کے قابل نہ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے بخیریت واپس آئے اور منافقین کے خیالات غلط ثابت ہوئے تو منافقین نے اپنی غیر حاضری کے متعلق غلط عذر تراشنے شروع کیے، قسمیں کھائیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین دلایا کہ وہ اس غیر حاضری میں واقعی معذور تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے عذر قبول فرما کر انھیں معافی دے دی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قدر جلد معافی دینا پسند نہیں فرمایا۔

عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ لِمَ اَذِنْتَ لَھُمْ	اللہ تعالیٰ نے تمھیں معاف فرمادیا تم نے
حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا	اس قدر جلدی انھیں کیوں اجازت دیدی کا
وَتَعْلَمَ الْکٰذِبِیْنَ ٭ (۹-۴۳)	سچے اور جھوٹے کا نکھرنا ضروری تھا۔

یہ چار واقعات ہیں جن کا زندگی کے مختلف پہلوؤں سے تعلق ہے اور بہت حد تک یہ واقعات دنیوی امور سے متعلق ہیں جب ان کے متعلق قطعی اور حتمی ہدایات دی گئی ہیں تو خالص دینی اور تعبدی امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات پر کیونکر نظر نہ ہوگی اس سے واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال حجت ہیں۔ محتاط سیرت کے بعد جس کا اظہار قرآن عزیز میں فرمایا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی حیثیت بہت نمایاں ہو جاتی ہے۔

۹۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ ‌ ‌ ‌ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پیامبر ہیں۔ اور

مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ط

آپ کے ساتھی حق کے منکروں کیلئے بے حد سخت گیر ہیں انکے باہمی تعلقات رحم و کرم پر مبنی ہیں وہ اللہ کے فضل اور رضامندی کی تلاش کے لئے ہمیشہ رکوع اور سجود میں مشغول رہتے ہیں ان کے ان اچھے فضائل کا ذکر توریت و انجیل میں بھی پایا گیا ہے۔

ذاتی نام کے ساتھ وصف رسالت کے تذکرہ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا مقام بلحاظِ محمد وصفِ رسول سے مختلف ہے رسالت کے تقاضوں کا یہ اثر ہے کہ حضرت کے ماننے والوں میں دو متضاد قوتیں اس طرح سمو دی گئی ہیں کہ کوئی چیز بھی بے محل اور بے وقت استعمال نہیں ہونے پاتی بلکہ سختی اور شدت جب بھی استعمال ہوئی ہے منکرین حق اور سچائی کے دشمنوں کے خلاف استعمال ہوئی۔ اور رافت و رحمت کا ظہور جب بھی ہوا اس نے حق پرست اور اصحابِ دیانت کو تلاش کر لیا جس کالج کے طلبہ میں احتیاط کا یہ عالم ہے کہ کوئی جذبہ اور فطرت کا کوئی تقاضا بے محل استعمال نہیں ہونے پاتا اس کالج کے پرنسپل اور معلم کے متعلق سوچئے کہ اس کا مقام کیا ہوگا۔

قرآنِ حکیم نے رقتِ قلب اور غضب و شدت کے دونوں حالات کا موازنہ فرمایا ہے ان غیر معمولی حالات میں اگر اعتدال قائم ہے اور مزاج نے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا تو نارمل اور معتدل حالات کے متعلق تو بحث کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ پھر جس کی تعلیم نے غیر رسول اور غیر معصوم انسانوں میں یہ اعتدال پیدا کر دیا۔ وہ معلم جب بوصفِ رسالت ہوگا تو عصمت اس کی زینت ہوگی۔ غور فرمائیے کہ بے اعتدالی کے لئے یہاں گذر کی کوئی گنجائش ہوگی؟ ایسے مقدس انسان کے دینی ارشادات کی شرعی حیثیت پر بحث کرنا بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ ہر مقام پر چوروں کی تلاش اور چوری کی فکر شرافت کا تقاضا نہیں جس کے تقدس کی منادی چار دانگ عالم میں تورات و انجیل نے کر دی ہو آج کون ہے جو اس کی طرف تنقید کی نگاہ سے دیکھے؟ بلحاظِ رسول

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مقام کی وضاحت اس آیت میں بصراحت موجود ہے معترضین کو سوچنا چاہئے کہ ان کا موقف کیا ہے۔ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ أَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَأَصْلَحَ بَالَهُمْ (۴۷-۱/۲)	حق و صداقت کے منکر اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں اس لئے ان کے اعمال برباد ہو گئے اور سچائی پر یقین کرنے والے جن کی عملی زندگی درست ہے اور وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وحی پر یقین رکھتے ہیں ان کی غلطیاں معاف ہوں گی اور ان کے حالات درست ہوں گے۔

سورۂ محمد کے آغاز سے ہی اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ذکر فرمایا۔ جہاد، جنگی قیدیوں کا معاملہ، منافقین کی چالاکیاں اور جہاد سے گریز وغیرہ احوال سے ذکر فرما کر ارشاد ہوا فَأَوْلَىٰ لَهُمْ طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ ان کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور دستور کے گفتگو کرنا صحیح راہِ عمل ہے ورنہ یہ لوگ خدا کی لعنت میں گرفتار ہوں گے سورۃ کا خاتمہ بھی اسی نصیحت پر فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (۴۷-۳۳)	اے صداقت کے پرستارو! اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو۔

یعنی رسول کی اطاعت سے انحراف بھی عمل کو اسی طرح برباد کر دیتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اسے تباہ کر دیتی ہے یہ رسول کے موقف کی کس قدر کھلی وضاحت ہوئی ہے؟

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنَاهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّعَذَّبْنَاهَا عَذَابًا نُّكْرًا فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فَاتَّقُوا اللّٰهَ يَا اُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيَاتِ اللّٰهِ ۔ (۶۵ ۔ ۹/۱۱)	بہت سی بستیوں نے اللہ اور اس کے فرستادوں کے احکام سے روگردانی کی ہم نے ان سے سخت محاسبہ کیا اور بے مثل عذاب میں انھیں گرفتار کیا، انھوں نے اپنے کئے کا وبال برداشت کیا اور بالآخر انھیں بے حد خسارہ ہوا۔ اللہ نے سخت ترین عذاب ان پر مسلط فرمایا۔ اے دانشمند ایماندارو! اللہ سے ڈرو اللہ نے تمھاری طرف اپنا ذکر بصورتِ رسول نازل فرمایا جو تم پر اس کی آیات تلاوت کرتا ہے الخ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول کے احکام کی نافرمانی کو بہت سی بستیوں کی تباہی کا سبب ٹھہرایا ہے اور ان کی اہمیت کو اوامرِ الٰہی کے مساوی قرار دیا ہے۔ حساب کی شدّت، عذاب، وبال اور بالآخر خسارہ کو اسی عصیان کا نتیجہ قرار دیا ہے اور تمام ایماندار اور عقلمند دنیا کو توجہ دلائی ہے کہ خدا کا ذکر رسول کی صورت میں نازل ہوا ہے تاکہ وہ اہلِ ایمان کو گمراہی کی ظلمتوں سے نکال کر ایمان کی روشنی سے روشناس کرے۔

اس طرح پوری سورۂ طلاق اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ رسول کے فرامین واجب الاطاعت اور واجب التعمیل ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

الاعتصام : ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۰ء

چوتھا مقالہ تمام ہوا

۵
پانچواں مقالہ
مسئلہ درایت
و
فقہ راوی کا
تاریخی و تحقیقی جائزہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرصہ ہوا میں نے ایک مضمون حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے تجدیدی اثرات کے متعلق لکھا تھا، جس میں عرض کیا گیا تھا کہ آج سے قریباً چار سو سال پہلے گو حکومت مسلمان تھی۔ لیکن تقلیدی جمود نے فکر ونظر پر پہرے بٹھا رکھے تھے، حضرت مجدد سرہندیؒ سے لے کر حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ تک یہ جنگ جاری رہی، اس جمود کو توڑنے میں برصغیر کی جماعت اہل حدیث نے بہت بڑا کردار ادا کیا۔ مضمون کئی اقساط میں شائع ہوا تھا۔

انھیں دنوں برادرم محترم مولانا رئیس احمد صاحب جعفری کا ایک مکتوب "الاعتصام" میں شائع ہوا جس کا مقصد یہ تھا کہ اہل حدیث کوئی مکتب فکر نہیں، بلکہ یہ اس مقدس گروہ کا نام ہے جنھوں نے فن حدیث کی تدوین فرمائی، حفظ اور ضبط وکتابت سے اس کے مختلف گوشوں کی حفاظت فرمائی۔ جعفری صاحب کا یہ ارشاد اور استفسار برادرانہ تھا، میں نے اس وقت جو مستحضر تھا اس کی روشنی میں جواب عرض کر دیا تھا۔

اس سے پہلے جماعت اسلامی کے بعض نشریات میں بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار فرمایا گیا تھا، ایک مضمون حضرت مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کا بھی "ترجمان القرآن" میں شائع ہوا، مولانا وسیع النظر عالم ہیں، ان کا مطالعہ وسیع ہے، فنون پر بھی نظر ہے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں اصابتِ فکر سے بھی نوازا ہے۔ مولانا نے اس مضمون میں گویا مولانا مودودی صاحب بالقابہ کے بعض مضامین کو ان کی نوک پلک درست فرما کر ذرا علمی انداز میں شائع فرمایا تھا کہ ان حضرات کے یہ ارشادات "تحقیقی" تھے ان کا نہج مناظرانہ نہیں تھا، مگر مجھے اس سے محسوس ہوا کہ علمی حلقوں میں مسلک اہل حدیث کے متعلق یہ غلطی عام ہو رہی ہے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے

کہ ائمہ حدیث نے ابتدا ہی سے اپنے آپ کو "فرقہ" کی حیثیت نہیں دی تھی۔ اپنے تشخص اور نظریات کی حفاظت تو کی، لیکن فرقہ پروری کا انداز اختیار نہیں فرمایا، بلکہ دوسرے فرقوں کے ساتھ اختلاف کے باوجود رواداری اور اسلامی وحدت کو ہمیشہ قائم رکھا، اور کوشش فرمائی کہ غلط نظریات پر تنقید کے ساتھ اسلام یا سنت کے ساتھ ترادف میں فرق نہ آئے، اور کسی فرد واحد کو ایسی ترجمانی کا موقعہ نہ دیا جائے کہ وہ اسلام کے پورے سیاہ وسفید کا مالک ہو جائے، اس کی اطاعت واجب، اس کی مخالفت گناہ تصور ہونے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ عام علمی حلقے شاید دیانتداری سے "اہلحدیث" کو ایک فرقہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس کی دعوت ساذج اسلام کے سوا کچھ نہیں، میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بعض کتابیں اور رسائل شائع ہوئے جن میں جماعت اہلحدیث کو آڑے ہاتھوں لیا گیا تھا اور ان پر کڑی اور تلخ تنقید کی گئی تھی، یہ لٹریچر زیادہ تر دیوبندی مکتبِ فکر کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔

مولانا تھانوی کا خواب

اسی کے قریب دیوبندی حلقوں میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خواب بہت مشہور ہے، مولانا تھانوی صاحب نے طالب علمی کے زمانہ میں حضرت مولانا الشیخ محمد نذیر حسین صاحب قدس اللہ روحہ کے درس میں جانے کا ارادہ فرمایا تو انھیں خواب آیا کہ مولانا سید نذیر حسین صاحب رحمہ اللہ کے ہاتھ میں چھاچھ ہے اور طلبہ کو پلا رہے ہیں۔

خواب کی تعبیر واضح اور ظاہر تھی، کہ علمی تشنگی اور تحقیق ونظر کے لئے انسان کی فطرت میں جو طبعی سوز ہے، اس کا علاج دہلی کے درس میں ملے گا، تقلید وجمود کی سوزش اور جلن کا علاج مولانا نذیر حسین صاحب مرحوم کی چھاچھ میں پنہاں ہے۔ لیکن مولانا تھانوی نے ماحول کے تاثر اور اپنے رجحان طبع کے مطابق سمجھا کہ چھاچھ میں روغن نہیں، اس لئے وہ میاں صاحب کے فیوض سے محروم رہے، ان کے خیال

میں دہلی کے درس میں فقہ و درایت نہیں ہوگی ۔ یہ وہی عامیانہ خیال تھا، جو عموماً ائمہ حدیث اور اہل حدیث کے متعلق ان حلقوں میں کافی مشہور رہے، حضرت مولانا نے بھی خواب کے متعلق اسی ماحول میں سوچا، انسان ماحول کا غلام ہے، ماحول سے بالا ہو کر سوچنا اربابِ تجدید کا وظیفہ ہے، ہر آدمی اس طرح نہیں کر سکتا ۔

غرض اہلحدیث اور ائمہ حدیث کے متعلق ان بزرگوں کے ذہنوں میں راسخ ہے کہ علمار حدیث اور فقہار حدیث تفقہ فی الدین سے آشنا نہیں ہیں ۔ یہ غلط فہمی اس لئے ہوئی کہ جماعت اہل حدیث نے مسلک کی تبلیغ میں ہمیشہ تساہل برتا، ہم اور ہمارے مبلغ اپنے مواعظ اور تقاریر میں صلح کل پالیسی اختیار فرماتے رہے، تلخی، تیزی، بدزبانی یقیناً بری چیز ہے، لیکن اچھے لفظوں میں حقیقت کی وضاحت میں تساہل کرنا عیب ہے ۔ قادیانی، منکرین حدیث، اپنے خیالات کے اظہار میں جھجھک محسوس نہیں کرتے، لیکن ہم لوگ ہمیشہ صلح پسندی میں حقیقت پسندی سے گریز کر جاتے ہیں، اب تو کچھ ایسے حضرات پیدا ہو گئے ہیں، جو کہ اہلحدیث کے ذکر سے بھی شرماتے ہیں، اس لئے عوام میں ایسی غلط فہمیاں پیدا ہونا بالکل قدرتی چیز ہے، حق اور صداقت کے اظہار میں شرم نہیں محسوس کرنا چاہئے ۔

حضرت مولانا تھانوی مرحوم اور ان کے ہم مشرب بزرگوں کا وہم ہے کہ میاں صاحب مرحوم اور ان کے ہم مسلک علمار میں ظاہریت غالب ہے، تفقہ اور گہرائی نہیں، حالانکہ میاں صاحب مروجہ فقہ حنفی میں اس وقت کے اکابر علمار احناف سے زیادہ مہارت رکھتے تھے، مولانا تھانوی تو اس وقت طالب علم تھے، مولانا عبدالحئی صاحب لکھنوی ایسے اکابر میاں صاحب کے تفقہ، دقت نظر اور وسعت علم کے معترف تھے، مرحوم کے فتاویٰ میں اس کی صراحت موجود ہے (ص ۱۰۲ ج ۱)

ایک دو نئے مولوی صاحبان

ہمارے قریب شیخوپورہ میں ایک دیوبندی بزرگ اقامت پذیر ہیں، ان کی ایک

کتاب کسی دوست نے عنایت فرمائی، کتاب کے ابتدائی اوراق پھٹے ہوئے ہیں، نام معلوم نہیں ہو سکا، بہ ظاہر یہ کتاب حکیم محمد اشرف سندھو مرحوم کی کتاب نتائج التقلید کے جواب میں لکھی گئی ہے، افسوس ہے کہ لب و لہجہ کے لحاظ سے یہ کتاب بھی مرحوم حکیم صاحب کی کتاب سے اچھی نہیں۔

اس کتاب میں انھوں نے ان ہی دو چیزوں پر زور دیا ہے، کہ اہل حدیث کوئی مکتب فکر نہیں، یہ محض حفاظ حدیث کا ایک گروہ ہے، جن کا مشغلہ حفظ متون اور اسانید کا ضبط ہے، دوسرے یہ کہ ان لوگوں میں تفقہ اور درایت نہیں، تیسری اہم لغزش مولانا نے یہ فرمائی کہ وہ فقہ سے مراد یہ جزئیات سمجھتے ہیں، جو مروجہ متون اور شروح میں پائی جاتی ہیں، ابتدائی اوراق میں فقہاء صحابہ اور تابعین کا ذکر فرمایا اور یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ یہ بزرگ کس معنی سے فقیہ ہیں، جب کہ اس وقت یہ مروجہ فقہیں اور ائمہ اجتہاد ہی نہ تھے، نہ یہ متون موجود تھے اور نہ شروح، چنانچہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:-

"اسی طرح ہمارے زمانہ کے اہل حدیث اپنے آپ کو فرقہ بناتے اور بتاتے ہیں۔ اگر یہ ایک فرقہ ہے تو عہد نبوت سے لے کر انگریز کے عہد حکومت تک اہل سنت کی متعدد شاخوں میں اس فرقہ کو کوئی نہیں جانتا، بلکہ مسلمانوں پر؟ اہل علم پر؟ اس فرقہ کا وجود انگریز کے جبر و استبداد کا ایک پہلو؟ اور مسلمانوں میں فرقہ ڈالنے کا ایک فکر ہو سکتا ہے" (ص ۳۱ بلفظہ)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:- "اہل حدیث، اہل کلام، اہل اصول، اہل تفسیر، اہل معانی، اہل ادب، اہل تاریخ، فن کے مدارس اور علم کے طبقات ہیں۔ مذاہب اور مسالک نہیں ہیں، مفسرین کو اہل تفسیر، متکلمین کو اہل کلام، مؤرخین کو اہل تاریخ محدثین کو اہل حدیث کہا گیا، اور کہنا چاہئے، مگر اہل کلام، اہل تاریخ، اہل معانی، اہل تفسیر کی طرح اہل حدیث بھی مذہبی فرقہ نہیں ہے" صہ ۳۲ بلفظہ۔

"کتاب وسنت کے معانی کو اہل حدیث محدثین نہیں جانتے تھے، ان کا وظیفہ صرف اس قدر تھا کہ علم حدیث کی روایت کرتے، مگر معانی کو تالا لگا ہوا تھا، فقہاء نے حدیث کے معانی بیان فرمائے اور لگا ہوا تالا کھولا" ص ۳۲ بلفظہ

مولانا کی زبان اور استدلال میں علمی ثقاہت نہیں، جس کی ایک پڑھے لکھے آدمی سے امید ہونی چاہیئے، یہ درست ہے کہ نتائج التقلید کی زبان اور لہجہ بھی خاصہ تلخ ہے، مرحوم حکیم صاحب سے انتقام لے لیتے، مگر ائمہ حدیث پر اتہام، انصاف نہ تھا۔

ایک اور مولانا فرماتے ہیں۔ اہلحدیث سے وہ حضرات مراد ہیں جو حدیث کے فہم حفظ اور اس کے اتباع و پیروی کے جذبہ سے سرشار اور بہرہ ور ہوں ... اہلحدیث کا مفہوم جو غیر مقلد حضرات کی طرف سے سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے کہ ترک تقلید ہے، سراسر غلط سولہ آنے باطل اور سو فیصد بے بنیاد ہے۔ (طائفہ منصورہ ص ۱۴)

یہی مؤلف صاحب ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں، "چونکہ غیر مقلدین حضرات کو فقہ اور اہل فقہ سے تنفر اور عناد ہے اس لئے وہ کسی طرح طائفہ منصورہ کی حدیث کے مصداق نہیں ہو سکتے، جس میں تفقہ فی الدین کے الفاظ سورج کی شعاعوں کی طرح صاف چمک رہے ہیں اور اس کا اصل اور صحیح مصداق صرف وہ حضرات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے تفقہ فی الدین کا ملکہ عطا فرمایا ہے، اور وہ ائمہ دین اور ان کے مقلدین ہیں" انتہی ملخصا (طائفہ منصورہ ص ۱۸)

کسی شخص کی فقہیات کو من وعن اور کلی طور پر قبول نہ کرنا دوسری بات ہے اور فقہ سے نفرت دوسری بات، شتان بینھما۔ اہل حدیث میں پہلی بات تو ہے دوسری سے برأۃ کا اظہار کرتے ہیں، قیاس کو حجت ماننے کے بعد فقہ سے نفرت کا کوئی مطلب نہیں، فقہ الحدیث میں ائمہ حدیث کے ضخیم ذخائر موجود ہیں، پھر نفرت کیسے؟ بعض مسائل پر تنقید ضرور ہوئی ہے اور یہ گناہ مقلدین فقہاء اربعہ بھی متون اور شروح میں فرماتے ہیں، اگر اس کا معنی نفرت ہے، تو ع این گناہ ست کہ در شہر شما نیز کنند۔

مجھے مؤلف محترم کے اس سوءِ ظن اور مطاعن سے غرض نہیں وہ جو چاہیں فرمائیں،
کتاب کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غالباً خون کے دباؤ کے مریض ہیں، اسی
لئے پوری کتاب بلا وجہ ناراضگی اور پراگندہ خیالی کا مجموعہ ہے۔

ان حوالہ جات سے مقصد یہ ہے کہ یہ حضرات تفقہ فی الدین سے صرف مروجہ
فقہی جزئیات اور متعارف دفاترِ فقہ سمجھتے ہیں، حالانکہ آیت کا نزول بہت پہلے ہے،
جس تفقہ فی الدین کی تعریف قرآن اور سنت میں فرمائی گئی ہے، اس سے محدثین اور
علماء اہل حدیث کو وافر حصہ ملا ہے، مگر وہ ان آراء الرجال کو دین نہیں سمجھتے، بلکہ
کتاب وسنت کی روشنی میں ان سے استفادہ فرماتے ہیں اور تفقہ فی الدین کی کوشش
کرتے ہیں۔

ایک اور مقام پر یہی مؤلف امام ترمذی کی شافعیت کے تذکرہ میں مولانا مبارک
پوری رح سے الجھنے کی کوشش فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ امام ترمذی امام شافعی کی
مخالفت کے باوجود شافعی ہیں، اولاً اس لئے کہ اہل علم مقلد نرے لکیر کے فقیر نہیں
ہوتے وہ دلائل کی صحت وسقم کو پرکھتے اور جانتے ہیں، اور کمزور دلائل میں اپنے
امام کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں انتہی (طائفہ ص ۱۱۴)

اہلحدیث بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے، یہ واقعتاً معلوم ہے۔ کہ ان
مسالک کے دلائل بسا اوقات کمزور ہوتے ہیں، اور ایسے وقت میں ان کا ساتھ چھوڑ
دینا کوئی برائی نہیں بلکہ خوبی ہے، اس صراحت کے بعد اہلحدیث پر ناراضگی بے معنی ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں "بایں ہمہ وہ اصولی طور پر مقلد ہی ہوتے ہیں"، ہماری
ادبًا یہ رائے ہے کہ "بایں ہمہ یہ اصولی طور پر غیر مقلد ہیں"، بحث لفظی سی رہ گئی۔ آپ
خواہ مخواہ غیر مقلد حضرات پر ناراض ہوتے رہیں، حقیقت تو کھل گئی۔ آپ نے عملاً
امام ابو یوسف، امام محمد، امام طحاوی کے متعلق اقرار فرما لیا کہ وہ اپنے امام کی فقہیات
میں پورے مقلد نہ تھے۔ ولا نعنی بترك التقليد الا ذلك، ہمارا اتنا ہی گناہ ہے،

کہ اشخاص کے بجائے دلائل پر انحصار کرتے ہیں، غرض یہ پوری کتاب تضاد اور پراگندہ خیالی کا مجموعہ ہے۔

ان گذارشات سے نہ مؤلف کی تردید مطلوب ہے نہ اس کتاب کا جواب، ہماری گذارش صرف اس مغالطہ کا ازالہ ہے جو فقہ کے مفہوم کی تخصیص سے ائمہ حدیث کے متعلق پیدا ہوا یا پیدا کیا گیا۔

آیات اور احادیث میں جہاں فقہ کا لفظ آیا ہے اسے اس معنی پر محمول فرمائیں جس سے وہ قرون اولیٰ میں منطبق ہو سکے، جو فقہیں اس وقت موجود ہی نہ تھیں، انھیں مراد لینا دھوکا ہوگا، فروع کے استنباط کا مشغلہ ہمیشہ رہا، لیکن قرون خیر میں کوئی شخص کسی دوسرے کی فقہ کا پابند نہ تھا، واجب یا فرض کہنا تو بڑی بات ہے، امام ابن قیم رح فرماتے ہیں:

فانا نعلم بالضرورة انه لم یکن فی عصر الصحابة رجل واحد اتخذ رجلا منهم یقلده فی جمیع اقواله فلم یسقط منهم شیئا و اسقط اقوال غیره فلم یاخذ منها شیئا ونعلم بالضرورة ان هذا لم یکن فی التابعین ولا تابعی التابعین فلیکذبنا المقلدون برجل واحد سلک سبیلهم الوخیمة فی القرون الفضیلة علی لسان رسول اللہ صلعم	ہم قطعاً جانتے ہیں کہ صحابہ رض تابعین رح اور تبع تابعین میں ایک بھی ایسا آدمی نہیں جو ایک ہی آدمی کے فقہی اقوال کو کلی طور پر قبول کرے اور دوسرے کے اقوال سے کوئی استفادہ نہ کرے ارباب تقلید ایک ہی آدمی بتا کر ہماری تکذیب فرمائیں۔ اعلام ج ۱ ص ۲۲۲ مطبوعہ ھند

یہ وہی ابن قیم رح ہیں جن کو "طائفہ منصورہ"، کے مؤلف نے حنبلی مقلد بنایا ہے۔ علماء حق اور اہل حدیث نے ان فقہیات کے خلاف اس وقت آواز اٹھائی

جب ان آرار رجال اور متعارض فقہیات کو اغلال وسلاسل کی صورت دے دی گئی اور ایک مجتہد کے ساتھ وابستگی واجب قرار دے دی گئی، آج بھی ان فقہیات کو اپنے مقام پر لے آئیے اور انھیں علمار کے افادات اور افکار سمجھئے۔ ان کے قبول کو واجب نہ فرمائیے، تو معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ سوال فقہیات سے نفرت یا ان کے رد وقبول کا نہیں، سوال صرف اس قدر ہے کہ ایک مجتہد کی تمام فقہیات کو واجب القبول کس نے بنایا؟ یا قرون خیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کون بزرگ تھے جن کی ساری فقہیات پر یقین اور عمل واجب قرار دیا گیا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ خود ائمہ اجتہاد نے بھی اس التزام سے روکا۔ بعض خلفار نے امام مالکؒ سے فرمایا کہ مؤطا کو پوری عباسی قلمرو میں آئین کی حیثیت دے دی جائے۔ امام نے اس کا انکار کر دیا، اگر اس تقلید وجمود کے لئے کوئی شرعی بنیاد ہوتی، تو امام مالک خلیفہ کی اس استدعا کو ضرور قبول فرما لیتے۔ ان مولانا صاحب کا ایک اور گرم گرم پیرا سن لیجئے اور ان حضرات کے علم اور اخلاقی رفعت کی داد دیجئے،

فرماتے ہیں:۔

نہایت تعجب ہے اور سخت حیرت ہے کہ بالکل نو احداث جماعت اور کل کی پیداوار جب مذاہب اربعہ پر تنقید کرتی ہے، تو اس کو چوتھی صدی کے بعد کی بدعت قرار دیتی ہے (ہم نہیں بلکہ ملاحظہ ہو حجۃ اللہ ص ۱۲۲ ج ۱ اور قوت القلوب ص ۲۷ ج ۳۶) اور اپنا رشتہ جناب رسول اللہؐ اور صحابہ سے جا ملاتی ہے، اور اپنے گھر کا یہ راز اور بھید بھولے سے بھی نہیں بتاتی کہ اس کا بانی مبانی کون تھا، علمار ہند نے اس کے متعلق کیا کہا اور علمار حرمین نے کیا فتویٰ دیا ہے، پہلے یہ کس نام سے موسوم تھی اور اہلحدیث کا لقب کب سے اختیار کیا، تف ہے اس دیانت پر، حیرت ہے اس تعصب پر اور تاسف ہے اس پردہ پوشی پر، مگر ان کو معلوم ہونا چاہیئے ؎

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالیست   شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

میں کسی چیز کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا، آپ جو سمجھتے ہیں سمجھیں جو کہنا چاہتے ہیں کہیں، نواب صاحب اور مولانا محمد حسین مرحوم کی رائے کیوں بدلی آپ کے اکابر کا اس میں کہاں تک دخل تھا، حرمین کے فتووں میں حاجی امداد اللہ، مولانا خیر الدین مولوی رحمۃ اللہ مرحوم کیرانوی نے کیا کردار ادا کیا اور ۱۸۵۷ء کے محاربہ میں آپ کے اکابر نے کیا اقدام کیا، یہ تاریخ کی امانت ہے۔ اسے نہ ہلائیے، اللہ ہماری اور ان سب بزرگوں کی خطائیں معاف فرمائے، ان کی موت کے بعد ان گندے کپڑوں کو اپنے حال پر رہنے دیجئے، ۱۸۳۱ء کے بعد آپ کے اکابر برسوں کہاں رہے، تحریک حریت پوری صدی کن ہاتھوں میں رہی، یہ تاریخی حقائق ہیں، آپ کی تف اور تاسف سے حقائق نہیں بدل سکتے، انبالہ کیس میں انگریز کی نظروں نے کن حریت کے پروانوں پر ہاتھ اٹھایا، لاہور کے جیل خانہ میں منوں بیڑیوں کے بوجھ کن گلوں اور پاؤں کی زینت رہے ع

کبھی فرصت میں سن لینا بڑی ہے داستاں میری

مجھے آپ کی تیزی سے دکھ ہوا، جب آپ اس داستان کو جانتے ہی نہیں تو اس جوش میں کیوں آتے ہیں، امید ہے آپ تاریخ کے اس حصہ کو نہیں ہلائیں گے، رہے نام تو آپ ہی سوچیں، آپ پہلے مسلمان تھے، پھر اہل سنت ہوئے، پھر حنفی ہوئے اب دیوبندی ہیں آئندہ معلوم نہیں کیا ہوں گے، اس ضمن میں ماتریدی، اشعری، چشتی، قادری کے بعد شاید اشرفی اور کیا کیا بن جائیں۔

اللہ کے عطیے علم، عقل، تفقہ، صحت، قوت، تیقظ، معاملہ فہمی، فراست، قوت تکلم اور حافظہ وغیرہ یہ خدا تعالیٰ کے احسانات ہیں جو اس نے نوع انسان میں ودیعت فرمائے ہیں، ہر انسان پر ان اوصاف کی نوازش فرمائی گئی، کوئی انسان ان سے محروم نہیں، لیکن پوری نوع انسان اس میں مساوی نہیں، انبیاء علیہم السلام سے عامۃ المسلمین تک ملوک اور اصحاب ثروت

سے عامۃ الناس تک ان انعامات سے بقدر تحمل مستفیض ہیں، مختلف طبقات ان انعامات الٰہیہ سے بہرہ ور ہیں، (تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض) (آل عمران) میں تفاوت مراتب اور اس فرق کی صراحت فرمائی ہے، (نرفع درجات من نشاء وفوق كل ذي علم عليم) (یوسف) میں علمی مراتب میں تفاوت کو ظاہر فرمایا ہے، باقی انعامات کا بھی یہی حال ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ایک شخص مروجہ فقہ پڑھتا رہے تو وہ فقیہ رہے لیکن مثلاً جب وہ حدیث پڑھنا شروع کرے تو فقہ اس سے رخصت ہو جائے، خود حنفی علماء جو عمر کا معتدبہ حصہ اس مروجہ فقہ میں صرف کر دیتے ہیں معاملات میں انتہائی بے سمجھ ہوتے ہیں، وہ مروجہ متون اور شروح کو کتاب وسنت کی طرح مانتے ہیں، ہمارے یہ تقلید پسند حضرات یہاں حکیم اور عطار کی مثال دے کر عموماً خوش ہوتے ہیں، وہ مثال بھی فرق مراتب کی حد تک درست ہے لیکن طبقات کی تقسیم کے لحاظ سے بالکل بے معنی ہے، مروجہ فقہاء اور فقہ کے ماہرین بھی عملاً عطار ہی نظر آتے ہیں۔

ایک دیوبندی عالم نے ابن جوزی کی کتاب سے جو اوصاف کسی حدیث کے غلط کار طالب علم کے ذکر فرمائے ہیں، آپ کے قرب وجوار میں آپ کے ہم مسلک حضرات میں بدرجۂ اتم موجود ہیں، جناب نے ابن جوزی کی نقد العلم والعلماء میں جو باب اہل حدیث کے متعلق تھا شوق سے پڑھ لیا ہے، ابن جوزی نے فقہاء کی حیلہ سازیوں کا بھی تذکرہ فرمایا ہے، ایک نظر اسے بھی دیکھ لیں، امید ہے معاملہ برابر ہی رہے گا، شیطان کی گرفت سے نہ "اہلحدیث" بچ سکتا ہے، نہ آپ کا "فقیہ" الا من رحمه الله، قدرت کے ان مواہب پر اگر بنظر تفقہ غور فرمایا ہوتا، تو شاید اس موضوع پر اتنے ورق سیاہ کرنے کی ضرورت نہ ہوتی، ہم میں سے کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ، وہ شیطانی وساوس سے کلیۃً محفوظ ہے، الا من عصمه الله، نہ ہی کسی فقیہ کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہر

لحاظ سے لغزش سے مبرا ہے۔

فقہ کیا ہے لغت میں فقہ کے معنی علم اور فطانت ہے، اور عرف شرع میں ایک فن کا نام ہے، جس میں فرعی مسائل کی جزئیات مذکور ہوتی ہیں، اور علم دین کو بھی فقہ کہتے ہیں، الفقه بالكسر العلم بالشئ والفهم له والفطنة وغلب على علم الدين بشرفه (قاموس ج ۴)

الفقه فهم الشئ، قال ابن فارس: وكل علم لشئ فهو فقه والفقه على لسان حملة الشرع علم خاص، وفَقِهَ فِقْهًا من باب تعب اذا علم، وفقه بالضم مثله، وقيل بالضم اذا صار الفقه له سجية (المصباح المنير ج ۲)

الفقه هو التوصل الى علم غائب بعلم شاهد، فهو اخص من العلم قال الله تعالى (فما لهولاء القوم لا يكادون يفقهون حديثا) (ولكن لا يفقهون) الى غير ذلك من الايات، والفقه العلم باحكام الشريعة يقال فقه الرجل فقاهة، اذا صار فقيها۔

(راغب ص ۲۹۱)

اس کے قریب قریب اقرب الموارد، مجمع البحار میں مرقوم ہے۔

فقه بالكسر اذا فهم و علم و بالضم اذا صار فقيها عالما، و جعله العرب خاصا بعلم الشريعة و تخصيصها بعلم الفروع منها

(مجمع البحار ج ۳)

باقی معانی کے علاوہ مطلقاً علم اور علم الفروع کو بھی فقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ تعبیریں متاخرین نے فرمائیں، جب مروجہ فقہ مدون ہوئی، لغت سے ظاہر ہے کہ فقہ کسی خاص فن میں محصور نہیں، بلکہ اس لفظ کے معانی اور محمل متعدد ہیں، ہر علم فقہ کہلا سکتا ہے، اور اس تفقہ کے مراتب مختلف ہیں۔

شرعی اصطلاح

اصطلاح شریعت میں فقہ کا لفظ مختلف مقامات پر بولا گیا ہے، ہشام بن عبداللہ فرماتے ہیں :-

من لم یعرف اختلاف الفقہاء فلیس بفقیہ (جامع بیان العلم لابن عبدالبر ص۴۶ ج ۲) یعنی جو علماء کے اختلافات کو نہیں جانتا، وہ فقیہ نہیں کہلا سکتا۔

قتادہ فرماتے ہیں : من لم یعلم الاختلاف لم یشم الفقہ بانفہ (ایضاً ص۴۶ ج ۲) یعنی جو علماء کے اختلافات کو نہیں جانتا، اس نے فقہ کو سونگھا بھی نہیں۔

حارث بن یعقوب فرماتے ہیں : ان الفقیہ کل الفقیہ من فقہ فی القرآن وعرف مکیدۃ الشیطان (ایضاً ص۴۷ ج ۲) یعنی، فقیہ وہ ہے، جو قرآن کو سمجھے اور شیطان کے فریبوں کو پہچانے۔

امام مالک سے پوچھا گیا، کیا علماء کے اختلافات سے اہل الرائے کے اختلافات مراد ہیں؟ فرمایا صحابہ کے اختلافات مطلوب ہے۔

مجاہد فرماتے ہیں :- الفقیہ من خاف اللہ (ایضاً ص۴۹ ج ۲)

آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے بروایت حضرت علی منقول ہے الا انبئکم بالفقیہ کل الفقیہ؟ قالوا بلی، قال من لم یقنط الناس من رحمۃ اللہ، ولم یؤیسھم من روح اللہ ولم یؤمنھم من مکر اللہ، و لایدع القرآن راغبۃ عنہ الی ماسواہ الا لاخیر فی عبادۃ لیس فیھا تفقہ الخ (ایضاً ص۴۴)

یعنی، فرمایا : میں تمھیں بتا دوں سب سے بڑا فقیہ کون ہے؟ صحابہؓ نے فرمایا : ضرور بتائیے، فرمایا : جو آدمی لوگوں کو اللہ کی رحمت سے ناامید نہ کرے، اور اللہ کی تدبیر سے عوام کو بے خوف نہ کرے، قرآن سے نفرت اور ماسوا کی

طرف توجہ نہ کرے، عبادت بلا تفقہ عبث ہے۔

ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں (صـ۲۳ تا صـ۴۹) لفظ فقہ کے مفہوم کا تذکرہ بڑے بسط سے فرمایا ہے، آنحضرت صلعم کا دوسرا ارشاد گرامی ہے:۔

رب حامل فقه غير فقيه، ورب حامل فقه الى من هو افقه منه اھ ابن عبد البر فرماتے ہیں۔ فسمى الحديث فقها مطلقا وعلما (جامع صـ۲۷) اس میں حدیث کو فقہ سے تعبیر فرمایا ہے۔

امام مالک فرماتے ہیں:۔ ليس الفقه بكثرة المسائل ولكن الفقه يؤتيه الله من يشاء من خلقه (جامع صـ۴۵ ج ۲) یعنی فقہ زیادہ مسائل جاننے کا نام نہیں، بلکہ فقہ اللہ کی عطا ہے، جسے وہ دے دے۔

ابن عبد البر نے جامع بیان العلم کے صـ۲۳ سے صـ۴۹ تک فقہ اور علم کے متعلق بے حد مفید مواد جمع فرمایا۔ اہل علم کو اسے غور سے پڑھنا چاہیئے، فقہ، علم حکمت اور رائے کا مفہوم سمجھ میں آجائے گا، اور کچھ تعجب نہیں، کہ فرح بالعلم کے جراثیم دماغ سے نکل جائیں۔

الفقه معرفة النفس مالها وما عليها اھ (فقہ اکبر صـ۱)

یعنی نفس کی ذمہ داریوں کے سمجھنے کا نام فقہ ہے، یونانی علوم کی اشاعت کے بعد جب متکلمین نے مناظرات کا آغاز کیا اور تاویلات کی گرم بازاری ہوئی تو علم الکلام کو بھی فقہ سے تعبیر کیا گیا، فقہ اکبر جو حضرت امام ابو حنیفہ رح کی طرف منسوب ہے اسی دور کی کتاب ہے، اسی لئے اس کا یہ نام رکھا گیا۔

فقہ الاجتہاد ائمہ اجتہاد رحمہم اللہ کے اجتہادات جب رائج ہوئے تو ان کے اتباع نے ان اصولوں کی روشنی میں مزید فروع کی تخریج فرمائی، اور یہ اثرات اساتذہ سے تلامذہ تک اپنی طبعی افتاد سے پہونچے، اور ائمہ اربعہ کے ساتھ اور بہت سے ائمہ اجتہاد کی فقہیں بھی مروج ہوئیں اور ان

پر عمل ہوتا رہا، ان کا نام بھی فقہ قرار پایا، اور تلامذہ اساتذہ سے اسے وراثتہً لیتے رہے، بتدریج اسی تعلق نے جمود کی صورت اختیار کی، تو اس فقہ کی دو صورتیں ہو گئیں، فقہ المجتہدین یعنی ائمہ اجتہاد کی مجتہدانہ مساعی جو کتاب وسنت سے براہ راست پیش آمدہ مسائل کا استنباط فرماتے تھے، ادلہ شرعیہ کی روشنی میں ان پر غور ہوتا اور وقت کے مسائل کو حل فرمایا جاتا، اس میں باہم اختلاف بھی ہوتا، غلطی کا امکان بھی ہوتا، اساتذہ، تلامذہ بحث ونظر کے بعد کسی ایک دوسرے کی رائے کو قبول فرماتے، کبھی اپنی اپنی رائے پر قائم رہتے، لیکن حسن ظن اور محبت کے تعلق بدستور قائم رہتے، اس مجتہدانہ فقہ کی عمر ائمہ اجتہاد کے بعد بڑی مختصر رہی، جلد ہی اس پر جمود طاری ہو گیا، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ نے چوتھی صدی ہجری کے آخر تک اس کا اندازہ فرمایا ہے، اس کے بعد جمود کا دور آگیا، اور تحقیق عیب شمار ہونے لگی، اذہان کے خمیر میں احساس کہتری سمو دیا گیا، لوگ اپنی لاعلمی وکم فہمی کا فخریہ اقرار کرنے لگے، اور ائمہ اجتہاد کی طرح نصوص سے براہ راست استنباط ختم کر دیا گیا۔

فقہ التقلید قریباً چوتھی صدی کے بعد ادلہ تفصیلیہ سے استدلال بتدریج متروک ہو گیا، فقہ کے مروجہ متون کو من وعن قبول کر لیا گیا، عام طور پر شروح میں اصل ادلہ سے بہت کم تعرض کیا گیا، پہلے بزرگوں سے جو کچھ منقول تھا، اس پر اکتفا کر لیا گیا، استدلال اور استنباط کی راہ ترک کر دی گئی، یہی متقدمین کی استنباط شدہ فروع کافی سمجھے گئے، اور جزوی تعبیر کو جو کسی امام نے فرمائی شریعت سمجھ لیا گیا، اصل ادلہ یعنی قرآن وسنت اجماع اور قیاس ان سے تعرض صرف مجتہد کا وظیفہ طے پایا، اور اجتہاد کے دروازوں پر چوتھی صدی کے بعد تالا لگا دیا گیا، رسالہ حمیدیہ میں ہے:

لکن من عصر اربع مائۃ من الھجرۃ النبویۃ علی صاحبہا
انا کی صلوٰۃ وسلام قال بعض العلماء الاعلام کما ینقل من
علماء الحنفیۃ ان باب الاجتہاد قد انسد من ذلک التاریخ اھ
(ص ۳۲۸) یعنی سنہ ۴۰۰ ہجری میں بعض علماء حنفیہ سے منقول ہے کہ اجتہاد
کا دروازہ بند ہو گیا یعنی یکم محرم سنہ ۴۰۰ھ سے فکر و اجتہاد کے دروازہ پر تالا
پڑ گیا۔

یہ رسالہ ایک بہت بڑے ترکی عالم شیخ حسین آفندی الجسری نے سلطان
عبدالحمید خاں کے دور حکومت میں ان کے لئے لکھا تھا۔

اس سے ظاہر ہے کہ فقہ الاجتہاد جو مجتہدین کا وظیفہ تھا ختم ہو گئی، علماء
حدیث میں تو تفقہ کا امکان باقی رہا، لیکن حضرات احناف نے تفقہ کا دروازہ
بند کر دیا، جو حضرات اہل حدیث پر فہم و تفقہ کا دروازہ بند فرماتے ہیں، وہ اپنے
لئے محرم سنہ ۴۰۰ھ سے فقہ الاجتہاد کی راہیں مسدود فرما چکے ہیں، زیادہ سے
زیادہ آپ کے ہاں فقہ التقلید باقی ہو گی، یعنی پہلے بزرگوں کی مظنون مساعی پر
قناعت کر لینا، لیکن یہ فقہ قطعی قابل فخر نہیں، آئندہ اگر ممکن ہوا تو عرض
کیا جائے گا کہ یہ فقہ جو آپ کے مدارس میں سالہا سال تک پڑھی جاتی ہے،
انتہائی سطحی ہے اور اس کے اکثر مسائل ظاہریت اور حشویت پر مبنی ہیں، پہلے
بزرگوں کے بعض قواعد اس فقہ کی بنیاد قرار پا گئے۔

اب جو فقیہ سمجھے جاتے ہیں، وہ بے چارے ان فروع سے آگے بڑھنے کی
جرأت نہیں کرتے، کنز، قدوری، ہدایہ، مختصر الوقایہ، شرح الوقایہ وغیرہ کتب
فقہ میں جس طرح جزئیات مرقوم ہیں، انھیں من و عن قبول کر لیا گیا ہے۔ انکی صحت
یا سقم سے بحث کا کسی کو حق نہیں دیا گیا، یہ قطعی حرفیت ہے، اور ظاہریت، ابن
حزم اور ان کے رفقاء نے جو طرز عمل حدیث کے ظاہر الفاظ سے روا رکھا، وہی ہمارے

ان متاخرین فقہار نے ان متون اور شروح کے ظواہر سے برتا، دوسروں کو حشوی اور ظاہری کہنے والے، خود آرار رجال اور متقدمین اور متاخرین کے فہم پر قانع ہو گئے، فقہ کی ان دونوں قسموں کا تذکرہ فقہ کی کتابوں میں بصراحت موجود ہے۔

واعلم ان الفقیہ عند الاصولیین ھو المجتھد فقط لا غیر کما یشھد بہ تعار یفھم للفقہ وعند الفقھاء الحافظ للفروع واقلھا ثلث (القول المامول فی فن الاصول صٓ) یعنی فقیہ صرف مجتہد کو کہا جاتا ہے لیکن فقہار کے نزدیک جو کم از کم تین جزئیات جانتا ہو فقیہ ہو سکتا ہے"

البحر الرائق میں ہے:۔ فالحاصل ان الفقہ فی الاصول من علم الاحکام من دلائلھا، فلیس الفقیہ الا المجتھد عندھم و اطلاقہ علی المقلد الحافظ للمسائل مجاز، وھو حقیقۃ فی عرف الفقھاء، بدلیل انصراف الوقف والوصیۃ للفقھاء الیھم[۱]

خلاصہ یہ ہے کہ ائمہ اصول کے نزدیک فقیہ مجتہد کا دوسرا نام ہے، مقلد پر جیسے فقہ کے کچھ مسائل حفظ ہوں فقیہ کا لفظ مجازاً بولا جاتا ہے، جیسے اگر فقہار کے لئے وصیت کی جائے، تو دونوں پر صادق آئے گی۔

اس صراحت کے بعد دیو بند یا بریلی کے مدارس میں جو لوگ فقہ کے مروجہ متون اور شروح پڑھتے ہیں اور ادلہ شرعیہ سے ان اجتہادات کی صحت کا موازنہ نہیں فرماتے، یہ سب حضرات ظاہری اور حشوی ہیں، یہ مروجہ متون اور شروح، حروف پر اعتماد اور یقین رکھتے ہیں، ادلہ تفصیلیہ سے فہم استدلال کا ان پر "تالا بند" ہے، جب تک مروجہ تقلید سے برأت کا اعلان نہ فرمائیں۔ ہمارے یہ جدید مصنف اور ان کے رفقار غور فرمائیں، فقہ سے محروم اہلحدیث ہیں یا آپ حضرات "تالا بند"، تو آپ حضرات نے خود فرما دیا، وجوب تقلید کے بعد

تالا کھلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

صاحب مسلم الثبوت فقہ کی تعریف میں فرماتے ہیں:- الفقہ حکمۃ فرعیۃ شرعیۃ فلا یقال علی المقلد لتقصیرہ عن الطاقۃ (ص۵ ج۱ طبع مصر) فقہ فروع شرعیہ حقیقیہ کا نام ہے، پس مقلد کو فقیہ نہیں کہا جائے گا، کیونکہ اسے حقیقت تک رسائی کی ہمت ہی نہیں، نہ اسے اجازت ہے کہ ادلۂ تفصیلیہ میں فقہ و درایت کی روشنی میں غور کرے۔

مسلم الثبوت کے مصنف منہیات میں فرماتے ہیں:- اعلم ان الفقہ فی القدیم کان متناولاً لعلم الحقیقۃ وھی علم الالٰھیات وعلم الطریقۃ وھی مباحث المھلکات والمنجیات وعلم الشریعۃ الظاھرۃ ومن ثم عرفہ ابوحنیفۃ بمعرفۃ النفس مالھا وما علیھا وسمی کتابہ فی العقائد بالفقہ الاکبر، وقال اللہ تعالیٰ: لیتفقھوا فی الدین، ثم لما تصدی قوم بالبحث عن العقائد وسموا العلم الکافل بذلک بالکلام اختص الفقہ بالمطالب العلمیۃ الشاملۃ للتصوف ایضا، وھو علم الاخلاق، ومن ثم قال بعض المحققین فی شرح المنہاج ان تحریم الریا والحسد من الفقہ، وصار ھذا عرفا، واستمر علیہ زمان جدید، ثم حدث فی زمان لاحق اختصاص الفقہ بالاحکام الظاھرۃ، ومن ثم تری کتب الفقہ للمتاخرین خالیۃ من علم الطریقۃ (مسلم منہیۃ ص۵ مصر)

یعنی فقہ کا لفظ ابتدا میں الٰہیات اور علم طریقت پر بولا جاتا تھا، اسی لئے امام صاحب نے فرمایا، یہ نفس کی ذمہ داریوں کی معرفت کا نام ہے، امام صاحب نے اپنی کتاب کا نام "فقہ اکبر" رکھا، علم کلام کے بعد یہ لفظ تصوف اور اخلاق پر بھی بولا جانے لگا، اسی لئے ریا اور حسد کی حرمت کو فقہ کہا گیا ہے، مدت تک یہی عرف رہا،

پھر عرصہ کے بعد یہ فقہ الفروع پر بولا جانے لگا۔ اھ

فقہ کا یہ مفہوم گویا مدتوں بعد مشہور ہوا اور متاخرین نے اسے بطور اصطلاح استعمال فرمایا، اور اب اس کی اس قدر شہرت ہوئی کہ قرون خیر اور متقدمین کے مفاہیم کا عرف عام میں استعمال متروک ہو گیا۔

غزالی فرماتے ہیں :۔

اعلم ان منشأ التباس العلوم المذمومة بالعلوم الشرعية، تحريف الاسامى المحمودة وتبديلها ونقلها بالاغراض الفاسدة الى معان غير ما اراده السلف الصالح والقرن الاول وهى خمسة الفاظ: الفقه، والعلم والتوحيد، والتذكير، والحكمة۔ فهذه اسامى محمودة والمتصفون بها ارباب المناصب فى الدين، ولكن تقلب الآن الى معان مذمومة، فصارت القلوب تنفر عن مذمة من يتصف بمعانيها لشيوع اطلاق هذه المعانى عليهم (اللفظ الاول الفقه) فقد تصرفوا فيه بالتخصيص لا بالنقل والتحويل، اذ خصوه بمعرفة الفروع الغريبة فى الفتاوى والوقوف على دقائق عللها واستكثار الكلام فيها،	یعنی شرعی علوم میں مذموم اور ناپسند علوم کا اختلاط اور التباس اس لئے ہوا کہ علوم کے اچھے نام جو زمانہ سلف میں بولے جاتے تھے اپنی فاسد اغراض کے لئے بدل دیئے گئے، اور ان کو ایسے مطالب پر بولا گیا، جن پر قرون خیر میں ان کا اطلاق نہیں ہوتا تھا، نہ ہی ائمہ سلف ان الفاظ سے یہ مطالب مراد لیتے تھے، یہ پانچ نام ہیں :۔ فقہ، علم، توحید، تذکیر، حکمۃ، یہ بہت اچھے نام ہیں ان کے جاننے والوں کا دین میں بہت بلند منصب تھا لیکن اب ان کو مذموم معانی پر بولا جانے لگا، اب ان سے اور ان کے جاننے والوں سے دل نفرت کرتا ہے، کیونکہ ان ناپسندیدہ معانی پر ان کا اطلاق عام ہو گیا ہے، فقہ کے مفہوم میں نقل اور تحویل کے بجائے ان لوگوں نے تخصیص پیدا کر دی ہے، اب سے فتووں میں فقہ غیر معروف اور تعجب انگیز فروع پر بولا جاتا ہے، اس پر

فمن کان اشد تعمقا فیھا و اکثر اشتغالا بھا یقال ھو الافقه، لقد کان اسم الفقه فی العصر الاول عن علم طریق الآخرة ومعرفة دقائق آفات النفوس (الی ان قال) ویدل علیه قوله تعالیٰ: لیتفقھوا فی الدین، ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم، وما یحصل به الانذار والتخویف ھو ھذا الفقه دون تفریع الطلاق والعتاق واللعان والسلم والاجارہ فذلک لا یحصل به انذار و لا تخویف بل التجرد له علی الدوام یقسی القلب وینزع الخشیة الخ

(احیاء علوم الدین ص۲۴ ج۱)

طویل گفتگو اور بال کی کھال اتارنے اور انکے علل اور وجوہ میں تعمق کا نام فقہ رکھ دیا گیا ہے جو ان میں زیادہ وقت ضائع کرے، اسے فقہ کہا جاتا ہے حالانکہ قرون اولیٰ میں یہ لفظ نفس کے امراض کی پہچان اور علوم آخرت کی معرفت پر بولا جاتا تھا، امام فرماتے ہیں کہ آیت کریمہ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم سے ظاہر ہے" دین کے فہم سے جو انذار اور خوف پیدا ہوتا ہے اسے فقہ سے تعبیر کیا گیا ہے، طلاق، عتاق، لعان، سلم، اجارہ وغیرہ مسائل کے جاننے سے نہ انذار ہوتا ہے نہ خوف، بلکہ صرف ان مسائل میں مشغولیت سے دل اور سخت ہو جاتا ہے اور خشیت الٰہی اس سے مفقود ہو جاتی ہے"۔

اسی طرح حکمت سے فلسفہ، توحید سے صفات باری کی نفی، علم سے یونانی علوم یا علم کلام، تذکیر سے قصہ گوئی کا پیشہ مراد لیا گیا، اور اصل مفہوم بالکل نظر انداز ہو گیا"۔

امام غزالی کے اس ارشاد کا تذکرہ علامہ کاتب چلپی (۱۰۶۷ھ) نے کشف الظنون ص۹۱ ج۲، نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے ابجد العلوم ص۶۰ ج۲ اور علامہ سید محمد علی البشاوری نے القول المامول فی فن الاصول ص۷ میں اور طاش کبری زادہ (۹۶۲ھ) نے مفتاح السعادۃ ص۶ ج۲ وغیرہ کتب

میں اجمال اور تفصیل سے فرمایا ہے، اور غزالی کی اس رائے پر کوئی تنقید نہیں فرمائی، بلکہ اسے پسند فرمایا، اور اسے حقیقت پسندی کی نگاہ سے ذکر فرمایا ہے۔

ہمارے یہ بزرگ جب محدثین اور فقہاء حدیث اور ان کے اتباع پر فقہ و درایت سے بے خبری کا الزام دیتے ہیں، تو ان کی مراد متعارف اور فنی فقہ ہوتی ہے، جس نے ان حضرات کی درس گاہوں میں صنعت و حرفت کی شکل اختیار کر لی ہے، نزول قرآن کے وقت نہ یہ فقہی جزئیات کا کوئی وجود تھا، نہ فقہ کے ان دفاتر کا استنباط اور استخراج، مسائل کی ضرورت ہوتی تھی، لیکن اسے فقہ سے تعبیر نہیں کیا جاتا تھا، نہ اس کی پابندی واجب سمجھی جاتی تھی، معلوم نہیں کہ یہ فن اگر کسی کو نہ بھی معلوم ہو تو اس میں کیا عیب ہے، دنیا میں کئی حرفتیں اور پیشے ہیں کئی علوم ہیں، جن کو آپ حضرات نہیں جانتے، اگر یہ ابواب الحیل نہ معلوم ہوں تو کیا حرج ہے پھر اس فن اور ان جزئیات فقہیہ کے فہم میں بھی تفاوت ہے، کئی لوگوں میں انتہائی ظاہریت ہوتی ہے، بعض ذرا گہرائی میں چلے جاتے ہیں، اور جب سے جامد تقلید کا شوق حضرات علماء کے اذہان پر محیط ہوا ہے، اس وقت سے ظاہریت اور حشویت عروج پر ہے، تحقیق اور دقت نظر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لئے کہ اجتہاد، مجتہدان امت کے سوا باقی لوگوں کے لئے چوتھی صدی کے بعد شجر ممنوع قرار پا چکا ہے۔

ایسے ہی ائمہ حدیث کا معاملہ ہے، فقہیات میں ان میں سے بعض کا مقام اتنا اونچا ہے کہ مروجہ فقہوں کے ماہر ان کی رفعتوں کو نہیں پا سکے، یہ حضرات نہ صرف فقہ الحدیث کے ماہر ہیں، بلکہ مروجہ فقہوں پر ان کی نظر بہت ہی عمیق ہے، وہ ان مروجہ فقہی مذاہب پر بڑی غائر تنقید فرماتے ہیں، بخاری، ترمذی، بیہقی، ابن خزیمہ اور ابن ابی شیبہ وغیرہم کی دقت نظر اہل علم میں مشہور رہی ہے، اس لئے یہ

"تالابند"، کا مسئلہ کسی علمی گروہ سے مخصوص نہیں، کم وبیش تمام طبقات میں سادہ لوح اور ظاہر بیں بھی پائے گئے ہیں، یہ عطار اور حکیم کی مثال بھی اسی نوعیت کی ہے، مروجہ فقہی مسالک احناف، شوافع اور موالک میں بھی بڑے بڑے "عطار" موجود ہیں قدرے سن بھی لیجئے:

(۱) طہارت کے ابواب میں پانی کی طہارت کا مسئلہ کس قدر سطحی ہے، پانی کچھ مقدار میں "دہ دردہ" کا تعین بالکل غیر فقہی ہے، جن ماخذ سے یہ مقدار اخذ کی گئی ہے اس میں بھی تفقہ اور درایت نہیں پائی گئی، بعض آثار میں گندے کوڑے کرکٹ کو کنویں کے منہ سے دس ہاتھ دور رکھنے کی ہدایت سے مقدار کا تعین اور اور پانی جیسی سیال چیز کو اس پر قیاس کرنا اس میں کون سی فقہ ہے، شوافع کا استدلال اس سے بہت بہتر ہے۔

(۲) پھر کنویں کے پانی کی مقدار کو بالکل ہی نظر انداز کر دینا اور بعض غیر مستند آثار پر اس کی بنیاد رکھنا بالکل ظاہریت ہے، کنویں کے پانی کے لئے عشر فی عشر کا اندازہ ملحوظ رکھ لیا جاتا، تو بھی مقدار میں اجمال بلکہ اہمال ہوتا، لیکن مسئلہ اس قدر بے تک نہ ہوتا (قاضی خاں صـ۷ ج ۱ شامی صـ۱۱ ج ۱)

(۳) موطوءہ لونڈی سے اثبات نسب کے لئے دعوی کی ضرورت پر زور، اور مشرقی، مغرب میں کسی عورت سے نکاح کرنے اور ملاقات کے متعلق یقین ہو کہ نہیں، تو بھی نسب ثابت ہو جائے گی (شامی صـ۹۷۴ ج ۲) یہ درایت کی کون سی قسم ہے، اور پھر اس پر حدیث الولد للفراش سے استدلال بڑی شنیع قسم کی ظاہریت ہے، ابن حزم کی ظاہریت بھی اس کے سامنے سرنگوں ہو گئی۔

(۴) ذکوان مولی حضرت عائشہ رضہ قرآن کریم دیکھ کر امامت کراتے تھے۔ اسے عمل کثیر کی وجہ سے ناپسند کیا، اور نماز کو فاسد قرار دیا گیا، لیکن عورت کے اندام نہانی کو غلط انداز سے دیکھے، تو نماز میں کوئی خلل نہ ہوگا (قاضی خاں صـ۱۱۱ ج ۱، اشباہ)

یہ کہاں کا تفقہ ہے، ان جزئیات کو پوری عقیدت سے قبول فرما کر محدثین کو عطار کہنا دانش مندانہ انداز فکر نہیں۔

(۵) محرمات ابدیہ سے نکاح کے بعد، منہ کالا کرنے کے بعد شبہہ فی المحل کی بنا پر اسے حد سے بچانا ادرءوا الحدود بالشبہات کی بنا پر بحث کرنا، اس میں ہمیں تو تفقہ سمجھ میں نہیں آتا (قاضی خاں ص ۳۲۴ ج ۱)

(۶) خمر کے متعلق جس وسعت سے فقہ حنفیہ نے پرمٹ دئے ہیں، اور خمر کی مختلف اقسام کے احکام جس حوصلہ مندی سے نافذ فرمائے، اس سے حدیث یسمونہ بغیر اسمہ کی تصدیق تو ہوتی ہے مگر تفقہ فی الدین کا اس سے ثبوت نہیں ملتا' عام حلال وحرام میں احتیاط کے لحاظ سے احناف خاصے نیک نام تھے، لیکن یہ نیک نامی اور احتیاط شراب میں قائم نہیں رہ سکی، بلکہ اہل علم میں غیر محتاط روش کی نظیر بن گئی۔

(۷) نکاح حلالہ کو ناجائز اور حرام سمجھنے کے باوجود یہ فتویٰ کہ اس سے پہلے خاوند کے لئے بیوی حلال ہو جائے گی غایت درجہ کی سطحیت ہے، اس کی تائید نہ روایت سے ہوتی ہے اور نہ درایت سے، اس تاویلی زنا کا جواز تقلید ہی کی بنا پر ہو سکتا ہے۔

اس قسم کی سیکڑوں جزئیات مروجہ فقہ کے دفاتر میں موجود ہیں جو عقل وشعور کے دامن کو بڑے زور سے جھنجھوڑتی ہیں۔ بجز تقلید اور عصبیت کے ان کے قبول کے لئے ذہن آمادہ نہیں ہوتا۔

ان گذارشات کا یہ مطلب نہیں، کہ فقہ حنفیہ کے سارے مسائل سطحی اور عدم احتیاط پر مبنی ہیں بلکہ بعض مقامات میں انتہائی تفقہ اور گہرائی سے کام لیا گیا ہے اور بڑی محتاط روش اختیار فرمائی گئی ہے، اس لئے دور اندیش اور محقق علماء کی رائے ہے کہ ان مروجہ مسالک سے کسی مسلک کے ساتھ کلی وابستگی نہیں رکھنی چاہیئے'

حذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل ہونا چاہئے ابن قیم فرماتے ہیں :۔

کما ان المکیین والکوفیین لایجوز تقلیدھم فی مسئلۃ المتعۃ والصرف والنبیذ ولا یجوز تقلید بعض المدنیین فی مسئلۃ الحشوش واتیان النساء فی ادبارھن بل عند فقہاء المحدثین ان من شرب النبیذ المختلف فیہ حد اھ (اعلام الموقعین ص۲۵۱ ج۳ طبع منیریۃ)	یعنی متعہ اور بیع صرف اور نبیذ کے جواز میں اہل مکہ اور علماء کوفہ کی تقلید درست نہیں ، اسی طرح مدینہ کے بعض علماء کی تقلید مسئلہ حشوش اور اتیان النساء فی الدبر میں درست نہیں ہے ، بلکہ فقہاء محدثین کا خیال ہے کہ جو شخص مختلف فیہ نبیذ کو پئے گا اس کو حد لگے گی ۔

ظاہر ہے تمام مسالک اور مذاہب میں بعض مسائل پوری تحقیق اور احتیاط سے تخریج کئے گئے ہیں اور بعض بالکل سطحی ہیں ، ان میں دقت نظر ملحوظ ہے نہ احتیاط ، ائمہ حدیث پر طعن سے پیشتر تمام مذاہب کی فقہوں میں ایسے مواد پر غور کر لینا چاہیئے ، ممکن ہے شکایت کا موقعہ نہ رہے ، بعض اہل حدیث علماء نے بھی مروجہ فقہ کی روش پر بعض کتب تصنیف فرمائیں ، جیسے نواب وحید الزماں ، نواب صدیق حسن خاں ، ان میں بھی اس قسم کا غیر محتاط مواد آگیا ہے ، جو یقیناً قابل قبول نہیں ۔

یہ راہ ہی ایسی ہے ، جس میں لغزش کا امکان یقینی ہے ، اور جہاں تک فہم و فراست کا تعلق ہے اس میں مراتب کا تفاوت تمام جماعت میں پایا جاتا ہے ، اور جہاں تک "تالابند" کا تعلق ہے ، اہل علم کے مختلف طبقات سے کوئی طبقہ کلیۃ محروم نہیں ، طعن سے پہلے پورے ماحول پر غور فرمالینا مناسب ہے ، جس فنی فقہ پر اس قدر ناز کیا جارہا ہے ۔ اس کا جاننا کوئی خاص خوبی ہے نہ اس سے محرومی کوئی بڑا عیب ہے ، فنی فقہ کے جاننے والوں میں بعض حشوی اور ظاہر پرست

بعض دقیق النظر، اسی طرح ائمہ حدیث میں دونوں قسم کے لوگ ہیں، یہ کوئی قانون نہیں، جو آپ حضرات کے نوک قلم پر بار بار آرہا ہے، آپ لوگوں کی جدید تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ حضرات میں سے اکثر حشوی اور ظاہری ہیں، یہ الگ بات ہے کہ آپ کی ظاہریت فقہ کے شروح اور متون میں محصور ہے، اور امام داؤد اور ابن حزم کی ظاہریت قرآن وسنت تک محدود ہے۔

الدرایۃ

لفظ درایت کے لغوی معنی اور متعارف معانی اور جدید اصطلاح میں فرق ہے۔ لغت میں اس کے متعدد مصادر ہیں:-

دراہ، دری بہ، یدری، دریا.... درایۃ، ودِریۃ، ودِریانا، ودَریانا، ودُریًا، ودرایۃ، وھی الاکثر فی الاستعمال (ریائی) علمہ، او توصل الی علمہ بضرب من الحیلۃ (محیط المحیط) آخر میں فرمایا :- وعلم الدرایۃ علم الفقہ، واصول الفقہ (ص۸۳ ج۱)

منجد، القاموس، المحیط، المصباح المنیر وغیرہ کتب لغت میں اس کا معنی علم یا مخصوص توجہ سے کسی چیز کا جاننا مرقوم ہے، علم فقہ یا اصول فقہ یہ مخصوص انداز ہے دینی علوم میں غور وتدبر کا، اس کا عرفی مفہوم بھی اس کے قریب قریب ہے۔

العلم بدرایۃ الحدیث، وھو علم باحث عن المعنی المفھوم من الفاظ الحدیث وعن المراد منھا، مبنیا علی قواعد العربیۃ وضوابط الشریعۃ، ومطابقا لاحوال النبی صلے اللہ علیہ وسلم اھ

یعنی اس علم میں احادیث نبویہ کے معانی اور مقاصد سے عربی زبان کے قواعد اور شریعت کے ضوابط، اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے حالات کے مطابق غور کیا جاتا ہے۔

(کشف الظنون ص۱۳۳ ج۱)

نواب صدیق حسن خاں ابجد العلوم میں فرماتے ہیں :-

وقال الشیخ شمس الدین الاکفانی السخاوی :

درایة الحدیث علم تعرف منه انواع الروایة واحکامها وشروط الروایة واصناف المرویات واستخراج معانیها، ویحتاج الی ما یحتاج الیه علم التفسیر من اللغة والنحو والتصریف والمعانی والبیان والبدیع والاصول، وتحتاج الی تاریخ النقلة۔ (صفحہ ۲۸۳ ج ۲)	یعنی علم درایت حدیث سے روایت کے اقسام، شروط اور احکام اور مرویات کی اقسام اور ان کے معانی کا استخراج ہوتا ہے، اور اس میں لغت، نحو، صرف، معانی بیان، اور بدیع کی اسی قدر ضرورت ہے، جس قدر علم تفسیر میں، اور ناقلین حدیث کے متعلق تاریخی معلومات یعنی موالید اور وفیات کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔

علامہ احمد بن مصطفیٰ طاش کبری زادہ ف سنہ ۹۶۳ھ علم درایت کے متعلق فرماتے ہیں :-

ھو علم یبحث فیه عن المعنی المفهوم من الفاظ الحدیث وعن المعنی المراد منها مبتنیا علی قواعد العربیة وضوابط الشریعة مطابقا لاحوال النبی صلعم،	طاش کبری زادہ نے لکھا ہے۔ اس کا موضوع احادیث نبویہ بلحاظ معانی اور مقاصد ہیں، اس کی غایت آداب نبویہ کے ساتھ تخلق ہے اور علوم عربیہ اس کے مبادی ہیں، یعنی اس علم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور عربی علوم کی روشنی میں احادیث کے معنی اور مفہوم سے بحث کی جاتی ہے۔
÷ ÷ ÷ ÷	
÷ ÷ ÷ ÷	

اوپر کی تعریفات سے فن درایت کے متعلق چند معلومات حاصل ہوتے ہیں :

۱۔ درایت کوئی مدون فن نہیں بلکہ عربی زبان اور اس کے متعلقات اور اصول فقہ و اصول حدیث میں مزاولت اور مہارت سے خود بخود ایک ذہن پیدا

ہوتا ہے، جس سے حدیث کے مفہوم کی بعض پیچیدگیاں بعض وقت حل ہوجاتی ہیں۔

۲۔ روایت اور رجال کے مباحث میں بھی اس سے فائدہ ہوسکتا ہے، لیکن اس کا زیادہ تر تعلق معانی اور مفہوم سے ہوتا ہے، بعض تاریخی مباحث بھی اس سے حل ہوسکتے ہیں رجال کی موالید اور وفیات، اتصال، انقطاع، ارسال، اعضال وغیرہ کے متعلق بھی اس سے روشنی پڑتی ہے، گو ان مباحث کا براہ راست تعلق اصول حدیث سے ہے۔

۳۔ ناقلین تاریخ سے نسخ کے مباحث میں بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے، گو اصل اس کا اصول فقہ سے ہے۔

۴۔ حدیث کا طالب علم خوب جانتا ہے، کہ حدیث کے رواۃ اور اسانید کے متعلق ائمہ حدیث نے کس قدر محنت فرمائی ہے، اور ان کے حالات کی کس قدر چھان پھٹک کی ہے۔

تاریخ بھی ہمارے پاس اسی قسم کی اسانید کے واسطہ سے پہنچی ہے، تاریخ طبری اور البدایہ والنہایۃ، مسعودی وغیرہ میں اسانید کا خاصا التزام کیا گیا ہے، لیکن یہ رواۃ اور اسانید، احادیث کے رواۃ اور اسانید کا مقابلہ نہیں کرسکتے، نہ ہی اس پر اس قدر محنت کی گئی ہے، اس کی وجہ ظاہر ہے، کہ حدیث حجۃ شرعی ہے، اور تاریخ شرعاً حجت نہیں۔

ائمہ اسلام میں بعض صرف محدث ہیں، بعض مورخ اور اخباری ہیں، بعض دونوں فنون کے ماہر ہیں، دونوں میں ان کی تصانیف موجود ہیں، لیکن دونوں کا ذوق ہر مقام پر مختلف ہوتا ہے، جب وہ حدیث اور اس کے رواۃ پر بحث کرتا ہے، اس کی شان اور انداز تحقیق اخباری اور تاریخی انداز سے مختلف ہوتا ہے، اگر اخباری روایات احادیث کے خلاف آجائیں، تو ائمہ حدیث اسے تعارض نہیں سمجھتے، تطبیق کی بجائے وہ حدیث کو ترجیح دیتے ہیں، اور بات بھی معقول ہے۔

فن درایت کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے، کہ بسا اوقات درایت کی وجہ سے ایسے قرائن جمع ہو جاتے ہیں، جن کی بنا پر اخباری روایات کو حدیثی روایات پر ترجیح دینا درست معلوم ہوتا ہے، درایت کی تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن میں اہم فائدہ یہی ہے۔

محض شخصی عقل اور تجربہ قرائن کی بنیاد نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ اساس پھر بھی روایت اور واقعات پر ہونی چاہیئے، عقلی استحالات ایک مستند قصہ کی تغلیط کے لئے کافی نہیں، بلکہ اگر صحیح روایات کی تغلیط محض عقلی احتمالات سے کی جائے، تو اس کا مطلب روایت اور رواۃ دونوں کی تکذیب ہوگا، اور اگر ان قرائن کی بنیاد کوئی دوسری حدیث ہو تو اعتماد روایت پر، اور قرائن ترجیح کا موجب ہوں گے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ سنت کو اس فن کی ضرورت چند وجہ سے ہوئی، چونکہ روایت بالمعنی کے متعلق ائمہ میں پہلے ہی سے اختلاف تھا، لیکن حقیقت یہ ہے روایت بالمعنی کا رواج عام تھا، حدیث کا ایک طالب علم جانتا ہے کہ ایک حدیث کس قدر مختلف الفاظ سے مروی ہوئی ہے، خود قرآن عزیز پہلے انبیاء کی تاریخ کو متعدد مقامات پر مختلف الفاظ میں ذکر فرماتا ہے، اسے روایت بالمعنی ہی کہا جا سکتا ہے، ائمہ حدیث اس اجازت کے بعد یقین فرمانا چاہتے تھے کہ کہیں حدیث کا اصلی مقصد ہی اختلاف تعبیرات کی وجہ سے پریشانی کی نذر نہ ہو جائے، اس لئے انھوں نے فن درایت کو عربی علوم کی اساس پر قائم فرمایا۔

فقہاء عراق

حضرات عقلاء عراق نے دو فتوے اور بھی دئے، جن کی بنا پر درایت کی ضرورت اور بھی زیادہ محسوس ہونے لگی، نماز میں فارسی قرأت کا مسئلہ حضرت امام ابو حنیفہ کی طرف منسوب تھا، مطولات میں اس کے متعلق رجوع اور اقرار دونوں امر منقول ہیں، اور قائل اور مخالف دونوں

خرق موجود، گو ائمہ حدیث بلکہ دوسرے ائمہ اس کے قائل نہیں، تاہم اہل علم کی محفل میں یہ مسئلہ مابہ النزاع ضرور ہے، اس سے روایت بالمعنی کے جواز کو مدد ملتی ہے، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی، کہ علوم عربیہ اور اس کے متعلقات کی روشنی میں مضبوط احتساب کیا جائے، کہ اصل مقصد گم نہ ہونے پائے۔

علماء عراق نے فخر یہ فرمایا، کہ ہم مراسیل کو بھی حجت سمجھتے ہیں، شامی نے ابواب وصیت میں فرمایا کہ اگر کوئی آدمی اہل حدیث کے نام پر کوئی چیز وقف کرے تو یہ وصیت حنفی طالب علموں کو بھی شامل ہوگی، کیونکہ یہ مرسل کو بھی حجت سمجھتے ہیں (رد المحتار صفحہ ۵۶۵ ج ۳) اہلحدیث بننے کا شوق بڑا مبارک ہے اور وقف پر قبضہ بھی خوب، لیکن بحث تو یہ ہے کہ مرسل کو علی الاطلاق حدیث کہنا درست ہے، امام شافعی نے الرسالہ میں یہ بحث مفصل فرمائی ہے (الرسالہ صفحہ ۴۶۲) اور واضح فرمایا ہے کہ مرسل کو حدیث کہنا یا سمجھنا کہاں تک درست ہے، کل ممکن ہے کوئی عالم زور بیان میں یہ فرماویں کہ اصل اہل حدیث ہم ہیں، کیونکہ ہم موضوع احادیث کو بھی مانتے ہیں، تو ہم ان بزرگوں کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟

صورت جو بھی ہو، ان وجوہ کی بنا پر محدثین اور ائمہ سنت کا یہ خطرہ ایک حقیقت معلوم ہوتا ہے، اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ ان فتووں کی زد اور نقصان سے بچنے کے لئے کچھ پابندیاں عائد کی جائیں تاکہ نقل احادیث میں علماء کی طغیانیاں اصل مقصد کو بہا کر نہ لے جائیں، اور مراسیل، مقطوعات کی آڑ میں موضوع اور مختلف چیزیں آنحضرت کی طرف منسوب نہ ہو جائیں اس لئے اس حفاظتی تصور کا نام علم درایت رکھا گیا، اور زیادہ تر اس کا انحصار لغت اور علوم لسانیہ پر رکھا گیا، تاکہ روایت کا مفہوم صحیح طور پر آگے منتقل ہو، مراسیل کی طرح کوئی غلط اور غیر یقینی نوشتہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت نہ پا جائے۔

فقہ راوی

جن مقاصد کے لئے بعض اہل علم نے درایت کی ضرورت کو محسوس فرمایا، انہی مقاصد کے لئے فقہاء عراق نے فقہ راوی کی قید لگائی، تاکہ نصوص کا مفہوم صحیح ادا ہو، اور روایت بالمعنی میں اس سے مدد مل سکے، اور آں حضرت کے ارشاد کی صحیح تعبیر مخاطب تک پہونچ سکے، گو درایت اور فقہ کے مصطلح مفہوم میں فرق ہے، لیکن مفہوم کے ادا میں ان دونوں ذرائع سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، اور یہ واقع میں صحیح بھی ہے، اور ضروری بھی، لیکن ائمہ حدیث اور فقہاء محدثین اس قسم کی قیود سے بے نیاز تھے، اسانید کے ضبط اور متون میں مختلف الفاظ کے حفظ و ادا سے ان کی طبائع میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا تھا، جس کی وجہ سے وہ فنی لطافتوں کے علاوہ ذوقی طور پر سمجھتے تھے، اور ہر صاحب فن کا اپنے فن میں یہی حال ہوتا ہے، وہ فن کی لطافتوں کو ذوق سے سمجھتے ہیں، معلوم ہے موجدین فنون نے، فنون کتابوں سے نہیں پڑھے، ہاں ذوق کی سلامتی ان فنون کی ایجاد کا موجب ہوئی، اصول فقہ، اصول حدیث معانی، بیان وغیرہ تمام فنون تصنیف و تالیف اور تدوین سے پہلے ذوق سلیم ہی کے مرہون تھے،

لیکن حدیث جن لوگوں کا فن نہیں تھا، حفظ و ضبط میں ان کا انداز محدثانہ نہ تھا، ان حضرات نے ذوق کا کام ان فنون سے لیا، اور پوری نیک دلی سے احادیث نبویہ اور ان کے مفاہیم اور مقاصد پر غور کیا، فجزاھم اللہ احسن الجزاء، علماء اپنے اپنے انداز سے خدمت کرتے رہے، اور ان اصول و قواعد کی راہ میں کوئی بے اعتدالی راہ نہ پا سکی۔

بے اعتدالی کا دور

جب یونانی علوم نے اسلامی علوم پر یورش کی، اور غیر مسلم اہل علم اسلام سے مانوس ہوئے، اسلامی علوم و عقائد ان کے خیالات و عقاید سے متصادم ہوئے، تو بے اعتدالی

کی راہیں پیدا ہونا شروع ہوئیں یہ اصطلاحات جن مقاصد کے لئے وضع کی گئی تھیں ان کے بالکل خلاف استعمال ہونے لگیں، صفات باری کی تاویل کا نام تفقہ اور درایت رکھ لیا گیا، اور ائمہ سنت کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کر دیا گیا، حق گوئی کا نام حشویت حرفیت، ظاہریت رکھ کر ان کو بدنام کیا گیا، ان کی بلا تاویل سادہ روش کو غیر فقہی کہہ کر ان کے خلاف بداعتمادی کی فضا قائم کی گئی، فقہاء اسلام نے جن لوگوں کے لئے یہ اصطلاحات ایجاد کی تھیں، وہ بھی تاویل میں اس طغیانی اور تخریب عقائد میں اس اندھیر کے قائل نہ تھے۔

فلاسفۂ اسلام اور متکلمین نے اپنے جدید افکار سے اسلام اور اس کے عقائد میں تشکیک پیدا کر دی، بجائے اس کے کہ درایت اور تفقہ سے روایت بالمعنی کی امکانی اغلاط سے بچا جاتا، تاویل سے بھی گذر کر تحریف کی سرحدوں کو عبور کرنا شروع کر دیا گیا، امام سرخسی ۴۹۰ھ حضرت میمونہ کے نکاح کے متعلق ابن عباس اور یزید بن اصم کی دو متعارض احادیث میں اپنے مسلک کے مطابق حضرت ابن عباس کی حدیث کو ترجیح دیتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ ابن عباس یزید بن اصم سے زیادہ فقیہ تھے

وھذا الترجیح لیس الا باعتبار تمام الضبط من الفقیہ، وکان المعنی فیہ ان نقل الخبر بالمعنی کان مشھورا فیھم، فمن لایکون معروفا بالفقہ ربما یقصر فی اداء المعنی بلفظہ بناء علی فہمہ ویؤمن مثل ذلک من الفقیہ۔ (اصول سرخسی صفحہ ۳۴۹ ج ۱)	یعنی یہ ترجیح اس لئے دی گئی ہے کہ فقیہ راوی مفہوم کو بہتر ضبط کر سکتا ہے، چونکہ صحابہ میں روایت بالمعنی عام تھی، غیر فقیہ راوی کبھی حقیقت تک رسائی سے قاصر رہتا ہے اور فقیہ راوی کے متعلق یہ خطرہ نہیں ہوتا۔

اس وقت یہ ظاہر کرنا مطلوب نہیں کہ یہ ترجیح درست ہے یا محل نظر، گذارش صرف اس قدر ہے، کہ فقہ راوی کی شرط درایت کی طرح روایت بالمعنی کی مضرت سے

بچنے کے لئے تھی لیکن آہستہ آہستہ اسی فقہ راوی کی بنا پر بیسیوں احادیث کو ذبح کر کے رکھ دیا گیا، اور بیسیوں ثقہ رواۃ بلکہ صحابہ کو اس مصطلح تفقہ اور درایت کی بنا پر غیر مستند قرار دے دیا گیا، حضرت امام ابوحنیفہ کو سلمانؓ فارسی پر ترجیح دی گئی۔
(شامی صہ۵۷ ج۱)

نقد روایات اور فقہ

اس میں کچھ شک نہیں، کہ فقہاء حنفیہ اور ائمہ اصول میں فقہ راوی کی شرط تنقید روایات میں کافی مشہور ہے، امام سرخسی ایسے اکابر رجال بھی فقہ راوی کی بنا پر تنقید اور ترجیح کا بکثرت تذکرہ فرماتے ہیں، نکاح میمونہ رضؓ کے سلسلہ میں حضرت ابن عباس کی روایت کو ترجیح دیتے ہوئے یزید بن الاصم کے متعلق فرماتے ہیں :- البوال علی عقبیہ - یزید بن الاصم کے متعلق علماء رجال کا خیال ہے، کہ انھوں نے آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے صحابی نہ بھی ہوں تو اکابر تابعین میں سے ہوں گے، ان بزرگوں کے متعلق یہ انداز تنقید اچھا معلوم نہیں ہوتا، ابن سعد فرماتے ہیں :- ثقۃ کثیر الحدیث، فقہ راوی کی زد سے حضرت انس بن مالک اور حضرت ابوہریرہ جیسے اکابر صحابہ بھی نہیں بچ سکے، بلکہ حضرت ابوہریرہ تو بہت زیادہ تختۂ مشق رہے، ان ہی حضرات سے سن کر روافض اور منکرین حدیث نے پاکباز صحابہ پر طعن و تشنیع کرنا شروع کر دیا، اور عجیب یہ ہے کہ فقہ کا ان حضرات کے ہاں کوئی پیمانہ نہیں کہ کتنی فقہ ان حضرات کو نقل روایت میں مطمئن کر سکتی ہے، فقہ سے محروم تو صحابہ میں سے کوئی نہ تھا، جب کوئی پیمانہ معین نہ ہو، اس قسم کی جرح مذاق بن کر رہ جائے گی، یقین ہے کہ یہ حضرات ارادۃً صحابہ کی بے ادبی کرنا نہیں چاہتے لیکن عیسی بن ابان، امام سرخسی سے لے کر بزدوی اور ملا جیون تک تمام اصاغر و اکابر یہ وظیفہ کریں کہ حضرت ابوہریرہ فقیہ نہیں، تو عزت کیا رہی، غالباً یہ تاثر روافض اور معتزلہ سے لیا گیا ہے، دوسرے ائمہ بھی مجتہد اور فقیہ ہیں، لیکن کسی کو صحابہ پر اس طرح حرف گیری کی جرأت نہیں ہوئی، یہ جامد تقلید کے مصائب ہیں ع عشق زنہا بیش کرد ست کند -

فقہ راوی کا اثر متقدمین نے یہ شرط روایت بالمعنی کے خطرات سے بچنے کیلئے لگائی تھی، حالانکہ روایت بالمعنی کا رواج صحابہ میں عام تھا، تدوین کے بعد تو الفاظ جو بھی تھے محفوظ ہو گئے۔ اب تو وعظ و تقریر میں ہو سکتا ہے روایت بالمعنی کی ضرورت کبھی ہو۔ درس و تدریس، اور تدوین اور روایت میں اس کی ضرورت ہی نہیں، تاہم متاخرین فقہاء حنفیہ نے جو اعتزال سے متاثر تھے، انھوں نے اسے بڑا غلط برتا، یونانی نظریات کا نام فقہ رکھا گیا، متکلمین کی موشگافیوں کو فقہ سمجھا گیا، اعتزال کی گمراہیوں کو ہدایت سے تعبیر کیا گیا، مامون کے دور سے متوکل کے زمانہ تک ائمہ سنت پر جو ابتلا آیا، وہ اس قسم کی فقہ کا نتیجہ تھا، یہ فقہ ائمہ اربعہ سے پہلے شروع ہو چکی تھی، احناف میں اسے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی، بشر مریسی ۲۲۸ھ قاضی عیسیٰ بن ابان ۲۲۱ھ قاضی بشر بن ولید کندی ۲۳۸ھ اسی قسم کی فقہ کے پیداوار ہیں، بشر مریسی وہی بزرگ ہیں، جنھوں نے مامون کے دربار میں شیخ عبد العزیز کنانی سے خلق قرآن پر مناظرہ کیا، امام احمد نے کتاب السنۃ میں ان کے متعلق عجیب انکشافات فرمائے ہیں :-

اخبرت عن یحیی بن ایوب قال کنت اسمع الناس یتکلمون فی المریسی فکرھت ان اقدام علیه حتی اسمع کلامه لا قول فیه بعلم فاتیته فاذا ھو یکثر الصلوۃ علی عیسی ابن مریم علیه السلام فقلت له انک تکثر الصلوۃ علی عیسی فاھل ذلک ھو ولا اراک تصلی علی نبینا و نبینا افضل منه فقال ذلک کان مشغولا بالمرآۃ والمشط	یعنی یحیی بن ایوب فرماتے ہیں لوگ بشر مریسی کے متعلق باتیں کرتے تھے، میں نے ذاتی علم کے بغیر کوئی اقدام مناسب نہ سمجھا، میں نے دیکھا کہ وہ حضرت مسیح پر بہت درود پڑھتا تھا، میں نے کہا حضرت مسیح بے شک درود کے اہل ہیں، لیکن آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم ان سے افضل ہیں، اس نے کہا وہ شیشہ کنگھی اور عورتوں

والنساء (صفحہ ۱۲۳۰ ج۱) ہی سے مشغول رہتے تھے،

بشر کی زندقت کا تذکرہ "الفوائد البھیہ ص۵۴ اور الجواہر المضیہ ص۱۶۴ ج۱ میں بھی مرقوم ہے اور اسی طرح میزان الاعتدال ص۱۵۰ ج۱ میں ہے :-

بشر بن غیاث المریسی مبتدع ضال لا ینبغی ان یروی عنہ، تفقہ علی ابی یوسف فبرع واتقن علم الکلام ثم جرد القول بخلق القرآن و قال قتیبہ بشر المریسی کافر۔

یعنی بشر مریسی بدعتی گمراہ ہے، اس سے روایت درست نہیں، امام ابو یوسف سے فقہ پڑھی، مہارت کے بعد خلق قرآن کا قائل ہو گیا۔

قاضی بشر بن ولید کندی خلیفہ معتصم باللہ کی طرف سے قاضی مقرر ہوئے، آخر عمر میں خلق قرآن کے مسئلہ میں توقف کرنے لگے (میزان الاعتدال ص۱۵۲ ج۱) حالانکہ اکابر اہل سنت اس وقت جیل خانوں میں تھے، قاضی عیسیٰ بن ابان نے فقہ راوی کو اچھالا، اور احادیث میں ترجیح کی اس شرط سے بے حد کام لیا، روایت بالمعنی سے پیدا ہونے والے خطرات سے بچنے کے لئے جو اصل وضع فرمایا گیا، وہ خود ایک مستقل خطرہ بن گیا، اور ان اعتزال پسند فقہاء نے آنحضرت ؐ کے عشاق اور ان کی بہت سی مرویات کو ذبح کر کے رکھ دیا، حضرت ابو ہریرہ رضؓ کی مصراۃ کے متعلق حدیث ان حضرات کی نظر میں آگئی ورنہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ جو آنحضرت کے آثار کی تلاش میں حجاز کے پہاڑ چھان مارتے، نماز کی جگہوں کے ساتھ پیشاب کے مواقع کا بھی تتبع فرماتے، ان کی فقہ پر کوئی حرف نہیں آیا، حالانکہ یہ مواقع نہ عبادات تھے نہ عادات، بلکہ محض اتفاقات تھے، لیکن ابو ہریرہ رضؓ بے چارے حدیث مصراۃ کی وجہ سے ہر اصول فقہ کے طالب علم کی زبان پر ان کے غیر فقیہ ہونے کا وظیفہ جاری ہے ولیس ذلک الا من آفات التقلید والجمود۔

فقہ راوی کی شرط اور اکابر حنفیہ

ہمارے مدارس کا یہ حال ہے کہ وہ فقہ راوی کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں، جیسے کسی آیت کا مفہوم بیان فرما رہے ہیں، یا کوئی متواتر حدیث، حالانکہ قدماء احناف کے ہاں اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں، وہ نقد روایت یا ترجیح میں اس شرط کی کوئی اہمیت نہیں سمجھتے، اصول بزدوی میں فقہ راوی کا ذکر فرماتے ہوئے مثال کے طور پر دو غیر فقیہ بزرگوں کا تذکرہ فرمایا، حضرت ابوہریرہ رضؓ اور حضرت انس رضؓ بن مالک، اس کے بعد اس شرط کا فائدہ ذکر فرمایا:۔

ووجه ذلك ان ضبط حديث النبي صلى الله عليه وسلم عظيم الخطر وقد كان النقل بالمعنى مستفيضا فيهم فاذا قصر فقه الراوي عن درك معاني حديث النبي صلعم واحاطتها لم يؤمن ان يذهب عليه شئ من معانيه۔

(اصول بزدوی ص۶۹۹)

یعنی حدیث کے نقل کا معاملہ خطرناک ہے اور صحابہ میں روایت بالمعنی کا رواج عام تھا اگر راوی فقیہ نہ ہو تو ممکن ہے کہ حدیث کے مفہوم میں لغزش ہو جائے، اس کے بعد فرماتے ہیں کہ صحابہ کو غیر فقیہ کہنے سے ان کی تحقیر مطلوب نہیں، بلکہ امام صاحب بسا اوقات بعض شرائط سے غیر فقیہ صحابہ کی احادیث قبول فرما لیتے تھے۔

فان محمدا يحكى عن ابي حنيفة في غير موضع انه احتج بمذهب انس بن مالك وقلده فما ظنك في ابي هريرة۔

(اصول بزدوی ص۶۹۹)

امام محمد فرماتے ہیں، امام صاحب کبھی انس بن مالک کی کبھی تقلید فرما لیتے تھے اور وہ ابوہریرہ سے زیادہ غیر فقیہ تھے (تعجب ہے کہ اس خطاب کے لئے یہی بے چارے دو یا تین صحابہ مثال کے طور پر ملے ہیں باقی ایک لاکھ کے بیس ہزار غالباً سب فقیہ ہوں گے۔

اصول بزدوی کے شارح عبدالعزیز بن احمد بخاری ۷۸۱ھ فرماتے ہیں:

اعلم ان ما ذکرنا من اشتراط فقه الراوی تقدیم خبرہ علی القیاس ھو مذھب عیسی بن ابان واختارہ القاضی الامام ابو زید وخرج علیہ حدیث المصراۃ وخبر العرایا وتابعہ اکثر المتاخرین فاما عند الشیخ ابی الحسن الکرخی ومن تابعہ من اصحابنا فلیس فقہ الراوی بشرط لتقدیم خبرہ علی القیاس بل یقبل خبر کل عدل ضابط اذا لم یکن مخالفا للکتاب والسنۃ المشہورۃ ویقدم علی القیاس قال ابو الیسر والیہ اکثر العلماء لان التغییر من الراوی بعد ثبوت عدالتہ وضبطہ موہوم (ص ۲۰۳ ج ۲)

یعنی روایت کی ترجیح اور تقدیم کے لئے فقہ راوی کی شرط صرف قاضی عیسی بن ابان اور بعض متاخرین کا مذہب ہے ابو زید دبوسی نے اسے پسند فرمایا اور مصراۃ اور عرایا کی حدیث کو اسی اصل پر تخریج کیا اور شیخ ابو الحسن کرخی اور ان کے اتباع اس شرط کو قبول نہیں فرماتے، ان کا خیال ہے، عادل اور ضابط راوی کی خبر بہر حال قیاس پر مقدم ہوگی۔ ابو الیسر فرماتے ہیں اکثر فقہاء حنفیہ کا یہی مذہب ہے کیونکہ ثقہ راوی کی روایت کے بعد معنی کی تبدیلی کا سوال محض وہم ہے۔

امام ابو یوسف سے منقول ہے کہ وہ مصراۃ کی حدیث کو صحیح سمجھتے تھے، بالکل انہی خیالات کا اظہار شارح حسامی نے غایۃ التحقیق میں کیا ہے صفحہ ۱۷۵-۱۷۶

صاحب دراسات اللبیب نے اس مقام پر عجیب پر مغز اور مختصر بحث فرمائی ہے وہ فرماتے ہیں :-

۱- فقہ راوی کو تحمل اور صدق روایت میں کوئی اثر ہی نہیں

۲- صحابہ میں یہ امکان ہی نہیں کہ روایت بالمعنی میں ایسی غلطی کریں جس سے حدیث کا مقصود فوت ہو جائے۔

۳- جو لوگ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ضبط کرنے کی کوشش

فرماتے تھے، کیسے ممکن ہے کہ معنی ادا کرنے میں وہ غلطی کریں۔

۴۔ وہ لوگ اہل زبان تھے، ان سے ادائے معنی میں غلطی کا احتمال کہاں ہو سکتا ہے پھر ابوہریرہ جیسا دانشمند آدمی جس کی طرف بوقت ضرورت عبادلہ ایسے فقہائے صحابہ رجوع فرماتے تھے۔

۵۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں حفظ کے لئے دعا فرمائی جس کا اثر یہ ہوا کہ ابوہریرہ فرماتے، مجھے اس کے بعد نسیان نہیں ہوا، (اگر یہ حفظ بلا فہم ہو یا غلط فہمی کا امکان موجود ہو تو اس دعا سے کیا فائدہ)

۶۔ جو لوگ صحیحین کے رجال کے خصائص کو جانتے ہیں، انھیں معلوم ہے کہ ان میں ادنیٰ اور معمولی آدمی بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی غلط تعبیر نہیں کر سکتا۔

۷۔ آخر میں فرماتے ہیں :-

ولهذا قال شيخ الحنفيه صاحب الكشف والتحقيق فى التحقيق ولم ينقل عن احد من السلف اشتراط الفقه من الراوى فثبت انه قول مستحدث بمثل هذا لا ينسب الى ابى حنيفة رحمه الله اھ

یعنی شیخ ابن ہمام جو احناف میں محقق بھی ہیں اور صاحب کشف وکرامت بھی، فرماتے ہیں کہ فقہ راوی کی شرط ائمہ سلف میں کسی سے بھی منقول نہیں، اس سے ظاہر ہے کہ یہ من گھڑت بات ہے ایسی بات امام ابوحنیفہ کی طرف منسوب نہیں کی جا سکتی۔

(دراسات اللبیب ص ۳۱۵، ص ۳۱۶)

حقیقت بھی یہی ہے، کہ حدیث کی صحت میں فقہ راوی کو کوئی دخل نہیں، اس کے لئے حفظ وضبط کے بعد صدق اور مروت کی ضرورت ہے، فقہ راوی کا مفہوم سے تعلق ہے، اگر حدیث کا متن مختلف الفاظ سے مروی ہو، تو فقہ راوی کی بنا پر بعض الفاظ کو ترجیح دی جا سکتی ہے، لیکن فقہ راوی کی بنا پر نہ کوئی متن

گھڑا جا سکتا ہے، نہ کسی صحیح متن کا انکار کیا جا سکتا ہے، اس شرط سے شرح معانی میں کام لیا جا سکتا ہے، اس کی بنا پر اقرار یا انکار حدیث کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں صحابہ کا مقام تو اس سے کہیں بلند ہے کہ قاضی عیسیٰ بن ابان، سرخسی اور دبوسی ایسے عجمی حضرات ان کی زبان دانی پر بحث کریں۔

پھر فقہ کے مراتب مختلف ہیں، اس کی حیثیت کلی مشکک کی ہے، یہ کسی مقام پر بھی ردو قبول کے لئے معیار نہیں قرار پا سکتی، تاوقتیکہ اس کے لئے مقدار اور پیمانہ مقرر نہ کر لیا جائے، ایسی غیر معین اور غیر موقت چیز کو معیار قرار دینا خود درایت کے خلاف ہے اور پھر احناف نے حضرت ابوہریرہ کی حدیث "روزہ میں دن کو بھول کر کھانے کے متعلق اپنا لیا ہے۔ حالانکہ وہ بھی قیاس کے خلاف ہے۔

یہ پرانی درایت اور فقہ ہے، جسے اہل علم نے ابتداءً اچھے مقاصد کیلئے تجویز کیا، اس کا جو حشر ہوا، اور جس قدر غلط مقاصد اس سے حاصل کئے گئے، وہ سابقہ گذارشات سے جنہیں بڑے اختصار سے عرض کیا گیا ظاہر ہے، اب نئی درایت پر غور فرمائیے، جس کی تاسیس ہمارے ملک کے نیچری حضرات نے فرمائی، بعض علماء نے جان کر یا سادگی سے اس درایت کی تائید کی اور اب پورے لادینی مقاصد کیلئے اسے استعمال کیا جا رہا ہے۔

نئی درایت

سابقہ درایت یا فقہ علمی دور کی پیداوار تھی، اہل بدعت سے تو بحث نہیں، اہل علم نے اس کا استعمال خاصی احتیاط سے کیا اور اسے معیار کا مقام نہیں دیا، اور حضرت امام ابوحنیفہ رح کی طرف اس سلسلہ میں جو کچھ منسوب کیا گیا وہ قابل تامل ہے، حضرت امام کی طرف اس کی نسبت صحیح معلوم نہیں ہوتی ہے،

اب ایک نئی درایت اور اس کا پس منظر ملاحظہ فرمائیے جو حال ہی کی پیداوار ہے، علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ کا اصل فن تو تاریخ تھا لیکن ابتداء عمر میں وہ

حنفیت کے بہت بڑے حامی تھے، سیرۃ النعمان ان کے اسی دور کی یادگار ہے، مولانا شبلی مرحوم ان ایام میں علی گڈھ یونیورسٹی سے بھی متعلق تھے، جس کے بانی مرحوم آنربیل سرسید احمد خاں صاحب تھے،

یہ وہ دور تھا، جب مغل حکومت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا، جو ۱۸۵۷ء کے فسادات کے بعد ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کو ختم کرنے کے لئے انگریز نے جس درندگی کا مظاہرہ کیا اور جس بے دردی سے اس نے عوام، علماء، سیاستدان، شعراء واصحاب قلم اور تجار کو پھانسیاں دیں، دار پر لٹکایا، ان ہیبت ناک مظالم کی نظیر شاید دور ماضی میں نہ مل سکے، ملک میں خوف وہراس اور نفرت کے جو جذبات انگریز کے خلاف دلوں میں موجود تھے، شاید وہ صدیوں تک دلوں سے محو نہ ہو سکتے۔

انگریز نے اس کے متعلق صحیح طریق عمل کے بجائے ملک میں تفریق، خلفشار اور فرقہ پروری کی راہ اختیار کی اور یہ انتقامی جذبہ انبالہ کیس سے قاضی کوٹ سازش کیس تک جاری رہا، جس میں زیادہ تر علماء اہل حدیث ہی ان ستم آرائیوں کا شکار ہوئے ۱۸۵۷ء کے بعد انگریز مشنری آئے جن کی سرپرستی مغربی حکومتیں، سیاسی مصالح کی بناء پر اور مسیحی عوام عقیدت کی نظر سے کر رہے تھے، ان لوگوں نے بڑے وسیع پیمانے پر اسلام کے خلاف جارحانہ حملے شروع کئے، دوسری طرف آریہ سماجی تحریک بھی انھیں اسلحہ سے مسلح ہو کر میدان میں آگئی، تیسری طرف قادیانی نبوت نے اپنے مخصوص علم کلام کا ہمرنگ زمین جال پورے ہندوستان میں پھیلا دیا، مذہبی آزادی کے موہوم دعویٰ کی بناء پر شیعہ، سنی، بریلوی گروہ باہم الجھ گئے، اور پورا ملک میدان کارزار بن گیا، رسائل، اخبارات اور تردیدی لٹریچر اور مناظرات کی وہ گرم بازاری ہوئی کہ بظاہر ملک میں گھمسان کا رن محسوس ہوتا تھا، انگریز کی سیاست پوری طرح کامیاب ہوئی ۱۸۵۷ء کے

مظالم بالکل طاق نسیاں کی نذر ہو گئے ۱۸۵۷ء کے فسادات سے جو عارضی اتحاد ہوا تھا وہ ذہنوں سے محو ہو گیا، اس ضمن میں علماء حق اور اہل توحید نے بالکل ظاہر قرآن و سنت کی روشنی میں اپنا فرض ادا کیا، تقریر و تحریر سے حقیقت واضح فرمائی، اس کے ساتھ بنگال سے پشاور اور بالاکوٹ تک انگریز کے خلاف سیاسی جنگ بھی ہوتی رہی، انگریز کو پوری ایک صدی شمالی سرحدوں پر پریشان رکھا گیا۔

سرسیّد اور ان کے رفقاء سرسید احمد خاں بالقابہ اور ان کے چند رفقاء سیاسی طور پر انگریز کے حامی تھے، لیکن مذہبًا اس کے خلاف تھے، ان حضرات نے مشنریوں، سماجیوں، اور غیر مسلم گروہوں کے خلاف ہزاروں صفحات لکھے، نیت کا علم تو اللہ کو ہے، بظاہر معلوم ہوتا ہے یہ حضرات ان غیر مسلم حملوں سے مرعوب ہو گئے، ظواہر کتاب و سنت کے بجائے ان حضرات نے تاویل اور حقائق کے انکار کی راہ اختیار فرمائی، قادیانی لٹریچر کا انداز بھی قریبًا یہی تھا

سرسید کی نیچر اور شبلی کی درایت ان حضرات نے اساسی طور پر عقل کو حکم قرار دیا، جو چیز ان کے عقول سے بالا ہوتی، اس کا انکار کر دیتے، اور بڑی سنجیدگی سے فرماتے:" یہ نیچر اور فطرت کے خلاف ہے"، یہ نیچر اور فطرت عموم اور شمول کے لحاظ سے درایت اور رفعہ راوی سے کچھ ملتی جلتی تھی، نہ اس "فقہ و درایت" کا کوئی پیمانہ تھا نہ اس "نیچر" اور "فطرت" کا کوئی اصل اور مقدار ہے، اندھے کی لاٹھی ہے، جس طرف گھوم جائے گھوم جائے، سرسید بالقابہ اور ان کے رفقاء نے اس کا استعمال قرآن پر بھی کیا اور حدیث پر بھی، قرآن سمجھ میں نہ آتا تھا تو حسب منشا تاویل کرتے اور حدیث کا انکار کر دیتے اور "نیچر" کا معیار ہر آدمی تھا یہ نام بھی کچھ غیر علمی اور دینی حلقوں میں غیر متعارف بلکہ غیر مانوس تھا، یورپ زدہ حضرات نے شاید پسند کیا ہو، دینی حلقوں میں اسے قطعی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی، بلکہ رد و تردید کا ایک ہنگامہ بپا ہو گیا،

سرسید بڑے پختہ کار تھے، وہ اس اختلاف پر برہم نہیں ہوئے، اپنی کہتے رہے دوسروں کی سنتے رہے، علامہ شبلی وقت کے مشاہیر سے تھے، ان کا تاریخی مطالعہ بہت سے ہم قرن علماء سے بہتر تھا، وہ حنفی مذہب کے اس خلا کو جو محسوس فرماتے تھے، جو قلت حدیث اور کثرت آراء کی وجہ سے دینی حلقوں میں مسلم تھا، دوسرے ائمہ کی حدیثی خدمات سے بھی یہ بات بہت واضح تھی، احناف اس میدان میں بڑی دیر سے تشریف لائے، دوسرے ائمہ اور ان کے اتباع اور ائمہ حدیث بہت آگے نکل چکے تھے، یہاں پورا کارخانہ تقلید وجمود کے سہارے چل رہا تھا، اس لئے انھوں نے ان شخصی آراء کی ترجمانی لفظ "درایت" سے فرمائی اور اسے نہ صرف حدیث کا نعم البدل فرمایا بلکہ احادیث کے انکار وتاویل کے لئے حربہ کے طور پر استعمال فرمایا، یہ لفظ علمی حلقوں میں مانوس تھا اور پرانی اصطلاح بھی تھی، پھر یہ سرسید کے "نیچر" اور "فطرت" سے بہتر تھی، مولانا نے صرف اس کی تعریف میں کچھ تصرف فرمایا، اس سے غالباً سرسید کو بھی کچھ سہارا ملا، قلت حدیث اور آراء پسندی کے خلا کے لئے بھی اس سے "معذرت" کا کام لیا، مولانا شبلی درایت کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں:۔

"درایت سے یہ مطلب ہے کہ جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو اس پر غور کیا جائے کہ وہ طبیعت کے اقتضاء، زمانہ کی خصوصیتیں، منسوب الیہ کے حالات اور دیگر قرائن عقلی کے ساتھ کیا نسبت رکھتا ہے۔

۱۔ دیکھئے، اس تعریف میں وہ قیود نہیں جن سے مفہوم یا معنی کی تصحیح میں مدد مل سکے، یعنی عربیت میں مہارت کا کوئی تذکرہ نہیں۔

۲۔ "جب کوئی واقعہ" کے الفاظ سے کچھ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس سے حدیث کے واقعات مراد ہیں یا عام دنیوی حوادث، بظاہر آپ کا انداز تاریخی حوادث کی تحقیق کے متعلق معلوم ہوتا ہے جو بلا سند ہم تک پہونچیں اور محض خرص وتخمین سے

صحت کا اندازہ لگانا پڑے۔

۳۔ پھر اقتضائے طبیعت بالکل مہمل جملہ ہے۔ طبائع کے اقتضا میں اتنا ہی اختلاف ہے جس قدر خود انسانی طبائع میں، اقتضا طبائع کے تابع ہے، یہ تنقید کا معیار کیسے ہوگا، بے دین طبائع کے تقاضے دینی طبائع سے مختلف ہوں گے، عالم اور بے علم کے مقتضیات بھی مختلف ہوں گے، بچے، جوان، بوڑھے، تاجر، مزدور، بادشاہ، غریب، آقا اور غلام سب کے تقاضے مختلف ہوں گے، ان تقاضوں کی صحت خود محل نظر ہے یہ کسی دوسری چیز کے لئے قانون کیسے بن سکیں گے۔

۴۔ ہر زمانہ کے خصائص الگ الگ ہوتے ہیں، قرون خیر کے خصائص بعد کے قرون سے کافی حد تک مختلف ہیں، قرون خیر کے واقعات کی نسبت اس وقت کے عقلی قرائن سے تو سمجھ میں آسکتی ہے اور اس وقت کے اہل علم نے یقیناً ان عقلی قرائن کو ملحوظ رکھا ہوگا لیکن اس وقت کے حوادث کو آج کے قرائن سے کیسے پرکھا جائے، جبکہ زمانہ کی خصوصیات بالکل مختلف ہیں۔

۵۔ ہر واقعہ میں منسوب الیہ کے حالات کا جائزہ واقعہ کے سمجھنے میں واقعی مفید ہو سکتا ہے اور عقلی قرائن کے ساتھ نسبت اور تعلق فہم میں معاون ہو سکتا ہے، لیکن یہ شرط بہت ہی مجمل ہے، جب واقعہ ہو، قدرتی طور پر حقیقت پسند طبائع قرائن اور منسوب الیہ کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں، لیکن یہ جائزہ اور عقلی قرائن کا استعمال صدیوں کے بعد نہیں ہونا چاہیے، ایک شاگرد اپنے استاد سے ایک حدیث نقل کرتا ہے، اس وقت کے لوگ ان ناقلین کو ذاتی طور پر جانتے ہیں، اس سلسلہ میں ان کی آراء سے مفید معلومات حاصل ہو سکتے ہیں، لیکن صدیوں کے بعد جبکہ افکار اور اذہان اور ان پر غور و فکر کا معیار ہی بدل چکا ہو اب آپ گڑے مردے اکھاڑنا شروع کریں، ہم قرن اور رفقاء ہی حالات کا صحیح تجزیہ کر سکتے ہیں۔

۶۔ پھر عقلی قرائن کیا چیز ہیں، اگر کتاب و سنت اصل ہیں، تو معیار ان کو ہونا

چاہیئے، عقل بھی وہی درست ہوگی، جو اس پیمانہ میں ناپی جائے، سرسید احمد خاں نے نیچر اور عقل کو اتنی اہمیت دی کہ قرآن کو بھی اس سے ناپنا شروع کر دیا، انبیاء کے معجزات ان کی عقل میں نہ آسکے، انھوں نے انکار کر دیا، احادیث جو ان کے فہم سے بالا تھیں، ان کا قتل عام کیا، اس لئے عقلی قرائن پر جب تک پابندی نہ لگائی جائے اس فتنہ سے کوئی بھی نہ بچ سکے گا، اور پھر اصل قرآن و سنت نہ رہے بلکہ تم لوگ اصل ٹھہرے، جن کی عقل کو کتاب و سنت کی تصریحات کیلئے حکم قرار دیا گیا، گویا قرآن و سنت کے مفہوم کا تعین ہماری عقل کرے گی، جس کا نام سرسید نے فطرت اور قانون قدرت رکھا، اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ تانگہ گھوڑے کے آگے جوت دیا گیا، جن کی عقول کی اصلاح و تربیت کے لئے قرآن و سنت نازل فرمائے گئے تھے وہی عقل قرآن اور سنت پر مسلط کر دی گئی ہے: یہ الٹی بہہ نکلی برہمن کو بہالائی ۔

معلوم ہوتا ہے، مولانا شبلی سرسید سے متاثر ہوئے، مولانا نے سرسید سے جو تاثر لیا انھوں نے اسے اصطلاحاً علمی انداز دیا، معلوم نہیں سرسید بالقابہ نے اس سے کیا اثر لیا، واقعات کچھ اس طرح بدلتے رہے کہ مولانا شبلی نے علی گڈھ کالج کو خیر باد کہا، اور تصنیف و تالیف کے لئے انھوں نے فرعی فقہیات کے بجائے کلام اور تاریخ کی راہ اختیار کی، اور دوبارہ فرعی مباحث کی طرف رخ نہیں فرمایا، لیکن ان کے اس نظریہ سے علماء حدیث کی تنقیص کا پہلو پیدا ہوتا تھا، اس لئے اہل حدیث حلقوں نے کئی کتابیں لکھیں، جن میں درایت کے اس مفہوم کا علمی محاسبہ کیا گیا، اور اس پر کڑی تنقید کی، زیر طباعت کتاب "حسن البیان فیما فی سیرۃ النعمان،" "الارشاد فی امر التقلید و الاجتہاد" مؤلفہ مولانا ابو یحییٰ شاہجہاں پوری، سیرۃ البخاری اس کے علاوہ بھی کئی کتابیں لکھی گئیں، چونکہ مرزا قادیانی کا بھی حدیث کے متعلق اسی قسم کا انداز تھا، اسلئے "اشاعۃ السنۃ النبویۃ"

میں مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی مرحوم ومغفور نے اس کا بڑا مفصل علمی محاسبہ فرمایا، کیونکہ انکار حدیث کے لئے یہ بڑی سہل اور قریبی راہ تھی، اسی اثنار میں مولوی عبداللہ چکڑالوی، مولوی حشمت علی نے حدیث کا انکار کیا اور یہ تحریک ملتان، گجرات، ڈیرہ غازیخاں وغیرہ مقامات میں کچھ چل نکلی، یہ لوگ چونکہ نہ تو عالم تھے، نہ اچھی زبان لکھ سکتے تھے، اس لئے قریبًا یہ تحریک ناکام ہو گئی، اب اس کی نوک پلک درست کر کے اپ ٹو ڈیٹ طور پر اسے مسٹر پرویز چلا رہے ہیں، لیکن ابتدا ہی سے اس تحریک کے لیڈروں کا نہ ظاہری کیریکٹر ہے، نہ اخلاص، غالب امید یہ ہے کہ اس سے بدمذہبی اور بے دینی ضرور بڑھے گی لیکن تحریک ناکام ہو گی سنت کا نام نہیں مٹ سکے گا، یورپ زدہ طبقہ حدیث کا انکار کرتا ہے، اس فن کو مشکوک سمجھتا ہے، لیکن اہل قرآن کہلانا پسند نہیں کرتا، البتہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، سے گریز کے لئے ان لوگوں کی آڑ لیتا ہے۔

درایت اور برادران احناف

حنفیت کی بریلوی شاخ کا زیادہ تر زور بدعات کی ترویج اور گانے پر ہے ان کو استدلال اور معقولیت سے کچھ زیادہ تعلق نہیں، وہ زیادہ کام جذبات اور نعروں سے لیتے ہیں اور مولانا شبلی، سرسید، اور حضرات دیوبند کو وہ وہابی سمجھتے ہیں، اس لئے وہ اس مصنوعی درایت سے بہت کم متاثر ہوئے، اس درایت سے معجزات، کرامات، اور فقیروں کے فرضی قصوں کا بھی خاتمہ ہوتا تھا، اس لئے انھوں نے اسے قابل قبول نہیں سمجھا، لیکن حضرات دیوبند کے سنجیدہ اور دور اندیش بزرگوں نے اس درایت کو اہل حدیث ہی کی طرح ناپسند کیا، اور اس کے خلاف لکھا۔ اصح السیر، مؤلفہ مولانا دانا پوری میں اس قسم کا مواد کافی ملتا ہے، لیکن آج کل نو آموز دیوبندی اہل قلم اس سے متاثر ہوئے اور یہ اس لئے کہ اس نظریہ سے احناف میں قلت حدیث سے جو خلا تھا اسے درایت

سے پاٹنے کی کوشش کی گئی ہے، فقہاء کے لئے اس مصنوعی اور ظاہری تفوق سے یہ حضرات مطمئن ہو گئے، اور یہ غور نہ فرما سکے کہ دراصل یہ انکار حدیث کا زینہ ہے۔ جماعت اسلامی کی قیادت اور احناف کا یہ گروہ اس درایت کو بہت اچھال رہا ہے۔ " مسلک اعتدال "، ایسا مسموم لٹریچر ان حضرات کی طرف سے شائع ہو رہا ہے۔

درایت کا اثر مروجہ فقہ پر

حالانکہ درایت کا اثر جس قدر حدیث پر پڑتا ہے، اس سے کہیں زیادہ فقہ حنفی کے بعض ابواب اور حصص پر پڑتا ہے، مثال کے طور پر ابواب طہارت میں پانی کے مسئلہ پر غور فرمائیے، ہمارے ملک میں مدت سے اس کے بعض مسائل پر بحث چل رہی ہے مثلاً طہارت پانی کا مسئلہ (جس کا قدرے ذکر اوپر بھی آچکا ہے)

۱۔ ماء کثیر کی مقدار میں احناف اور شوافع میں اختلاف ہے، احناف ده دردہ کے متعلق فرماتے ہیں :۔ اس پر نجاست کا اثر نہیں ہوتا اور شوافع قلتین کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ نجاست سے متاثر نہیں ہوتا جب تک اس کے اوصاف ثلثہ نہ بدل جائیں، موالک کسی مقدار کے قائل نہیں، درایت کا فیصلہ تو یہ معلوم ہوتا ہے، کہ جب تک کسی چیز میں نجاست کا اثر ظاہر نہ ہو، اسے کیوں پلید کہا جائے قلیل اور کثیر میں امتیاز درایت کے خلاف ہے، اگر سنت کو ان قیود و سلاسل سے آزاد رکھا جا سکے، تو حدیث قلتین اصول روایت پر تنقید کے بعد قابل قبول ہوگی، احناف کی مقدار غیر منصوص ہے، پھر نجاست اور طہارت کا فیصلہ روایت کے خلاف ہوگا۔

۲۔ تالاب اور کنویں میں نجاست کے لحاظ سے جو فرق کیا گیا ہے بالکل درایت کے خلاف ہے، کیا برتن کی ہیئت کو بھی طہارت اور نجاست میں دخل ہے یعنی برتن گول اور گہرا ہو، تو سینکڑوں پانی ادنیٰ نجاست سے پلید ہو جائے، اور برتن

طویل اور عریض ہو، تو وقوع نجاست سے رنگ، بو، اور مزہ کے بدلنے کا انتظار کیا جائے، یہ تفریق قطعاً خلاف درایت ہے، حکم نجاست پانی کی مقدار پر ہونا چاہیئے، برتن کی وضع کیسی کیوں نہ ہو۔

۳- پھر تطہیر کے لئے ڈولوں کا تعین آثار سے ثابت ہو...... یا اہل علم کے ارشادات سے، درایت کا اس میں کوئی مقام نہیں، فرض کیجئے آپ پلید کنوئیں کی تطہیر کے لئے بیس ڈول مقرر فرماتے ہیں، انیسواں ڈول آپ نکال رہے ہیں اس وقت ڈول پلید ہے، ڈول کا پانی پلید ہے، کنواں پلید ہے، کنوئیں کی دیواریں پلید ہیں، ڈول سے جو پانی گر رہا ہے، وہ پلید ہے، جب بیسواں ڈول اوپر کی طرف حرکت کرتا ہے، کنوئیں کی ساری فضا طاہر مطہر ہو جاتی ہے، یہ بیسواں ڈول تمام گندے جراثیم کو بیک جنبش ختم کر دیتا ہے، درایت کی کسوٹی پر تو یہ طہارت سمجھ میں نہیں آتی، صاحب ہدایہ کا ارشاد ہے:۔ مسائل البئر مبنیة علی اتباع الآثار دون القیاس (ص۲۵ ج۱) کنوئیں کے مسائل کا انحصار آثار پر ہے، قیاس پر نہیں، سوال یہ ہے، آیا یہ آثار درایت کی زد میں نہیں آتے، صحیح مرفوع احادیث تو درایت کی وجہ سے محل نظر ہوں اور جن آثار کے متعلق اتنا بڑا مقتدر عالم فیصلہ دے کہ یہاں قیاس کو کوئی دخل نہیں وہ کیسے قابل عمل ٹھہریں گے، قیاس اور درایت کے مفہوم میں اصطلاحاً فرق ہو سکتا ہے مقاصد کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں، پھر امام کے دونوں مقتدر شاگرد کنوئیں کو جاری پانی کا حکم دیتے ہیں (شامی ص۲۱۷ ج۱)

امام صاحب اور قیاس

علماء نے ایسے مسائل کا تذکرہ فرمایا ہے، جہاں امام ابو حنیفہ کے قیاس کو صرف اس لئے ترک فرمایا کہ وہ نص کے خلاف تھے، مثلاً رمضان المبارک میں بھول کر کھا پی لینا، قیاس چاہتا ہے، کہ روزہ ٹوٹ جائے، امام صاحب نے فرمایا، کہ نہیں

ٹوٹتا کیونکہ احادیث میں آیا ہے (مناقب امام اعظم ضمیمۃ الجواہر المضیہ ص۴۷) امام[2] صاحب کا خیال تھا کہ انگلیوں کی دیت کم وبیش ہے قیاس کا یہی تقاضا ہے، آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے انگلیاں برابر ہیں۔

قیاس[3] کی بنا پر امام صاحب کا خیال تھا کہ حیض زیادہ سے زیادہ پندرہ دن ہو سکتا ہے، جب امام صاحب کو معلوم ہوا کہ حدیث اس کے خلاف ہے، تو امام کے نزدیک حیض کی آخری میعاد دس دن رہ گئی، امام[4] صاحب عید کے پس وپیش نوافل پسند نہیں کرتے تھے، جب آپ کو معلوم ہوا کہ حضرت علی گھر پر نوافل پڑھتے تھے تو امام صاحب نے رجوع فرمایا۔

متذکرہ مسائل مولانا شبلی مرحوم کی "درایت" کے یقیناً خلاف ہیں، قرائن کے مقتضیات میں زیادہ تر قیاس ہی کارفرما ہے، اور پھر قیاس تو ائمہ اربعہ اور ائمہ حدیث کے نزدیک شرعی حجت ہے، اس کے لئے اہل علم کے نزدیک کچھ اصول و ضوابط ہیں، اور جس درایت کا ذکر مولانا شبلی فرماتے ہیں، اس کا ذکر احناف، شوافع، موالک، حنابلہ کسی نے بھی نہیں فرمایا، اس کا ذہن یا تصور سرسید احمد خاں نے دیا، الفاظ علامہ شبلی مرحوم نے دیئے کم فہم اور نوآموز علماء نے صرف اس لئے اپنا لیا کہ مولانا شبلی نعمانی نے اس درایت کا ذکر ائمہ حدیث کی تنقیص میں کیا ہے۔ اور فقہاء حنفیہ کی جس سے (بظاہر) برتری اور تفوق ثابت کرنے کی سعی کی ہے، آج کل کے دیوبندی لٹریچر میں اس درایت کا تذکرہ بڑی کثرت سے ہوتا ہے، اور یہ حضرات نہیں جانتے کہ یہ درایت، انکار حدیث اور انکار معجزات کے لئے چور دروازہ ہے، ائمہ سنت اور ان کے اتباع سے کسی نے بھی اس درایت کا تذکرہ نہیں فرمایا اور اشارات کھینچ تان کر پیدا کئے گئے ہیں، وہ قانون اور اصل کے طور پر نہیں، بلکہ ضمنی اور وقتی تذکرہ ہے، اور بس ......

حسن البیان اور حسن البیان والے

زیر نظر دور کی دوسری کتابیں جو علماء اہلحدیث کے قلم سے نکلیں یا محقق دیوبندی علماء نے لکھی ہیں، ان سب میں اس درایت پر تنقید فرمائی گئی، اور اسے ناپسند کیا گیا، اور انکار حدیث کے کھٹکے کا اظہار کیا گیا (ملاحظہ ہو اصح السیر مولانا عبدالرؤف داناپوری، سیرۃ بخاری مولانا مبارک پوری، الارشاد مولانا حکیم ابویحییٰ شاہجہان پوری اور بحر زخار وغیرہ، ان سب بزرگوں نے اس درایت کے خطرات کو محسوس فرمایا اور یہ حسن البیان آپ کے سامنے ہے، اور اسکے مباحث آپ کی نظر میں، کتاب کے بعض مباحث میں اختصار کی وجہ سے ممکن ہے وقتی طور پر تنگی محسوس ہو، اور بعض مقامات میں مناظرانہ تنقید کا انداز بھی آگیا ہے۔ مگر سیرۃ النعمان میں جو انداز علامہ مرحوم نے اختیار فرمایا، یہ تقابل ایک طبعی امر تھا، تاہم درایت اور " فقہ راوی " سے جو خطرہ محسوس کیا وہ بالکل صحیح تھا، شبلی صاحب نے ائمہ حدیث کے متعلق جو تصور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، مستحسن نہ تھی، اسلئے فن حدیث کے ساتھ عقیدت مندانہ وابستگی رکھنے والوں کا اسے برداشت کرنا آسان نہیں تھا، تفقہ، فقہ راوی، استحسان، استصواب حال وغیرہ مصطلحات اصل سنت کے ذخائر پر بے اعتمادی کی مختلف تعبیرات ہیں، قرآن عزیز میں انبیاء علیہم السلام کی تاریخ کا جس طرح ذکر فرمایا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ ارباب فقہ و درایت ان ہی ہتھیاروں سے آسمانی ہدایات کی مخالفت کرتے رہے ہیں، اور انبیاء علیہم السلام کی اساسی تعلیمات پر تعجب کا اظہار کرتے رہے ہیں۔

اجعل الالهة الٰها واحدا ان هذا لشیء عجاب (سورہ ص)

اتنے آلہہ کی جگہ ایک الٰہ عجیب ہے، فقہ و درایت، عقل و دانش اسے قبول کرنے سے ابار کرتے ہیں۔

اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ۝ ءَاُلْقِيَ

عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرٌ ٥ (سورۂ قمر)
کیا ہم اپنے ایک ہم جنس کی اطاعت کریں، یہ تو عقل و شعور کے خلاف ہے، کیا ہمارے ہوتے اس کو نبوت مل جائے، یہ جھوٹ، شرارت پسندی کی بات ہو گی۔

توحید اور نبوت ایسے مسائل اس وقت کی فقہ و درایت پر گراں گذر رہے تھے، انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اور ان کا انتخاب دونوں ان کے لئے تعجب کا موجب تھے، حضرت شعیب علیہ السلام نے جب ذاتِ حق کی معرفت اور حقوق العباد کے تحفظ کے متعلق اپنی قوم سے خطاب فرمایا، اور ان کو ان معاصی سے روکا، تو اس وقت کے دانشمند اور دولت مند لوگوں نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

اصلوتك تامرك ان نترك ما كان يعبد اباؤنا اوان تفعل فى اموالنا ما نشاء (سورۂ ھود) کیا تمہاری نماز کا یہی مطلب ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کی عادات کو چھوڑ دیں اور اپنے مالوں میں حسب منشار لین دین نہ کریں، آسمانی احکام اور انبیاء علیہم السلام کی راہ میں وقت کے دانش مندوں کا انداز فکر اور فقہ و درایت ہمیشہ حائل رہی۔

قیاس، درایت قدیم، تفقہ، فقہ راوی، درایت جدیدہ، استحسان، استصحاب حال، مصالح مرسلہ، یہ ایسی اصطلاحات ہیں کہ ان کی افادیت کے ساتھ، قرآن اور سنت کے فیصلوں کو مسترد کرنے کے لئے چور دروازوں کا استعمال ہمیشہ کیا گیا، ائمہ سنت کو، تقلید، حشویت اور حرفیت کے طعن دے کرامت پر تاویل کی راہ کھول دی گئی، ان فسادات میں فقہار اور حکام برابر کے شریک ہوئے، ہزاروں ائمہ دین قتل کئے گئے اور سینکڑوں جیل خانوں کی تاریکیوں میں سالہا سال تک داد صبر دیتے رہے، علمار حدیث ہی سب سے زیادہ مبتلار مصائب رہے وقت کی ستم ظریفیاں ملاحظہ فرمائیے، کہ اس دور کے دانشمند اور درایت پرور بشر مریسی اور اس قماش کے لوگ محقق اور مجتہد سمجھے جاتے تھے اور امام ابو یوسف،

امام ابوحنیفہ، امام احمد، امام مالک، امام شافعی، اور تمام ائمہ سنت اور حفاظ حدیث کو مقلد اور حشوی کہا جاتا، تاہم وہ پھر بھی علم و بصیرت کا دور تھا، علماء حق کی اس وقت کثرت تھی، ان خرافات کے باوجود بھی لوگ اہل حق کی قدر کرتے تھے۔

آج کی درایت

لیکن سرسید و علامہ شبلی مرحوم کے ازدواج سے جو درایت پیدا ہوئی ہے یہ نہ تو کسی علمی ضرورت کا تقاضا ہے، نہ یہ اہل علم کا دور ہے، ہوا و ہوس کی ان طغیانیوں میں اندھے کے ہاتھ میں لاٹھی دے دی گئی ہے، جسے بلا تامل گھمایا جا رہا ہے ؎

کبھیمۃ عمیاء قاد زمامھا
اعمی علی عوج الطریق الحائذ

حضرت مولانا عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ

حضرت علامہ شبلی نعمانی اور مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی کے حالات میں ایک گونہ مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ شبلی مرحوم نے سیرۃ النعمان کے علاوہ شاید ایک آدھ رسالہ فرعی اختلافات پر لکھا ہو، اس کے بعد انھوں نے قلم کا رخ اس طرف سے بالکل پھیر دیا، باقی عمر علمی اور تعلیمی خدمات میں صرف فرمائی، ندوۃ العلماء کی تاسیس فرمائی جس میں فقہی تنگ نظری اور فرعی مسائل پر عصبیت نما مباحث بالکل نہیں تھے، ادب اور تاریخ کی خدمت اس درسگاہ کا اہم کردار تھا، اور تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں بھی بقیہ عمر میں ان کی توجہ علم کلام اور تاریخ کی طرف ہو گئی، خاص طور پر سیرت النبی ان کا دل پسند موضوع تھا، جس کی تکمیل ان کے وفادار اور محقق تلمیذ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے فرمائی رحمھما اللہ رحمۃ واسعۃ وجعل الجنۃ مثواھم۔

یہی حال حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی قدس اللہ روحہ کا تھا، ابتداء عمر میں زیر طباعت کتاب "حسن البیان" لکھی، "ہدایۃ المعتدی" اور

ایک آدھ رسالہ شاید شیعہ کے متعلق لکھا، اور رہوار قلم بالکل رک گیا، مولانا کے حقیقت پسند مزاج نے محسوس فرمایا کہ ان مذہبی، فقہی، اور فرقہ وارانہ منازعات کی اصل علت ہندوستان میں انگریز کی بالادستی ہے، جب تک یہ دیو ملک میں کارفرما ہے، ملک میں امن ممکن نہیں، اس ضمن میں مولانا کے سامنے دو پروگرام تھے، سیاسی اور تبلیغی، سیاسی کے لئے دو طریق کار تھے، اول تحریک مجاہدین کی سرپرستی جو اس وقت انگریز کے مظالم کی وجہ سے انڈر گراونڈ ہو چکی تھی، اکابر دیوبند اُس سے تعلق توڑ چکے تھے، اکابر پٹنہ اپنی زندگیاں اس راہ میں وقف کر چکے تھے، اور لاکھوں روپیہ مرحوم کی وساطت سے تحریک کو ملتا تھا، مرحوم خود بڑے دولت مند اور بڑے زمیندار تھے، ان کا تعلق اچھے کھاتے پیتے خاندان سے تھا، واجبی ضروریات کے بعد پوری آمد تحریک مجاہدین میں صرف فرماتے تھے۔ مرحوم کے یہ خیال تحریک عدم تعاون سے برسوں پہلے تھے۔

دوسرا طریقہ انگریزی مال کے بائیکاٹ کا تھا، خود موٹا گاڑھا کھدر گھر کا بنا ہوا پہنتے، سردیوں میں کشمیری شال استعمال فرماتے، قلم سے لکھتے، نب اور انگریزی قلم کا استعمال سخت ناپسند فرماتے، مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم تبلیغی امور میں ان کے شریک کار تھے، مولانا نے تبلیغ کے لئے آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس کی تاسیس، مدرسہ سلفیہ آرہ (بہار) کی سرپرستی فرمائی، ساتھ ہی انگریز کے خلاف جہاد کا محاذ بھی برابر کھولے رکھا۔

مولانا مرحوم کے مزاج میں عجیب تنوع تھا، ایک طرف وہ ان حضرات کے ساتھ اہل حدیث کانفرنس کی اسٹیج پر کام کرتے، دوسری طرف مولانا فضل الٰہی وزیرآبادی رحمہ اللہ، صوفی ولی محمد مرحوم فتوحی والداکبر شاہ آف سخانہ، مولوی الٰہی بخش بہالوالہ، قاضی عبدالرحیم صاحب، قاضی عبیداللہ قاضی عبدالرؤف (قاضی کوٹ) اور مولانا عبدالقادر صاحب قصوری کے ساتھ

جماعت مجاہدین کا کام کرتے تھے، اور یہ کام اس راز داری اور خوبصورتی سے ہوتا تھا کہ انگریز کی عقابی نگاہیں برسوں اس کا سراغ نہ لگا سکیں، معلوم نہیں یہ اطلاع کہاں تک درست ہے کہ مرحوم کی گرفتاری کے احکام اس دن پہونچے، جب مرحوم اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر جنت کے دروازے پر پہونچ کر داخلہ کی اجازت کے لئے دستک دے رہے تھے اور رطب اللسان فادخلوھا خالدین کی آواز کے منتظر تھے، پولیس جنازہ دیکھ کر واپس آگئی۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ وادخلہ الجنۃ آمین

میں نے مرحوم کو پہلی دفعہ وزیر آباد میں دیکھا، جمعہ کے دن مولانا فضل الہٰی صاحب کے ہاں کھانا تناول فرما کر مسجد اہل حدیث میں آئے، مرحوم حضرت الاستاد الامام مولانا الشیخ حافظ عبدالمنان صاحب نے ممبر خالی فرما دیا۔ میری عمر غالباً اس وقت دس، گیارہ سال ہو گی، وعظ میں عجیب رقت تھی، غالباً وعظ اخلاص فی العمل کے موضوع پر تھا، میں صغر سنی کے باوجود انتہائی رقت محسوس کر رہا تھا اور پورے مجمع پر یہ کیفیت طاری تھی، مولانا ثناء اللہ صاحب رحمہ اللہ کا یہ ارشاد ان کے متعلق بالکل حرف بحرف صحیح تھا ؎

اثر لبھانے کا پیارے ترے بیان میں ہے
کسی کی آنکھ میں جادو، تری زبان میں ہے

اس کے بعد مولانا کئی دفعہ تشریف لاتے رہے، زیارت ہوتی رہی، لیکن بچپن کی وجہ سے استفادہ کی جرأت نہ ہو سکی، وکان امر اللہ قدرا مقدورا

پھر میں ۱۹۱۶ء، ۱۹۱۷ء میں دہلی آیا، وہاں بھی زیارت کا موقعہ ملتا رہا، عموماً مجلس میں خاموشی ہوتی یہ مبارک مجلس گلہ اور قہقہہ دونوں سے خالی ہوتی، آخری زیارت علی گڈھ اہلحدیث کانفرنس کے اجلاس میں ہوئی۔

مدراس کانفرنس میں غالباً کسی نے یہ شعر پڑھا ؎

کیا خوب ہوتا وہ بھی گر آج زندہ ہوتے

عبدالعزیز نامی "حسن البیان" والے

پوری مجلس اشکبار ہو گئی، حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم اکثر یہ شعر پڑھتے اور آنکھیں برسنے لگتیں، مرحوم کو مولانا رحیم آبادی سے والہانہ محبت تھی، اور وہ ان کی رفاقت پر ہمیشہ فخر فرماتے۔ آہ! یہ مقدس گروہ منهم من قضى نحبه، ومنهم من ينتظر وما بدلوا تبديلا کے خدائی قانون کے مطابق اپنی وفاداریاں نباہ کر اللہ کے پیارے ہو گئے، اب یہ بوجھ ایسے کندھوں پر آ گیا ہے جن کے دامن میں سیاہ کاریوں، اور غلط نوازیوں کے سوائے کچھ بھی نہیں، کبرنی موت الکبراء کا منظر سامنے ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے، وہ اخلاص اور حسن عمل کی نعمت سے نوازے، اور توفیق دے کہ عمر کی یہ آخری گھڑیاں ایمان اور اخلاص کے ساتھ ختم ہو جائیں۔

کوس رحلت بکوفت دست اجل — اے دو چشمم وداع سر بکنید
اے کف دست ساعد و بازو — ہمہ تودیع یک دگر بکنید
از فریب و فسون ایں دنیا — من نہ کردم شما حذر بکنید
برمن اوفتادہ دشمن کام — آخر اے دوستاں گذر بکنید

هذا اخر ما اردنا ايراده في هذه المقالة والمقام يقتضى التفصيل، وصلى الله على سيدنا محمد وآله واصحابه وسلم۔

ابوالخیر محمد اسماعیل سلفی "چاہ شاہان، گوجرانوالہ"

۸ شوال ۱۳۸۵ھ ۳۱ جنوری ۱۹۶۶ء

پانچواں مقالہ تمام ہوا

وبہ تم المجموع، ولله الحمد
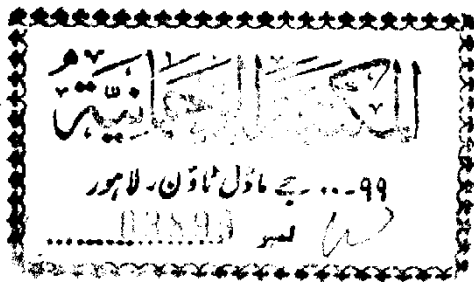
HUJJIYAT-E-HADITH

◎

By

Allama Mohd. Nasiruddin Albani
Allama Mohd. Ismail Salafi

◎

Publisher
UHOOTH-IL-ISLAMIA
IA VARANASI (INDIA)